موضوعاتی

درسِ قرآن

سورۂ فاتحہ

افادات

مُفسّرِ قرآن، فقیہ العصر

حضرت مولانا شاہ مُفتی محمد نوال الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

شیخ الحدیث دارالعلوم شکاگو

باھتمام: رحمتِ عالم فاؤنڈیشن

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا تو کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا

(القمر: ۱۷)

موضوعاتی

درسِ قرآن

سورۂ فاتحہ

افادات

مفسرِ قرآن فقیہ العصر

حضرت مولانا مفتی محمد نور الرحمٰن دامت برکاتہم

امیر رحمتِ عالم فاؤنڈیشن

باھتمام: رحمتِ عالم فاؤنڈیشن

تفصیلات کتاب

جملہ حقوقِ طباعت بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	موضوعاتی درسِ قرآن سورۂ فاتحہ
زیرِ سرپرستی	:	پیرِ طریقت رہبر شریعت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب دامت برکاتہم
افادات	:	مفسرِ قرآن فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی شاہ محمد نوال الرحمن صاحب دامت برکاتہم
ناشر	:	شریعہ بورڈ آف انڈیا تحت رحمتِ عالم فاؤنڈیشن (شکاگو امریکہ)
تعداد	:	۱۰۰۰
صفحات	:	۳۱۸
سن طباعت	:	جولائی ۲۰۱۴ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ
قیمت	:	۲۲۰

ملنے کے پتے

آستانۂ صوفی یوسف نگر ٹپہ چبوترہ حیدر آباد، فون نمبر:9703679565

شریعہ بورڈ آف انڈیا، موتی گلی خلوت، حیدر آباد، 24512525 – 040

مکتبہ کلیمیہ نامپلی، یوسفین چوراہا۔09885655591

مکتبہ ابن کثیر مغل پورہ، ادارہ دعوت و تبلیغ روبرو جامع مسجد ملے پلی، حیدر آباد۔

ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان حیدر آباد

دکن ٹریڈرس، چارمینار، حیدر آباد

Rahmat-e-Alam Foundation
7045 Western Avenue, Chicago, IL 60645
Phone No: (773) 764 - 8274

ISBN 978-0-9910344-5-1

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

کلماتِ بابرکات ۲۲
احوالِ واقعی ۲۴
وحی اور اُس کی حقیقت ۲۶
وحی کی ضرورت ۲۶
علم کی ضرورت کیوں؟ ۲۶
ذرائع علم ۲۶
ذرائع علم کا دائرہ کار ۲۷
وحی کی ضرورت عقلِ سلیم کا تقاضہ ۲۸
حضور ﷺ پر نزولِ وحی کے طریقے ۲۹
قرآن پاک حادث ہے یا قدیم؟ ۲۹
کلام اللہ کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ کا نظریہ ۳۰
کلامِ نفسی کے وجود کے دلائل ۳۰
تاریخ نُزولِ قرآن ۳۲
قرآن کی لغوی واصطلاحی تعریف ۳۲
سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت ۳۳
مکی اور مدنی آیات وسورتیں ۳۴
مکی اور مدنی سورتوں کی تعداد ۳۴
قرآن کریم کا تدریجی نزول ۳۴
قرآن کریم کے تدریجی نزول کی حکمتیں ۳۵
شانِ نزول ۳۶

قرآن کریم کے سات طریقوں پر نازل ہونے کا مطلب	۳۷
علم قرأت کی بنیاد	۳۸
سات قراء	۴۰
تاریخ حفاظتِ قرآن	۴۰
عہد رسالت میں جمعِ قرآن	۴۰
صحابہ کرام میں قرآن کریم سیکھنے کا شوق	۴۱
کتابتِ وحی	۴۲
چند کاتبین وحی کے نام	۴۲
عہد نبوی میں کتابت کی شکل	۴۲
حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمعِ قرآن	۴۳
صحابہ کرام کی احتیاط	۴۴
جمع قرآن کے وقت آیاتِ قرآنیہ کی تصدیق کے شرائط	۴۵
ایک اعتراض کا دفعیہ	۴۵
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمعِ قرآن	۴۶
عہدِ عثمان میں تکمیل شدہ امور	۴۸
تلاوت میں آسانی کے اقدامات	۵۰
نقطے اور حرکات	۵۰
احزاب یا منزلیں	۵۰
اجزاء یا پارے	۵۱
رکوع	۵۱
رموز واوقاف	۵۱

قرآن کریم کی طباعت کا آغاز ۵۱
علم تفسیر ۵۲
علمِ تفسیر کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ ۵۲
تفسیر اور تاویل میں فرق ۵۴
تفسیر کی ضرورت کیوں؟ ۵۴
علمِ تفسیر کا حکم ۵۵
علمِ تفسیر کا مقام اور مرتبہ ۵۵
علم تفسیر کا مأخذ ۵۶
۱۔ قرآن کریم ۵۶
۲۔ حدیث ۵۷
۳۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال ۵۷
۴۔ تابعین رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال ۵۸
۵۔ لغتِ عرب ۵۸
۶۔ تدبر اور استنباط ۵۸
اسرائیلیات کا حکم ۵۹
تفسیر بالرائے کا حکم ۶۰
تفسیر بالرائے کے بارے میں کچھ علماء کا نظریہ اور ان کے دلائل ۶۰
تفسیر بالرائے کے بارے میں جواز کا نظریہ اور اس کے دلائل ۶۱
مانعینِ تفسیر بالرائے کے مستدلات کا جواب ۶۲
تفسیرِ قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی ۶۲
کلام پاک سے استفادہ کی دو صورتیں ۶۶

استفادہ کی دوسری صورت ٦٧
قرآن پاک کے عجائب غیر متناہی ہیں ٦٧
قرآن مجید ام المعجزات ہے ٦٨
نبی کا معجزہ امت کے پاس ٦٩
قرآن میں مشغول آدمی اللہ کے ہاں سائلین سے زیادہ مستحق ٧١
قیامت کے روز کلامِ الٰہی کی شفاعت ٧٢
حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نکتہ ٧٢
نبی کی تلاوت پر اللہ پاک سب سے زیادہ توجہ فرماتے ہیں ٧٣
اللہ پاک کے کلام کو سننے کا مطلب ٧٤
دل کی صفائی اور مضامینِ قرآن کی آمد ٧٥
دل ایک ہی کیوں؟ ٧٦
حضرت شاہ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ ٧٦
روح کے حجابات ٧٧
تعوذ سے متعلق چند نکات ٨١
پہلا نکتہ ٨١
دوسرا نکتہ ٨٢
تیسرا نکتہ ٨٣
چوتھا نکتہ ٨٣
پانچواں نکتہ ٨٣
چھٹا نکتہ ٨٤
تعوذ کے چند فضائل اور انعامات ٨٤

بسم اللہ کے فضائل ۸۸
بسم اللہ داروغۂ جہنم سے حفاظت کا ذریعہ ۸۸
بسم اللہ کے نزول کی کیفیت ۸۸
بسم اللہ کے ذریعہ حضور ﷺ کی شفایابی ۸۹
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر زہر کا اثر نہ کرنا ۹۰
بسم اللہ کی تاثیر کب ہو گی؟ ۹۰
حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ۹۱
بسم اللہ نہ پڑھنے سے شیطان کی شرکت ۹۲
بسم اللہ کے چھوڑ دینے کا نقصان ۹۲
بسم اللہ آیت بھی اور دعا بھی ۹۳
جنبی اور غیرِ جنبی کے لئے قرآن پاک پڑھنے اور نہ پڑھنے کی حکمت ۹۴
بسم اللہ کہہ کر دودھ پلانے کا اثر ۹۵
بسم اللہ کے نزول کا سبب ۹۵
کیا تسمیہ اس امت کی خصوصیت ہے؟ ۹۶
بسم اللہ میں ”ب“ کے معنٰی ۹۶
بسم اللہ میں فعل ذکر نہ کرنے کی حکمت ۹۷
اسمِ اللہ کہنے کی حکمت ۹۷
اسمِ اللہ کی تعریف ۹۸
رحمٰن اور رحیم کے معنٰی اور ان میں فرق ۹۹
لفظ رحمن اور رحیم کے بارے میں حضرت عبد اللہ ابنِ مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ۱۰۰
تسمیہ میں ان تین اسماء کا ذکر کیوں؟ ۱۰۰

بسم اللہ میں توحید کی تعلیم مضمر ہے	۱۰۱
کارِ بد میں بسم اللہ کی اجازت نہیں	۱۰۳
کیا تسمیہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے؟	۱۰۳
احناف کے دلائل	۱۰۴
کیا تسمیہ جہراً پڑھی جائے گی؟	۱۰۶
مسلکِ حنفیہ اور اس کے دلائل	۱۰۶
کیا ضمِ سورت سے قبل بسم اللہ پڑھنی ہے؟	۱۰۸
۷۸۶ کی حقیقت	۱۰۸
سورۂ فاتحہ کے فضائل	۱۰۹
حضور ﷺ سے منقول دعاؤں کی برکت	۱۱۰
سورۂ فاتحہ اللہ اور بندے کے درمیان ایک راز ہے	۱۱۱
بندہ کی نماز میں اللہ پاک سے ہم کلامی	۱۱۱
ایک بزرگ کا قصہ	۱۱۲
"سورۂ فاتحہ" قرآن پاک کا خلاصہ	۱۱۳
سورۂ فاتحہ کا نزول	۱۱۴
سورۂ فاتحہ کا مثل دیگر کتبِ سماویہ میں بھی نہیں	۱۱۴
عرش کے خزانوں میں سے ایک خاص خزانہ	۱۱۵
سورۂ فاتحہ کے اسماء	۱۱۵
قرآن پاک کے ذریعہ علاج کر کے اجرت لینا	۱۱۹
نماز میں سورۂ فاتحہ کی حیثیت	۱۲۰
مسئلۂ قرأت خلف الامام	۱۲۱

قرأت خلف الامام کے بارے میں آئمہ اربعہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کا مسلک .. ۱۲۳
قرأت خلف الامام کے مجوزین کے دلائل اور ان کے جوابات ۱۲۴
احناف کے دلائل ۱۲۶
قرأت خلف الامام کے بارے میں فیصلہ کن روایت ۱۳۱
ترکِ قرأت خلف الامام ۸۰ صحابہؓ کرام سے ثابت ہے ۱۳۳
حمد کے معنی ۱۳۶
حمد اور شکر میں فرق ۱۳۶
حمد اور مدح میں فرق ۱۳۷
حمد کے فضائل ۱۳۷
سبحان اللہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت سے بہتر ۱۳۸
الحمد للہ افضل ذکر اور افضل دعا ہے ۱۳۸
الحمد للہ شکر کی اصل ہے ۱۳۸
اللہ پاک کو حمد سے زیادہ کوئی چیز پسندیدہ نہیں ۱۳۹
ہر کمال اللہ کا عطا کردہ ہے ۱۴۱
لفظِ حمد میں دراصل توحید کا سبق ہے ۱۴۱
حضرت صوفی غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ ۱۴۲
توحید جنت کا اور الحمد للہ جنت کی نعمتوں کا ثمن ہے ۱۴۳
"الحمد للہ" داڑھ، کان اور پیٹ کے درد کے لئے شفاء ہے ۱۴۳
نظمِ قرآ کی فصاحت وبلاغت ۱۴۳
ہر خوبی اللہ کی عطا کردہ ہے ۱۴۵
باری تعالیٰ کی حمد کیوں؟ ۱۴۷

صفتِ رب کی تشریح ۱۴۸
ربوبیت کے لئے لازمی صفات ۱۴۸
ضرورت اور مصلحت ۱۴۹
متعدد رب کیوں نہیں؟ ۱۵۰
تعدد رب کی نفی پر ایک عقلی دلیل ۱۵۰
ربوبیت کی ایک مثال سے وضاحت ۱۵۱
اللہ کے نظامِ ربوبیت پر غور کریں ۱۵۲
قرآن کریم کا اعجازی اسلوب ۱۵۴
دنیوی زندگی سے دھوکہ نہ کھائیں ۱۵۵
قبر میں سب سے پہلے رب ہی کا سوال ہو گا ۱۵۶
ربوبیت پر یقین کا امتحان ۱۵۶
دینی مجلس بھی رزق کا سبب ہے ۱۵۷
کمزور بھی رزق کا سبب ہوتے ہیں ۱۵۸
نومولود جانوروں کے ساتھ رزق کا قدرتی نظام ۱۵۸
ایک شرابی کی حفاظت کا غیبی انتظام ۱۵۹
حفاظتِ خداوندی کا ایک واقعہ ۱۶۰
رب ذوالجلال کی خصوصی عنایت ۱۶۱
عالم کا معنی اور مفہوم ۱۶۱
عالَموں کی تعداد ۱۶۲
عالموں کی اقسام ۱۶۳
عالمِ مجرد اور عالمِ مادی ۱۶۳

عالمِ علوی اور عالمِ سفلی ۱۶۴
عالمِ سفلی کی اقسام ۱۶۴
عالمِ مفردات اور عالمِ مرکبات ۱۶۴
عالمِ مرکبات کی اقسام ۱۶۴
عالمِ جمادات ۱۶۴
عالمِ نباتات ۱۶۵
عالمِ حیوانات اور اس کی اقسام ۱۶۵
رب العلمین سے متعلق ایک نکتہ ۱۶۶
اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تشریح ۱۶۸
آیات میں باہمی ربط ۱۶۸
اخروی نجات صفتِ رحیمیت کا اثر ہے ۱۷۰
دعوت و تبلیغ بھی صفت رحیمیت کا اثر ہے ۱۷۰
صفتِ رحمن اور رحیم کے بارے میں ایک تنبیہ ۱۷۱
صفتِ رحمن کے دنیوی نعمتوں کے ساتھ جوڑ کی چند مثالیں ۱۷۲
دنیا کافر کے لئے جنت ہے ۱۷۴
صفتِ "رحیم" کے اخروی نعمتوں کے ساتھ جوڑ کی چند مثالیں ۱۷۵
خصوصی رحمت کے استحقاق کے لئے درکار امور ۱۷۷
اللہ تعالیٰ تاثر سے پاک ہیں ۱۷۸
ننانوے قاتل کا واقعہ ۱۷۹
توبہ سے رضاءِ الٰہی کی ایک تمثیل ۱۸۰
"مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کی تشریح ۱۸۲

قرآن پاک کے تین بنیادی مضامین ۱۸۲
کسی کو ملک الملوک یا شہنشاہ کہنے کا حکم ۱۸۳
قیامت میں سفارش کام آئے گی ۱۸۵
شفاعت کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ ۱۸۵
سفارش کے حق دار کون ہیں؟ ۱۸۵
سب سے بڑی شفاعت ۱۸۶
دنیا اور آخرت کی شفاعت میں فرق ۱۸۷
شفاعت کی نفی کا مصداق ۱۸۷
شفاعت کا مقصد ۱۸۸
نظامِ شفاعت سے دھوکہ نہ کھائیں ۱۸۹
دنیا دار العمل ہے ۱۹۰
غیر اختیاری مصیبت پر بھی اَجر ہے ۱۹۱
جتنا قرب اتنی مصیبت ۱۹۲
بخار بھی گناہوں کا کفارہ ہے ۱۹۲
اونٹوں کی جانثاری ۱۹۳
لفظ مالک سے متعلق ایک نکتہ ۱۹۴
ملکیت کی صرف یوم قیامت کی طرف نسبت کیوں؟ ۱۹۵
قیامت میں اعضاء آدمی کے خلاف گواہی دیں گے ۱۹۶
سب سے پہلے بائیں ران گواہی دے گی ۱۹۷
بے سینگ بکری کو سینگ لگوا کر بدلہ دلوایا جائے گا ۱۹۸
یومِ قیامت سے متعلق آیاتِ قرآنیہ ۱۹۹

قرآن کریم میں تکرار کمال ہے ۱۹۹
نظامِ قیامت حق تعالیٰ کی صفتِ عدل کا تقاضہ ہے ۲۰۰
حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ ۲۰۱
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ۲۰۲
اصحابِ کہف کا واقعہ ۲۰۳
واڑ دادوا تِسعا سے متعلق ایک نکتہ ۲۰۴
بنی اسرائیل کے مقتول کے زندہ کرنے کا واقعہ ۲۰۵
احوالِ قیامت سے متعلق چند آیاتِ مبارکہ ۲۰۵
عزت وذلت کا دن ۲۰۶
سب کی حاضری کا دن ۲۰۶
فیصلہ کا دن ۲۰۷
مومنین کی مہمانی کا دن ۲۰۷
فجار کا انجام ۲۰۷
پورے پورے بدلہ کا دن ۲۰۸
انسان کی اپنی ذات پر غصہ کی حالت ۲۰۸
قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے دنیا کے دن کا تخمینہ ۲۰۹
حسرت کا دن ۲۱۰
کوئی بات مخفی نہ ہوگی ۲۱۱
نیک مومنین پر انعاماتِ خداوندی ۲۱۲
مومنین کے ساتھ نور ۲۱۳
مومنین بہترین جگہ اور آرام میں ہوں گے ۲۱۴

دوستی اور رشتہ داری کچھ کام نہ آئے گی ۲۱۵
دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال والے کا انجام ۲۱۶
بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال والے کا انجام ۲۱۶
قیامت کی ہولناکی سے حاملہ بچہ جن دے گی ۲۱۷
بچے بوڑھے ہو جائیں گے ۲۱۷
نیکوں اور بدوں کی صفیں الگ الگ ہوں گی ۲۱۸
کافروں کے چہرے سیاہ ہوں گے ۲۱۸
ہر آدمی اپنے اعمال کے بدلہ محسوب ہو گا ۲۱۹
زانی اور زانیہ کی سزا ۲۱۹
زناکاروں کے چہروں سے شعلے بھڑک رہے ہوں گے ۲۲۰
شرابی کی سزا ۲۲۰
شرابی کو زانیہ کی شرمگاہ سے بہتا ہوا خون پلایا جائیگا ۲۲۰
بیویوں میں انصاف نہ کرنے والے کی سزا ۲۲۱
غیبت کی سزا ۲۲۱
غصب کی سزا ۲۲۲
متکبرین کی سزا ۲۲۲
خطیبِ بے عمل کی سزا ۲۲۳
ظلماً یتیموں کا مال کھانے والوں کی سزا ۲۲۳
غدار کی سزا ۲۲۴
زکوۃ ادا نہ کرنے والوں کی سزا ۲۲۴
ہر نیک و بد عمل اپنا اثر رکھتا ہے ۲۲۴

اس دن کی رسوائی سے پناہ مانگیں ۲۲۵
"اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ" کی تشریح ۲۲۶
ما قبل سے ربط ۲۲۶
عبادت اور استعانت باری تعالیٰ کا حق ہے ۲۲۶
ایاک نعبد سے متعلق پانچ نکات ۲۲۷
پہلا نکتہ ۲۲۷
دوسرا نکتہ ۲۲۸
تیسرا نکتہ ۲۲۸
چوتھا نکتہ ۲۲۹
پانچواں نکتہ ۲۲۹
جانور بھی ذکر الٰہی کی برکت سے رزق پاتے ہیں ۲۳۰
عبادت کا مفہوم ۲۳۰
سجدہ کی حقیقت ۲۳۱
نماز میں چہرے سے مٹی صاف کرنے کی ممانعت ۲۳۱
عبادت کی اقسام ۲۳۲
صلیب پہننے کی ممانعت ۲۳۳
غیر مسلموں کے شعائر کا استعمال بھی حرام ہے ۲۳۳
غیر اللہ کے لئے عبادت کی مشابہت بھی جائز نہیں ۲۳۴
حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ۲۳۵
یہود و نصاریٰ پر لعنت کی ایک وجہ ۲۳۵
آداب اور تعظیم کے بھی حدود ہیں ۲۳۶

توحیدِ الوہیت اور توحیدِ عبودیت دونوں ضروری ہیں ۲۳۷
عبادت کا مفہوم سمجھانے کیلئے قرآنی انداز ۲۳۸
ایک صحابی کا واقعہ ۲۳۹
یہود و نصاریٰ کے افتراء کا اثر ۲۳۹
قیامت میں رب ذوالجلال کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اثر ۲۴۰
استعانت کیا ہے؟ ۲۴۲
عبادت میں بھی استعانت مطلوب ہے ۲۴۲
استعانت بھی عبادت ہے ۲۴۳
استعانت کی تین صورتیں ۲۴۳
پہلی صورت ۲۴۳
دوسری صورت ۲۴۴
تیسری صورت ۲۴۵
حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت ۲۴۶
کرامت میں فاعل حقیقی اللہ ہی ہوتے ہیں ۲۴۷
ایک مثال سے وضاحت ۲۴۸
حضرت صوفی غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ ۲۴۹
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت ۲۴۹
حالات کے اعتبار سے استعانت کی صورتیں ۲۴۹
گناہ کی خصوصیت نقصان ہے ۲۵۰
نعمتوں میں استعانت کی صورت ۲۵۱
مصیبتوں میں استعانت کی صورت ۲۵۱

اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ سے ایک غلط استدلال ۲۵۱
مصیبت میں اظہارِ تکلیف ممنوع نہیں ۲۵۲
صبر کی اقسام ۲۵۳
حاجتوں میں استعانت کی صورت ۲۵۳
ایک بزرگ کا واقعہ ۲۵۳
قبولیتِ دعا کی صورتیں ۲۵۴
معاصی میں استعانت کی صورت ۲۵۶
کیا مطلقاً یاس کفر ہے؟ ۲۵۷
سورۂ فاتحہ میں اللہ پاک کے استحضار کی بھی تعلیم ہے ۲۵۷
نمازی کے سامنے سے گزرنے پر وعید ۲۵۸
مرور ممنوع ہے تنحی ممنوع نہیں ۲۵۹
استحضار کی کیفیت کیسے پیدا کریں؟ ۲۵۹
نماز ایمان والوں کی معراج ہے ۲۶۰
نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے ۲۶۰
مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تمنا ۲۶۱
"اهدنا الصراط المستقيم" کی تشریح ۲۶۱
صراطِ مستقیم کیا ہے؟ ۲۶۱
سوال کا طریقہ ۲۶۳
"اهدنا الصراط المستقيم" سے متعلق چند نکات ۲۶۴
پہلا نکتہ ۲۶۴
دوسرا نکتہ ۲۶۵

تیسرا نکتہ	۲۶۵
جب مومنین ہدایت یافتہ ہیں تو پھر ہدایت کا سوال کیوں؟	۲۶۶
ہدایت کی اقسام	۲۶۷
ہدایتِ عامہ	۲۶۷
ہدایتِ خاصہ	۲۶۸
ہدایتِ اخص الخاص	۲۶۹
رسول سے ہدایت کی نفی کا مصداق	۲۷۰
قربِ الٰہی کے لامتناہی درجات ہیں	۲۷۱
صراطِ مستقیم پر استقامت اصل ہے	۲۷۲
دعا پڑھیں نہیں بلکہ مانگیں	۲۷۳
قلب غافل سے دعا قبول نہیں ہوتی	۲۷۳
طلب کی حقیقت	۲۷۴
نماز کی خصوصیت	۲۷۵
ایک بزرگ کا ملفوظ	۲۷۵
منعم علیہم کے چار طبقے	۲۷۶
کیا صدیق صرف حضرت ابو بکر ہیں؟	۲۷۷
حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول صدیق کی وضاحت	۲۷۷
کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں ضروری ہیں	۲۷۹
رجال اللہ کے بارے میں افراط و تفریط بھی گمراہی ہے	۲۷۹
اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست تربیت	۲۸۰
سننِ ہادیہ اور سننِ عادیہ دونوں قابل اتباع ہیں	۲۸۱

حضور کے مخصوص اعمال کا حکم؟ ۲۸۱
سننِ عادیہ پر اعتراض کی وجہ ۲۸۲
قرآن وحدیث کا خود سے سیکھنا محض جہالت اور بے وقوفی ہے ۲۸۴
اہل باطل بھی قرآن وحدیث کے ذریعہ گمراہی پھیلاتے ہیں ۲۸۶
رجال اللہ کی علامات ۲۸۷
مغضوب اور گمراہ قوموں کا مصداق ۲۸۷
ایک عجیب نکتہ ۲۸۹
انعام کی نسبت اپنی جانب تو غضب کی نسبت کیوں نہیں؟ ۲۹۰
اعمالِ خیر کے باوجود بندہ رحمتِ الٰہی کا محتاج ہے ۲۹۱
ہدایت اور ضلالت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ۲۹۱
اللہ تعالیٰ تاثر سے پاک ہیں ۲۹۳
مغضوبین سے متعلق آیاتِ مبارکہ ۲۹۳
غیر اللہ کی پرستش غضبِ الٰہی کا سبب ہے ۲۹۴
مجبوری میں کلمۂ کفر کی اجازت ہے ۲۹۵
یہودی ہمیشہ ذلیل وخوار ہی رہیں گے ۲۹۶
ایک شبہ کا ازالہ ۲۹۶
حد سے تجاوز بھی غضب کا سبب ہے ۲۹۷
مغضوبین سے دوستی کی اجازت نہیں ۲۹۷
گمراہ لوگوں سے متعلق چند آیاتِ مبارکہ ۲۹۷
شرک سب سے بڑی گمراہی ۲۹۸
دشمنانِ خدا سے تعلقات جائز نہیں ۲۹۸

کیامطلقاغیر مسلموں سے تعلق ناجائز ہے؟ ۲۹۸
کافروں کے ساتھ مدارات کا حکم ۲۹۹
غیر مسلموں سے مدارات کی اجازت کیوں؟ ۳۰۰
راہِ حق سے روکنا بھی ضلالت ہے ۳۰۱
خواہشات کی پیروی صریح گمراہی ہے ۳۰۱
اللہ پاک کا حضرت داودؑ سے خطاب ۳۰۲
گمراہی بندہ کے اختیار کرنے سے آتی ہے ۳۰۲
حدود سے تجاوز اور شک بھی گمراہی ہے ۳۰۳
ہدایت کے لئے طلب درکار ہے ۳۰۳
دینی معاملہ میں اکثریت کو نہیں بلکہ نصوص کو دیکھا جائے گا ۳۰۴
رحمتِ خداوندی سے مایوسی بھی گمراہی ہے ۳۰۴
غیر اللہ کو پکارنا گمراہی ہے ۳۰۵
اسلام کے علاوہ دوسرا راستہ گمراہی ہے ۳۰۵
ذکر اللہ سے غافل دل بھی گمراہ ہیں ۳۰۵
”سورۂ فاتحہ“ کا خلاصہ ۳۰۶
الحمد للہ رب العالمین اور الرحمن الرحیم کا خلاصہ ۳۰۶
﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ کا خلاصہ ۳۰۷
”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ کا خلاصہ ۳۰۷
”ایاک نَسْتَعِيْنُ“ کا خلاصہ ۳۰۸
﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کا خلاصہ ۳۰۹
﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کا خلاصہ ۳۰۹

﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ﴾ کا خلاصہ ۳۱۰
مسئلہ آمین ۳۱۰
آمین کے بارے میں ایک یہودی کی شہادت ۳۱۱
آمین کہنے کی فضیلت ۳۱۲
آمین کس کا وظیفہ ہے؟ ۳۱۲
آمین بالجہر ہے یا بالسر؟ ۳۱۲
روایتِ آمین بالسر کی وجوہِ ترجیح ۳۱۳
آمین بالسر اوفق بالقرآن ہے ۳۱۴
آمین بالجہر تعلیماً ہے ۳۱۵
آمین بالجہر معمول بہا ہوتا تو صرف ایک ہی صحابی راوی کیوں؟ ۳۱۵
تعاملِ صحابہ بھی آمین بالسّر پر دال ہے ۳۱۶
اخفاءِ آمین کے بارے میں حضرت عمر کا اثر ۳۱۶
حضرت عطاء کا اثر اور اس کا رد ۳۱۷
آمین بالشر ثابت نہیں ۳۱۷

❁❁❁

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

کلماتِ بابرکات

پیرِ طریقت رہبرِ شریعت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب دامت برکاتہم

فقہ و بصیرت کے حامل، نہایت جید اور ذی علم شخصیت حضرت مولانا مفتی محمد نوال الرحمن صاحب مدظلہ کے موضوعاتی درسِ قرآن مجید کے طور پر ایک نہایت گراں قدر کتاب آیۃ الکرسی کے ذیل میں قبل ازیں شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔

یہ دوسری کڑی ہے جو موضوعاتی درس قرآن بضمن سورہ فاتحہ ہے جو تقریباً تین سو بیس صفحات پر مشتمل ہے، سورۃ الفاتحہ چونکہ ترتیبِ توقیفی کے اعتبار سے پہلی سورت ہے اس مناسبت سے تمام ہی بنیادی مضامین مقدمۂ تفسیر قرآن کی حیثیت سے اس میں شامل ہیں، جو متنوع عناوین کے طور پر درج ہیں، جیسے وحی کلام اللہ کے بارے میں اہل کلام کے مباحث، تاریخِ نزولِ قرآن، ترتیبِ نزول مکی و مدنی آیات و سورتیں، قرأت متعددہ، حفاظت قرآن، علم تفسیر، تفسیر بالرائے، تلاوت کے فضائل وغیرہ، پھر تعوذ و تسمیہ اوراس کی تفصیلات پھر سورۂ فاتحہ کے فضائل اور بسملہ اور قرأت خلف الامام اور آمین کے تحت فقہی بحثیں اور سورۂ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کے بارے میں آیاتِ سورۂ فاتحہ کے ذیل میں اس سے تعلق رکھنے والے تمام جزئیات پر اس قدر تفصیلی گفتگو جو عموماً یکجا طور پر غالباً نہیں مل سکے گی۔

افہام و تفہیم کا نہایت عمدہ انداز، زبان عام فہم، تاثیر غیر معمولی الغرض اس کی خصوصیات دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں، اور علماء و عوام دونوں کیلئے یکساں مفید ہیں، اللہ

پاک نے موصوف محترم کو علومِ قرآن کا وافر حصہ عطا فرمایا ہے، اور غیر معمولی صلاحیت سے سرفراز فرمایا ہے۔ بیحد خوشی اور مسرت کی بات ہے کے ان کے لائق فرزندان نے اس عظیم علمی ذخیرہ کو جو ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ تھا بڑی محنت سے تحریری شکل دی اب وہ زیور طباعت سے آراستہ ہونے جارہی ہے حق تعالیٰ اس کی قدر دانی کی توفیق نصیب فرمائے اور افراد امت زیادہ سے زیادہ اس سے فیض یاب ہوں اور صاحب دورس قرآنی اور مرتبین کی اس کاوش کو قبولیت سے نوازے اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔(آمین)

محمد جمال الرحمن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

احوالِ واقعی

زیرِ نظر سورۂ فاتحہ کے دروسِ قرآن کا مجموعہ ،والدبزرگوار ممتاز عالمِ دین فقیہ العصر حضرت شاہ مفتی محمد نوال الرحمن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم کے افادات کا ہے جو تقریباً دس برس قبل حضرت نے امریکہ میں دیئے ہیں، اس سے قبل بھی حضرت کے دروس میں سے آیۃ الکرسی کا مجموعہ منظرعام پر آچکاہے ۔

اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ عوام الناس کیلئے قرآن کا درس اسی نہج پر زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے جس میں ان کی ذہنی سطح کا لحاظ ہو، فنی اصطلاحات میں ان کو الجھانے کے بجائے مغز وحاصل کو آسان الفاظ میں ان کے فہم سے قریب کر دیا جائے،بدیہی مثالوں کے ذریعہ مضامین عالیہ کو خوب روشن کیا جائے، زبان ایسی ہو جو مخاطبین کے ماحول و محاورات سے ہم آہنگ ہو،سادگی وبے ساختگی کی حلاوت اس میں موجود ہو،اندازِ بیان حکمت و موعظت سے لبریز اور دردِ دل سے آراستہ ہو۔

حضرت والا کے دروسِ قرآن ،نافعیت وجامعیت کی انہی خصوصیات کا نمونہ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سامعین کو بیک وقت یہاں علم و عمل کی تسکین کا سامان ملتاہے،بسا اوقات گھنٹوں حضرت کے بیانات کو لوگ سنتے ہیں اور ان کے چہروں سے مطلق اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا، لوگ ہمہ تن گوش ہوکر خطاباتِ عالیہ کو سنتے ہیں اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق دامنِ مراد کو بھر لے تے ہیں، ہم نے ممکن کوشش کی ہے کہ تحریر کے قالب میں حضرت والا کے ان افادات کو قارئین کی خدمت میں پیش کریں ،چنانچہ حضرت کے علوم و معارف کو قلمبند کرنے میں اس کالحاظ رکھا کہ ضبط کا انداز اصل کے مطابق خطابی رہے کیوں کہ اس کے ذریعہ ایک طرف تو قارئین حضرت والا کے اسلوب بیان سے محظوظ ہوں گے ساتھ ہی آپ کے الہامی کلمات کی برکتوں سے فیضیاب بھی ہوں گے، حضرت والا کے دروس وخطابات سے استفادہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آپ کے علم کا سیلِ رواں جب اپنی طبعی رفتار سے چلنا شروع ہوتا

ہے تو آس پاس کے بہت سے قطعاتِ علوم وفنون کو اپنی جلا میں لے لیتا ہے، ہم نے ایک مفید کام یہ کیا کہ صرف موضوع سے متعلق مواد برقرار رکھا اور باقی کو یہاں سے حذف کر دیا، بعض مواقع پر کچھ علمی بحثوں کا اور ابتداءً ایک مقدمہ کا بھی اضافہ کر دیا ہے جو حضرت والا کے افادت کے ساتھ، علوم القرآن وغیرہ سے مستفاد ہے ، نیز جملوں کی نوک و پلک بھی سنوارنے کی حتی الامکان کوشش کی، اور المکتبۃ الشاملہ کے ذریعہ آیات وروایات کی تخریج سے اسے آراستہ کیا، جس سے ان دروس کی اہمیت وافادیت مزید بڑھ گئی، قاری کے لئے اس میں: قرآن کریم سے متعلق تاریخ• علم تفسیر سے متعلق اہم مضامین• سورۂ فاتحہ کے ہر لفظ کے معنی وتشریح• بلاغت قرآن• اہم مسائل مع دلائل وغیرہ بہت کچھ قیمتی سرمایہ موجود ہے۔

بہرحال یہ ایک بشری کاوش ہے جس میں لغزش وخطا کا امکان بہرصورت باقی ہے، اہل علم سے درخواست ہے کہ اس میں کوئی قابلِ اصلاح بات نظر آئے تو مطلع فرمائیں، اس موقع پر راقم الحروف شریعہ بورڈ آف انڈیا کے اسٹاف میں سے بالخصوص برادرِ محترم مفتی محمد عطاء الرحمٰن صاحب قاسمی کا بے حد ممنون و مشکور ہے کہ جن کی تصحیح و تخریج کے کام میں خاص محنتیں رہیں، نیز مفتی عبدالرؤوف صاحب قاسمی کا بھی ، کہ جن کا تصحیح میں قابلِ قدر تعاون شامل رہا، بڑی ناقدری ہوگی اگر محترم جناب عارف اقبال صاحب (مقیم شکاگو) کا شکریہ ادا نہ کروں، کیونکہ حضرت کے خطبات کو ریکارڈنگ کے ذریعہ جمع کرنے اور اس مجموعہ کے کتابی شکل میں آنے کا سہرا انہی کے سر جاتا ہے، اسی طرح جناب طیب صاحب اور محترم جناب سید نذیر احمد صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ اُنہوں نے کمپوزنگ کے تمام مراحل بحسن وخوبی انجام دیئے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب کو بہترین بدلہ عطا فرمائے، اور حضرت والا کے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے اور حضرت کا سایہ سلامتی کے ساتھ ہم پر تادیر قائم رکھے اور ان دروس کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نواز کر خلق کے لیے اس کتاب کو نافع اور ہمارے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔ آمین

محمد رضاء الرحمن عابد (ناظم ادارہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی

وحی اور اُس کی حقیقت:

قرآن کریم چونکہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا ہے اس لئے سب سے پہلے لفظ قرآن اور وحی کے بارے میں چند ضروری باتیں سمجھ لینی چاہیئے۔

وحی کے لغوی معنی اشارۂ خفیہ (چپکے سے اشارہ کرنا) یا جلدی سے اشارہ کرنے کے آتے ہیں، اور اصطلاح میں اللہ کی جانب سے انبیاء پر نازل ہونے والے کلام کو وحی کہتے ہیں۔ [1]

وحی کی ضرورت:

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کرکے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگادیا ہے، لہذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس میں پیدا کی ہوئی اشیاء سے ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدِ نظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

علم کی ضرورت کیوں؟:

ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو "علم" کی ضرورت ہے، اس لئے کہ جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کرسکتا، نیز جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کونسے کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتا ہے؟ اس وقت تک اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنا ممکن نہیں۔

ذرائعِ علم:

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا رہے، ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، منہ اور ہاتھ پاؤں، دوسرے عقل اور تیسرے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعہ معلوم

---

[1]: مباحث القرآن: ۱/۲۸۔

ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں اُن کا علم وحی کے ذریعہ عطا کیا جاتا ہے۔

ذرائعِ علم کا دائرۂ کار:

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں اُن کا علم نِری عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے، لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کو بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے، اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہو سکتیں، مثلاً آپ صرف آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھو کر یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی انسان نے بنایا ہے، بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

غرض جہاں تک حواس خمسہ کام دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواس خمسہ جواب دیدیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رُک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی دیوار کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہو گا، یہ نہ حواس کے ذریعہ ممکن ہے نہ عقل کے ذریعہ، اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اسی کا نام وحی ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر اسے اپنا پیغمبر قرار دیدیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو "وحی" کہا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ وحی انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعۂ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب مہیا کرتی ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتے، لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحی الٰہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور

چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، بلکہ جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے، اسی طرح دینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے، اور ان کے ادراک کے لئے نری عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔

وحی کی ضرورت عقل سلیم کا تقاضہ:

جو شخص (معاذ اللہ) خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اس سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرتِ کاملہ پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں، اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادرِ مطلق نے پیدا کی ہے، وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمتِ بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اُسے بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصدِ زندگی کو حاصل کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش وحواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت کسی سفر پر بھیج دے، اور اُسے نہ چلتے وقت سفر کا مقصد بتائے اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس پر یہ واضح کرے کہ اسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے؟ اور سفر کے دوران اس کی ڈیوٹی کیا ہو گی؟ جب ایک معمولی عقل کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اس خداوندِ قدوس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جس کی حکمتِ بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا محیر العقول نظام پیدا کیا ہے وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے جس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے مقصد زندگی سے متعلق ہدایات دی جا سکیں؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر ایمان ہو تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، بلکہ ان کی رہنمائی کے لئے باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی ورسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ''وحی'' محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں بلکہ ایک عقلی ضرورت بھی ہے جس کا انکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا انکار ہے۔

حضور ﷺ پر نزولِ وحی کے طریقے:

وحی ورسالت کا یہ مقدس سلسلہ سرکارِ دوعالم محمد مصطفیٰ ﷺ پر ختم ہوگیا، اب کسی انسان پر نہ وحی نازل ہوگی اور نہ اس کی ضرورت ہے آنحضرت ﷺ پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی، صحیح بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے ؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے۔ [۱]

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ ﷺ کے پاس آکر اللہ کا پیغام پہنچادیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، البتہ بعض اوقات کسی دوسری صورت میں بھی تشریف لائے ہیں، یہ صورت آنحضرت ﷺ کے لئے سب سے آسان ہوتی تھی۔ [۲]

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کئے بغیر اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ ﷺ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے۔ [۳]

چوتھی صورت براہِ راست اور بلا واسطہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہمکلامی کی ہے، یہ شرف آنحضرت ﷺ کو بیداری کی حالت میں صرف ایک بار، یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے، البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں۔ [۴]

وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی صورت میں سامنے آئے بغیر آپ ﷺ کے قلبِ مبارک میں کوئی بات القاء فرمادیتے تھے، اسے اصطلاح میں ”نفث فی الروع“ کہتے ہیں۔ (ایضاً)

قرآن پاک حادث ہے یا قدیم ؟:

قرآن پاک کلام الٰہی ہے اور اس کا تعلق اللہ رب العزت سے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے اس لئے، ایک اہم بحث قرآن پاک سے متعلق اس کے قدیم اور حادث ہونے کی ہے، قدیم کا

---

[۱]: صحیح بخاری: ۱/۲۔ [۲]: الاتقان: ۱/۴۶۔ [۳]: فتح الباری: ۱/۱۸و۱۹۔ [۴]: اتقان: ۱/۴۶۔

مطلب متکلمین کے نزدیک یہ ہے کہ جس پر پہلے عدم طاری نہ ہو یعنی جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ تک رہے اس کی ضد حادث ہے، یعنی جس کا وجود پہلے معدوم ہو اسے پھر وجود ملا ہو۔ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ کلام پاک حادث ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نام ہے اصوات وحروف کے مجموعہ کا اور یہ دونوں چیزیں حادث ہیں کیونکہ ان میں ترکیب ہوتی ہے یعنی ایک آواز ختم ہوتی ہے تو دوسری پیدا ہوتی ہے اور جس چیز میں ترکیب ہو وہ حادث ہوا کرتی ہے لہذا حروف واصوات حادث ہیں اور جب اجزاء حادث ہیں تو مجموعہ بھی حادث ہو گا کیونکہ قاعدہ ہے کہ ''اَلْمُرَکَّبُ مِنَ الْحَادِثِ حَادِثٌ'' پس کلام الٰہی حادث ہے۔

کلام اللہ کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ کا نظریہ:

اہل السنۃ والجماعۃ کا کہنا یہ ہے کہ قرآن قدیم ہے مگر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اہل السنۃ والجماعۃ کلام کی دو قسمیں کرتے ہیں: کلام لفظی اور کلام نفسی، کلام نفسی کو قدیم مانتے ہیں اور کلام لفظی کو وہ بھی حادث مانتے ہیں، یعنی اصل شئ کو تو قدیم اور اس کے تعلقات کو حادث مانتے ہیں۔

کلامِ نفسی کے وجود کے دلائل:

پھر اختلاف کلام نفسی کا وجود کے بارے میں ہے معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں اہل السنۃ اس کا اثبات کرتے ہیں اور اہل السنۃ کے پاس کلام نفسی کے وجود پر پہلی دلیل تو بداہت ہے کیونکہ بالبداہت ہم اس بات کو سمجھتے ہیں کہ جب ہم کو کوئی کلام کرنا ہوتا ہے تو پہلے ہم اس کلام کا اپنے دل میں ایک اجمالی تصور قائم کرتے ہیں اور پھر تلفظ کے ذریعہ اس کا تفصیلی وجود ہوتا ہے اور دل میں جو اجمالی تصور ہوتا ہے اور جو دل میں بات ہوتی ہے اسی کا نام حقیقۃ کلام ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :

اِنَّ الْکَلَامَ لَفِی الْفُؤَادِ وَاِنَّمَا جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَیْہِ دَلِیْلًا

یعنی اصل بات تو دل میں ہوتی ہے مگر زبان کو اس دل کی بات پر رہنما بنایا گیا ہے۔

اسی طرح قرآن پاک اور احادیثِ مبارکہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کلام کی دو قسمیں ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو دل کے اندر ہوتا ہے، چناچہ ایک جگہ ارشاد ربانی ہے:

''یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ'' [1]

یہ لوگ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے ہیں جو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔

---

[1]: آلِ عمران: ۱۵۴۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

''أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ'' [1]

کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی خفیہ باتیں اور ان کی سرگوشیاں نہیں سنتے؟

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اَلسِّرُّ مَا أَسَرَّ ابْنُ آدَمَ فِيْ نَفْسِهٖ'' [2]

سر وہ ہے جو ابن آدم اپنے نفس میں چھپائے۔

معلوم ہوا کہ آدمی کے نفس میں بھی کلام ہوتا ہے، بات ہوتی ہے۔

اسی طرح کئی احادیثِ مبارکہ بھی اس مضمون کو بتلاتی ہیں، چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں:

''سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَأَلَهُ رَجُلٌ ،فَقَالَ: إِنِّيْ لَأُحَدِّثُ نَفْسِيْ بِالشَّيْءِ لَوْتَكَلَّمْتُ بِهٖ لَأَحْبَطْتُ أَجْرِيْ، فَقَالَ: لَا يُلْقٰى ذٰلِكَ الْكَلَامَ إِلَّا مُؤْمِنٌ'' [3]

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، جبکہ ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہا کہ یارسول اللہ میرے دل میں ایسی باتیں پیدا ہوری ہیں یا میں اپنے دل میں ایسی باتیں سوچتا ہوں کہ اگر میں زبان سے اس کو ادا کروں تو وہ میرے اعمال ہلاک اور برباد کر دیں گی، تو آپ نے فرمایا کہ یہ کلام نہیں ڈالا جاتا ہے مگر مومن کے دل میں۔

اس حدیث میں واضح طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دل میں آنے والے اس خیال اور تصور کو اور اس بات کو کلام قرار دیا، معلوم ہوا کہ دل میں جو بات آتی ہے اور جو خیال آتا ہے وہ بھی کلام ہوتا ہے جس کو ہم کلامِ نفسی کہتے ہیں، زبان سے جو ہم الفاظ نکالتے ہیں تو یہ الفاظ اس کلام پر دلالت کرنے والے اور اس کلام پر رہنمائی کرنے والے ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے:

فَإِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهُ فِيْ نَفْسِيْ (الصحيح البخاری: كتاب التوحيد: باب قول الله تعالىٰ ويحذركم الله نفسه)

(اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں) جب بندہ اپنے نفس میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اپنے نفس میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔

---

[1] الزخرف: ۸۰۔ [2] تفسیر ابن کثیر: ۵/ ۲۷۵۔ [3] معجم طبرانی: باب من اسمہ الحسن: رقم: ۳۵۷۔

بہر کیف ان دلائل سے ثابت ہو گیا کہ کلام نفسی کا وجود ہے، اس لئے اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں کہ کلام نفسی ذات باری کی صفت ہے اور اسی کے ساتھ قائم ہے اور وہ قدیم ہے، کیونکہ حوادث کا قیام واجب کے ساتھ ممتنع ہے اور اس کلامِ نفسی کا تعلق کلامِ لفظی کے ساتھ ہے اور یہ تعلق حادث ہے اور اس تعلق کے حادث ہونے کی وجہ سے اصل شئ کا حادث ہونا لازم نہیں آتا، جیسے کہ اللہ پاک کی اور دوسری صفات قدیم ہیں، مگر ان کے تعلقات حادث ہیں، تو جب اہل السنۃ والجماعۃ کلامِ نفسی کو قدیم مانتے ہیں تو معتزلہ کی دلیل اہل السنۃ والجماعۃ پر قائم نہیں ہوگی، اس لئے کہ معتزلہ نے دلیل کلامِ لفظی کو مان کر قائم کی ہے جب کہ ہم بھی کلامِ لفظی کو حادث مانتے ہیں۔

تاریخِ نُزولِ قرآن:

قرآن کریم جیسا کہ کلامِ الٰہی ہے، اس لئے ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: ”بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ، فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ “(بلکہ یہ قرآن مجید ہے، لوح محفوظ میں)۔

پھر لوحِ محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورے کا پورا آسمانِ دنیا کے بیت العزت میں نازل کر دیا گیا تھا، بیت العزت (جسے البیت المعمور بھی کہتے ہیں) کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا، پھر دوسری مرتبہ آنحضرت ﷺ پر تھوڑا تھوڑا کر کے حسبِ ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیئیس (۲۳) سال میں اس کی تکمیل ہوئی۔ [۱]

قرآن کی لغوی واصطلاحی تعریف:

لفظ قرآن لغت کے اعتبار سے مصدر ہے، قرء الكتاب (ف) قرأة وقرآنا: پڑھنا، بمعنی اسم مفعول یعنی وہ شئ جو پڑھی جائے۔ (یہ کتاب چونکہ بکثرت پڑھی جاتی ہے اس لئے اس کو قرآن کہتے ہیں)

اصطلاحی تعریف: ”القرآن المنزل على الرسول صلى الله عليه وسلم المكتوب في المصاحف المنقول عنه نقلا متواتر ابلا شبهة“ (قرآن وہ کتاب ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی ہے، جو مصاحف میں لکھی گئی ہے، جو بغیر شبہ کے حضور ﷺ سے منقول ہو کر نقل متواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے)۔

قرآن کے مزید نام: صحیح معنی میں قرآن کے کل پانچ نام ہیں (۱) القرآن (۲) الفرقان (۳) الذکر (۴) الکتاب (۵) التنزیل۔ (علوم القرآن)

۱: (اتقان: ۱/۴۱)۔

سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت:

آیت: بمعنی نشانی کیونکہ یہ اپنے پہلے والے کلام کے بعد والے کلام سے جدا ہونے پر نشانی ہوتی ہے۔ [1]

عرف میں کلماتِ قرآن کے اس حصہ کو آیت کہتے ہیں جس کو فصل کرکے دوسرے حصہ سے جدا کر دیا گیا ہو۔ (صاوی)

قرآن کریم کی کل آیتیں (۶۶۱۶) اور اس سلسلہ میں مختلف اقوال بھی ہیں۔ آنحضرت ﷺ پر قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اُتریں وہ صحیح قول کے مطابق کہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر نزولِ وحی کی ابتداء تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ ﷺ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس دوران آپ ﷺ غار حرا میں کئی کئی راتیں گذارتے، اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ایک دن اسی غار میں آپ ﷺ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ ''اقرأ'' (یعنی پڑھو) حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اس کے بعد خود حضور ﷺ نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھے پکڑا اور مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہاء ہوگئی، پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ ''اقرأ'' میں نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، فرشتے نے مجھے پھر پکڑا اور دوبارہ اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہاء ہوگئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ ''اقرأ'' میں نے جواب دیا کہ ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اس پر اُس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور بھینچ کر چھوڑ دیا پھر کہا:

﴿ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ، الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴾

''پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے، جس نے قلم سے تعلیم دی، انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہیں جانتا تھا''۔

---

[1]: ابن کثیر: ۱۴۔

یہ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی زمانہ کو "فترتِ وحی" کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں آیا تھا، آپ ﷺ کو آسمان و زمین کے درمیان دکھائی دیا، اور اس نے سورۂ مدثر کی آیات آپ ﷺ کو سنائیں، اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

مکی اور مدنی آیات و سورتیں:

سورۃ: سور البلد سے ماخوذ ہے کہ جس طرح شہر کی چہار دیواری بلند، اور شہر کا احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہے اسی طرح قرآن کی سورت بھی بلند مرتبہ اور اپنے مضامین کا احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہے۔

اصطلاح میں سورت قرآن کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس کا اول و آخر ہو اور اس کو اس کے مخصوص توقیفی نام کے ساتھ جانا جاتا ہو (سورتوں کے نام توقیفی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ منجانب اللہ مقرر ہے)۔ (صاوی)

مفسرین کی اصطلاح میں "مکی آیت و سورت" کا مشہور مطلب: وہ آیت و سورت ہے جو آپ ﷺ کے بغرض ہجرت مدینہ طیبہ پہنچے سے پہلے پہلے نازل ہوئی اور "مدنی آیت و سورت" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی۔

مکی اور مدنی سورتوں کی تعداد:

قرآن پاک کی کل ۱۱۴ سورتیں ہیں، ہجرت سے پہلے ۸۳ سورتیں اور بعد الہجرت ۳۱ سورتیں نازل ہوئیں۔ [۱]

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ مدنی سورتوں کی تعداد ۲۵ ہے، اس کے علاوہ سورتیں مکی ہیں۔ اور ابو الحسن بن حصار رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بالاتفاق ۲۰ سورتیں مدنی ہیں اور بارہ مختلف فیہ ہیں اور باقی تمام بالاتفاق مکی ہیں۔ اور عکرمہ اور حسن بن ابو الحسن کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ۲۹ سورتیں مدنی ہیں اور اس کے علاوہ مکی ہیں۔ [۲]

قرآن کریم کا تدریجی نزول:

آنحضرت ﷺ پر قرآن کریم دفعۃً اور یکبارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً تئیس (۲۳) سال میں اُتارا گیا ہے، بعض اوقات جبرئیل علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت یا آیت کا کوئی

۱: التقریر الحاوی۔ ۲: الاتقان فی علوم القرآن: ۱/۴۰ و ۴۳، ۴۴۔

ایک جُزلے کر تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کئی کئی آیتیں بیک وقت نازل ہو جاتیں، قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ "غیر اولی الضرر" [۱] ہے جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے، دوسری طرف پوری سورۂ انعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے۔ [۲]

قرآن کریم کے تدریجی نزول کی حکمتیں:

قرآن کریم کو یکبارگی نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے کیا تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا، وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيْرًا﴾ [۳]

"اور کافروں نے کہا کہ آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (تدریجاً اسلئے اتارا ہے) تاکہ ہم آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دل کو مطمئن کر دیں، اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے، اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کریں مگر ہم ٹھیک اور وضاحت میں بڑھا ہوا جواب عنایت کرتے ہیں"۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اُمی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا۔

(۲) اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً لازم ہو جاتی، اور یہ اس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعت محمدی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم میں ملحوظ رہی ہے۔

(۳) آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبرئیل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلے کو آسان بنا دیتا تھا، اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تقویتِ قلب کا سبب بنتا تھا۔

۱: نساء: ۹۴۔ ۲: ابن کثیر: ۲/ ۱۲۲۔ ۳: الفرقان: ۳۲ و ۳۳۔

(۴) قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جوابات اور مختلف واقعات سے متعلق ہے اس لئے ان آیتوں کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کریم کی غیبی خبریں بیان کرنے سے اس کی حقانیت اور زیادہ آشکارا ہو جاتی تھی۔ ۱؎

شانِ نزول:

قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ اُن کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہئے، یہ پسِ منظر مفسرین کی اصطلاح میں ''سببِ نزول'' یا ''شانِ نزول'' کہلاتا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ﴾

''مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور بلاشبہ ایک مؤمن کنیز ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ مشرکہ تمہیں پسند ہو''۔

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانہ جاہلیت میں حضرت مَرثَد بن ابی مَرثَد غنوی رضی اللہ عنہ کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ حضرت مرثد رضی اللہ عنہ کسی کام سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انہیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثد رضی اللہ عنہ نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں، مدینہ طیبہ تشریف لا کر حضرت مرثد رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی اجازت چاہی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی گئی۔ ۲؎

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا ''شانِ نزول'' یا ''سببِ نزول'' ہے، قرآن کریم کی تفسیر میں ''شانِ نزول'' نہایت اہمیت کا حامل ہے، بہت سی آیتوں کا مفہوم اس وقت تک صحیح طور سے سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اُن کا شانِ نزول معلوم نہ ہو۔

۱؎: تفسیر کبیر: ۳۳۶/۶۔ ۲؎: اسباب النزول للواحدی رحمۃ اللہ علیہ، ص ۳۸۔

قرآن کریم کے سات طریقوں پر نازل ہونے کا مطلب:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے امت محمدیہ (علی صاحبہا السلام) کو ایک سہولت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی شخص سے کوئی لفظ ایک طریقہ سے نہیں پڑھا جاتا تو وہ اسے دوسرے طریقہ سے پڑھ سکے، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ بنو غفار کے تالاب کے پاس تشریف فرماتھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آگئے، اور انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کو حکم دیا ہے کہ آپ (ﷺ) اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پر پڑھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، جبرئیل علیہ السلام دوبارہ آپ ﷺ کے پاس دو حروف پر پڑھنے کی وحی لے کر آئے، آپ ﷺ نے وہی جواب دیا، تیسری دفعہ تین حروف کے مطابق پڑھنے کی وحی لے کر آئے، آپ ﷺ نے وہی جواب دیا، پھر چوتھی دفعہ آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کو حکم دیا ہے کہ آپ (ﷺ) کی اُمت قرآن کو سات حروف پر پڑھے، پس وہ ان میں سے جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قرأت درست ہو گی۔ [1]

چنانچہ ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

''إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ'' [2]

''یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس ان میں سے جو تمہارے لئے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو''۔

آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں سات حروف سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں، لیکن محقق علماء کے نزدیک اس میں راجح مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو قرأتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اُن میں باہمی فرق و اختلاف کل سات نوعیتوں پر مشتمل ہے اور وہ سات نوعیتیں یہ ہیں:

(۱) اسماء کا اختلاف، جس میں افراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، مثلاً ایک قرأت میں ''تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ'' ہے اور دوسری قرأت میں ''تَمَّتْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ''۔

---

[1]: بحوالہ مناہل العرفان: ۱/ ۱۳۳۔ [2]: صحیح بخاری مع القسطلانی: ۷/ ۴۵۳۔

(۲) افعال کا اختلاف؛ کہ کسی قرأت میں صیغۂ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر مثلاً ایک قرأت میں "رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا" ہے اور دوسری میں "رَبَّنَا بَعَّدَ بَيْنَ اَسْفَارِنَا"۔

(۳) وجوہِ اعراب کا اختلاف: جس میں اعراب یعنی زیر زبر پیش کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً "لَا يُضَارَّ كَاتِبٌ" کی جگہ "لَا يُضَارُّ كَاتِبٌ" اور "ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ" کی جگہ "ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ"

(۴) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف، کہ ایک قرأت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو مثلاً ایک قرأت میں "تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ" اور دوسری میں "تَجْرِىْ تَحْتَهَا الْاَنْهَارُ"۔

(۵) تقدیم و تاخیر کا اختلاف: ایک قرأت میں کوئی لفظ مقدم ہے اور دوسری میں مؤخر ہے، "وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ" اور "وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ"۔

(۶) بدلیت کا اختلاف: ایک قرأت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قرأت میں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ مثلاً "فَتَبَيَّنُوْا" اور "فَتَثَبَّتُوْا"، اور طَلْحٍ اور طَلْعٍ۔

(۷) لہجوں کا اختلاف: جس میں تفخیم، ترقیق، امالہ، مد، قصر، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات داخل ہیں، یعنی اس میں لفظ تو نہیں بدلتا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ بدل جاتا ہے مثلاً مُوْسٰی کو ایک قرأت میں مُوْسیٰ کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

بہر حال: اختلافِ قرأت کی ان سات نوعیتوں کے تحت بہت سی قرأتیں نازل ہوئی تھیں اور ان کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہوتا تھا، صرف تلاوت کی سہولت کے لئے ان کی اجازت دی گئی تھی۔

شروع میں چونکہ لوگ قرآن کریم کے اسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے، اس لئے اِن سات اقسام کے دائرے میں بہت سی قرأتوں کی اجازت دیدی گئی تھی، لیکن آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے، جس سال آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس سال آپ ﷺ نے دو مرتبہ دور فرمایا، اس دور کو "عرضۂ اخیرہ" کہتے ہیں، اس موقع پر بہت سی قرأتیں منسوخ کردی گئیں، اور صرف وہ قرأتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔

علم قرأت کی بنیاد:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوتِ قرآن کے معاملہ میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لئے اپنے عہد خلافت میں قرآن کریم کے سات نسخے تیار کرائے اور ان سات نسخوں میں تمام قرأتوں کو اس طرح

سے جمع فرمایا، کہ قرآن کریم کی آیتوں پر نقطے اور زیر زبر پیش نہیں ڈالے، تاکہ انہی مذکورہ قرأتوں میں سے جس قرأت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں، اس طرح اکثر قرأتیں اس رسم الخط میں سما گئیں، اور جو قرأتیں رسم الخط میں نہ سما سکیں اُن کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قرأت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قرأت کے مطابق، امت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قرأتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علم قرأت ایک مستقل علم بن گیا۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات نسخے مختلف خطوں میں بھیجے تو ان کے ساتھ ایسے قاریوں کو بھی بھیجا تھا جو اُن کی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قرأتوں کے مطابق لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قرأتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قرأتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح ”علم قرأت“ کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمہ قرأت سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قرأت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری امت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ ”قرأت“ قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں۔

(۱) مصاحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

(۲) عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو۔

(۳) وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور ائمہ قرأت میں مشہور ہو۔

جس قرأت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو اسے قرآن کا جز نہیں سمجھا جا سکتا، اس طرح متواتر قرأتوں کی ایک بڑی تعداد نسلا بعد نسل نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قرأتوں کو اختیار کرکے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی اور وہ قرأت اُس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان قرأتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنی شروع کیں، علامہ ابو بکر ابن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۲۴ھ) نے بھی ایک کتاب لکھی، جس میں صرف سات قاریوں کی قرأتیں جمع کی گئی تھیں، اُن کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قرّاء کی قرأتیں دوسرے قراء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح

اور متواتر قرأتیں صرف یہی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے محض اتفاقاً ان سات قرأتوں کو جمع کر دیا تھا، اُن کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا دوسری قرأتیں غلط یا ناقابل قبول ہیں، علامہ ابن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ ''سبعۃ احرف'' کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ محض یہی سات قرأتیں صحیح قرأتوں کا ایک حصہ ہیں، ورنہ ہر وہ قرأت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اُترتی ہو، صحیح قابل قبول اور ان سات حروف میں داخل ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا۔

سات قراء:

بہر حال! علامہ ابن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوے وہ یہ ہیں:
(۱) عبد اللہ بن کثیر الداری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۰ھ)۔ (۲) نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۶۹ھ)۔

(۳) عبد اللہ الحصبی رحمۃ اللہ علیہ، جو ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے معروف ہیں (متوفی ۱۱۸ھ)، (۴) ابو عمر دزبان بن العلا رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۵۴ھ)، (۵) حمزۃ بن حبیب الزیات مولیٰ عکرمہ بن ربیع التیمی (متوفی ۱۸۸ھ)، (۶) عاصم بن ابی النجود الاسدی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۷ھ) آپ کی قرأت کے راویوں میں شعبہ بن عیاش رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۳ھ) اور حفص بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۸۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔ آجکل عموماً تلاوت انہی حفص بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے۔ (۷) ابو الحسن علی بن حمزۃ الکسائی النحوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۸۹ھ) موئخر الذکر تینوں حضرات کی قرأتیں زیادہ تر کوفہ میں رائج ہوئیں۔

تاریخ حفاظتِ قرآن:

عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع قرآن:

قرآن کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لیا جائے، چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے الفاظ کو اُسی وقت دہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر سورۂ

قیامہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہدایت فرمائی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپ ﷺ کو عین نزولِ وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزولِ وحی کے بعد آپ (ﷺ) اُسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ ادھر آپ پر آیاتِ قرآنی نازل ہوتیں اور اُدھر وہ آپ ﷺ کو یاد ہوجاتیں، اس طرح سرکارِ دوعالم ﷺ کا سینۂ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنی غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے اور جس سال آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس سال آپ ﷺ نے دومرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دور کیا۔ [1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قرآن سیکھنے کا شوق:

پھر آپ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کریم کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انہیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی مہر طلب نہیں کیا کہ وہ انہیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوا سے آزاد کرکے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کردی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اسے دہراتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کرکے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپ ﷺ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرمادیتے، تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور مسجد نبوی ﷺ میں قرآن سیکھنے سکھانے والوں کی آوازوں کا اتنا شور ہونے لگا کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ تاکید فرمانی پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی مغالطہ پیش نہ آئے۔ [2]

چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک ایسی بڑی جماعت تیار ہوگئی جسے قرآن کریم ازبر حفظ تھا، اس جماعت میں خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ، حضرت سالم رضی اللہ عنہ مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن السائب رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا، حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

---

[1]: صحیح بخاری مع فتح الباری: ۹/ ۳۶۔ [2]: مناہل العرفان: ۱/ ۲۳۴۔

غرض ابتدائے اسلام میں زیادہ زور حفظِ قرآن پر دیا گیا، اور اس وقت کے حالات میں یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوسکتی تھی، اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت ہوتی، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظے کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں اپنے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اسی قوتِ حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں۔

کتابتِ وحی:

قرآن کریم کو حفظ کرانے کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے قرآن کریم کو لکھوانے کا بھی خاص اہتمام فرمایا، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آپ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ کو سخت گرمی لگتی، اور آپ ﷺ کے جسم اطہر پر پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر جب آپ ﷺ سے یہ کیفیت ختم ہوجاتی تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا (کسی اور چیز کا) ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپ لکھواتے رہتے، اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہرحال! جب میں فارغ ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے "پڑھو" میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگذاشت ہوتی تو آپ ﷺ اس کی اصلاح فرمادیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے۔ [۱]

چند کاتبین وحی کے نام:

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیتے تھے، جن میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ، وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ [۲]

---

[۱]: مجمع الزوائد: ۱/۵۶، بحوالہ طبرانی۔ [۲]: تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری: ۹/۱۸ اور زاد المعاد: ۱/۳۰۔

عہد نبوی میں کتابت کی شکل:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے۔[1] اُس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے جاتے۔[2]

اس طرح عہد رسالت میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرام بھی اپنی یادداشت کے لئے آیاتِ قرآنیہ اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے ابتدائی عہد سے جاری تھا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے ہی اُن کی بہن اور بہنوئی کے یہاں ایک صحیفہ میں آیاتِ قرآنی لکھی ہوئی تھیں۔[3]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن:

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر یا وہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔

اس بناء پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصوں کو یکجا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انہوں نے یہ کارنامہ جن محرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک روز مجھے پیغام بھیج کر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ "عمر رضی اللہ عنہ نے آکر مجھ سے یہ بات کہی

---

[1]: فتح الباری ۹/۱۸۔ [2]: ایضاً ۹/۱۱۔ [3]: سیرت ابن ہشام: ۱/۳۴۳۔

ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حفاظ اسی طرح شہید ہوتے رہیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کروانے کا کام شروع کر دیں،'' میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟

عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا ہے اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمر رضی اللہ عنہ کی ہے، اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ ''تم نوجوان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی کتابت وحی کا کام انجام دیتے رہے ہو لہذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کے انہیں جمع کرو۔

صحابہ کرام کی احتیاط:

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''خدا کی قسم: اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا'' حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم: یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لئے کھول دیا، جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا۔[1]

اس موقع پر جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے، وہ خود حافظ قرآن تھے، لہذا وہ اپنی یاداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، اُن کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ اُس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جا سکتا تھا۔

نیز قرآن کریم کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے حضرت زید رضی اللہ عنہ ان سے بھی قرآنِ کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انہوں نے احتیاط کے پیش نظر صرف کسی ایک

---

[1]: صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن۔

طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہ رضی اللہ عنہ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے انہیں یکجا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلانِ عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی جتنی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

جمع قرآن کے وقت آیات قرآنیہ کی تصدیق کے شرائط:

(۱) سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے۔

(۲) پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی حافظِ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ لگا دیا تھا اور جب کوئی شخص کوئی آیت لیکر آتا تھا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے۔[۱]

(۳) کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو قابلِ اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آنحضرت ﷺ کے سامنے لکھی گئی تھی۔[۲]

(۴) اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم نے تیار کر رکھے تھے۔[۳]

ایک اعتراض کا دفعیہ:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع قرآن کا یہ طریق کار ذہن میں رہے تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ سورۂ براۃ کی آخری آیات "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ" مجھے صرف حضرت ابو خزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں، ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں"۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابو خزیمہ رضی اللہ عنہ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو ان کا جزء قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت ﷺ کی لکھوائی ہوئی

---

[۱]: فتح الباری: ۹/۱۱، بحوالہ ابن ابی داؤد۔ [۲]: اتقان: ۱/۶۰۔ [۳]: البرہان فی علوم القرآن للزرکشی رحمۃ اللہ علیہ: ۱/۲۳۸۔

متفرق آیتیں لے لے کر آرہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت ابو خزیمہ رضی اللہ عنہ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزو قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تو تواتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، کیونکہ سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد بھی تھیں، اور جن حضرات کے پاس آیاتِ قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابو خزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں، کسی اور کے پاس نہیں۔[۱]

بہر کیف، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیاتِ قرآنی کو جمع کرکے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا،[۲] لیکن ہر سورت علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو "اُم" کہا جاتا ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انہیں ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا، پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد مروان بن الحکم نے اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف تیار ہو چکے تھے، اور اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے ان مصاحف کی پیروی لازم ہے، مروان بن الحکم نے سوچا کہ اب کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہیے جو اس رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔[۳]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن:

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا اُن تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قرأتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قرأت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا، اس طرح قرأتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے

۱: البرہان: ۱/ ۲۳۴، ۲۳۵۔ ۲: اتقان: ۱/ ۶۰۔ ۳: فتح الباری: ۹/ ۱۶۔

کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اُس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے بعض لوگ اپنی قرأت کو صحیح اور دوسرے کی قرأت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قرأتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابلِ اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کونسی قرأت صحیح اور کونسی غلط ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

اس کارنامے کی تفصیل روایات حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ آرمینیا اور آذر بیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قرأتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہونچے، اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ اُمت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کی شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت پڑھتے ہیں، جو اہلِ عراق نے نہیں سنی ہوتی ہے، اور اہل عراق عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کے مطابق پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قرأت کے مطابق قرآن پڑھایا، اور دوسرے معلم نے دوسری قرأت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک

پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قرأت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جلیل القدر صحابہ کو جمع کرکے ان سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ: مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے اور یہ بات کفر کی حد تک پہونچ سکتی ہے، لہذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے، صحابہ رضی اللہ عنہ نے خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ "آپ نے کیا سوچا ہے؟" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کردیں تاکہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے" صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس رائے کو پسند کرکے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کرکے ایک خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قرأتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتداء ہو۔

عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن:

اس غرض کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے تیار کرائے ہوئے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم اُن کو مصاحف میں نقل کرکے آپ کو واپس کردیں گے، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ صحیفے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد الرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ پر مشتمل تھی، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صحیفوں سے نقل کرکے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان چار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت زید انصاری رضی اللہ عنہ تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی، اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ "جب تمہارا اور زید رضی اللہ عنہ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو (یعنی

اس میں اختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟) تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔"

عہد عثمان میں تکمیل شدہ امور:

بنیادی طور پر تو یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا۔[۱] ان حضرات نے کتابتِ قرآن کے سلسلے میں مندرجہ کام انجام دیئے:

(۱) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔[۲]

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قرأتیں سما جائیں، اسی لئے اُن پر نہ نقطے لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر زبر پیش) تا کہ اسے تمام متواتر قرأتوں کے مطابق پڑھا جا سکے، مثلاً ںسرھا لکھا تا کہ اسے نَنْشُرُھَا اور نُنْشِزُھَا دونوں طرح پڑھا جا سکے کیونکہ یہ دونوں قرأتیں درست ہیں۔[۳]

(۳) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے تیار کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پانچ مصاحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم سجستانی فرماتے ہیں کہ کل سات نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا۔[۴]

(۴) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی طریقہ کار اختیار کیا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس محفوظ تھیں انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور

۱: یہ پوری تفصیل اور اس سلسلے کی تمام روایات فتح الباری ص ۱۳ تا ۱۵ ج ۹ سے ماخوذ ہیں۔ ۲: مستدرک: ۲/ ۲۲۹۔
۳: مناھل العرفان: ۱/ ۲۵۳ و ۲۵۴۔ ۴: فتح الباری: ۹/ ۱۷۔

ان کے ساتھ از سر نو مقابلہ کرکے یہ نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۂ احزاب کی ایک آیت: "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" علاحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس ملی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ "مصحف لکھتے وقت سورۂ احزاب کی وہ آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا" اس سے صاف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زید رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت اُن میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی اُن تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس لکھی ہوئی تھیں اس لئے حضرت زید رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک اُن تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس علاحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورۂ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خذیمہ رضی اللہ عنہ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

(۵) قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذرِ آتش فرمادیئے جو مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط، مسلمہ قرأتوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو پوری امت نے بنظرِ استحسان دیکھا، اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش رہی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، (تفصیل کے لئے "علومِ قرآن" ملاحظہ فرمایئے) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم! انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا ہے وہ ہم سب کی موجودگی میں مشورے سے کیا"[۱]

---

[۱] فتح الباری: ۹/۱۵۔

تلاوت میں آسانی کے اقدامات:

نقطے اور حرکات:

جب اسلام عجمی ممالک میں پھیلا اور قرآن کریم کے نسخے نقطوں اور حرکات سے خالی تھے تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں ان چیزوں کا اضافہ کیا جائے تاکہ تمام لوگ آسانی سے تلاوت کر سکیں اس لئے بعض روایات کے مطابق سب سے پہلے یہ کارنامہ ابو الاسود دؤلی نے حضرت علی یا زیاد بن ابی سفیان کے حکم سے انجام دیا، اور ایک روایت کے مطابق حجاج بن یوسف نے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ، یحیی بن یعمر اور نصر بن عاصم لیثی کے ذریعہ انجام دیا۔

احزاب یا منزلیں:

صحابہ اور تابعین کا معمول تھا کہ ہر ہفتہ میں قرآن پاک مکمل فرمالیا کرتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے ایک مقدار مقرر کر لی تھی جس کو حزب یا منزل کہا جاتا ہے اس طرح قرآن میں کل سات منزلوں کی تقسیم ہوئی۔

اجزاء یا پارے:

بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے پیشِ نظر قرآن پاک کو کل تیس حصوں پر تقسیم کیا گیا ایک حصہ کو پارہ یا جزء کہا جاتا ہے۔

رکوع:

آیات کی ایسی مقدار جہاں سلسلۂ کلام ختم ہو اور وہ مقدار ایک رکعت میں پڑھی جاسکے اسے رکوع کہتے ہیں، اور اسے رکوع اسی لئے کہتے ہیں کہ اس جگہ پہنچ کر رکوع کیا جائے، پورے قرآن مجید میں کل ۵۴۰ رکوع ہیں اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے تو ستائیسویں شب میں کلام پاک مکمل ہوتا ہے۔

رموز واوقاف:

تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے مختلف قرآنی جملوں کے آخر میں ایسے اشارے لکھ دئے گئے ہیں مثلاً ط، ص، ز، وغیرہ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وقف کرنا یعنی سانس لینا کیسا ہے، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ غیر عربی داں جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کر سکے اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں تبدیلی پیدا نہ ہو۔

قرآن کریم کی طباعت کا آغاز:

جب تک پریس (Press) ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابتِ قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کے لئے مستقل تصنیف چاہیے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیمبرگ (Hamburg) کے مقام پر ۱۱۱۳ھ میں قرآن کریم طبع ہوا جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہوسکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ (ST Petersburg) میں ۱۷۸۷ء میں قرآنِ کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۲۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر طبع کیا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہوگئے۔ [1]

علم تفسیر:

قرآن کریم میں آنحضرت ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:

”وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ“

اور ہم نے قرآن آپ ﷺ پر اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرمادیں جو اُن کی طرف اُتاری گئیں ہیں۔

نیز قرآن کریم کا ارشاد ہے:

”لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ“

---

[1]: تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ القرآن للکردی رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۸۶ و علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی صالح اردو ترجمہ از غلام احمد حریری ص ۱۴۲، ان مباحث میں معارف القرآن، علوم القرآن اور دیگر کتب سے مدد لی گئی ہے۔

''بلاشبہ اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا جبکہ اُن کے درمیان انہی میں سے ایک رسول (ﷺ) بھیجا، جو اُن کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، اور انہیں پاک صاف کرے، اور انہیں اللہ کی کتاب اور دانائی کی باتوں کی تعلیم دے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صرف قرآن کریم کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے بلکہ اس کی پوری تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک ایک سورت پڑھنے میں بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے تھے، اس لئے کچھ باتیں علم تفسیر سے متعلق بھی زیر تحریر ہیں۔

علمِ تفسیر کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

تفسیر کے لغوی معنیٰ ہیں بیان کرنا، کھولنا، واضح کرنا۔

اس کے اصطلاحی معنیٰ علماء نے مختلف الفاظ سے مختلف انداز میں بیان کیے ہیں، چنانچہ ابو حیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تفسیر ایسا علم ہے جس میں الفاظِ قرآنی کے نطق کی کیفیت (یعنی علمِ قرأت) سے متعلق بحث کی جائے، اور اس کے مدلولات (یعنی قرآن پاک کے الفاظ کے مدلولات اور مصداقات) سے متعلق بحث کی جائے، (جس میں بطورِ خاص علمِ لغت کی ضرورت ہوتی ہے)۔ اور قرآن پاک کے افرادی اور ترکیبی احکام سے متعلق بحث کی جائے، (جس میں علمِ صرف، علمِ معانی اور علمِ بدیع کی ضرورت ہوتی ہے) اور اس میں الفاظ کے ان معانی سے بحث کی جائے جن پر ترکیب کی حالت میں ان کو محمول کیا جاتا ہے، (یعنی جس میں الفاظ کی دلالت معانی پر حقیقی اور مجازی ہونے سے متعلق بحث کی جائے)، اور اس کے علاوہ اس کے تتمات (یعنی ناسخ اور منسوخ، واقعہ یا احکام کے نزول کے اسباب سے متعلق بحث کی جائے اور قرآن میں جو باتیں مبہم ہوں ان کی وضاحت اور تفسیر سے بحث کی جائے اور جو مطلق ہوں ان کی تقیید سے) بحث کی جائے وغیرہ وغیرہ، ان سب چیزوں کے جاننے کا نام علمِ تفسیر ہے۔[1]

ایک اور تعریف اس طرح بھی کی گئی ہے:

''عِلْمُ نُزُوْلِ الْآیَاتِ وَشُئُوْنِهَا وَأَقَاصِیْصِهَا، وَالْأَسْبَابِ النَّازِلَةِ فِیْهَا ثُمَّ تَرْتِیْبِ مَكِّیِّهَا وَمَدَنِیِّهَا، وَمُحْكَمِهَا وَمُتَشَابِهِهَا، وَنَاسِخِهَا وَمَنْسُوْخِهَا، وَخَاصِّهَا وَعَامِّهَا، وَمُطْلَقِهَا وَمُقَیَّدِهَا، وَمُجْمَلِهَا وَمُفَسَّرِهَا، وَحَلَالِهَا وَحَرَامِهَا وَوَعْدِهَا وَوَعِیْدِهَا، وَأَمْرِهَا وَنَهْیِهَا، وَعِبَرِهَا وَأَمْثَالِهَا''[2]

---

[1]: الاتقان فی علوم القرآن النوع السابع فی معرفۃ تفسیرہ وتاویلہ۔ [2] حوالۂ سابق۔

علمِ تفسیر، آیات کے نزول، کیفیات، قصص اور آیات کے نزول کے اسباب، اسی طرح ان کے مکّی اور مدنی ہونے کی ترتیب، اور ان کے محکم اور متشابہ، ناسخ اور منسوخ، خاص اور عام، مطلق اور مقید، مجمل اور مفسّر، حلال اور حرام، وعدہ اور وعید، امر اور نہی، عبرت اور نصیحت آموز باتوں کے جاننے کا نام ہے۔

ایک مختصر تعریف علّامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں کی ہے:

''عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيْهِ عَنْ أَحْوَالِ الْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ، مِنْ حَيْثُ دَلَالَتِهٖ عَلٰى مُرَادِ اللهِ تَعَالٰى، بِقَدْرِ الطَّاقَةِ الْبَشَرِيَّةِ''[1]

علمِ تفسیر ایسے علم کو کہتے ہیں جس میں انسانی طاقت کے بقدر اللہ تعالیٰ کی مراد پر دلالت کرنے کی حیثیت سے قرآن مجید کے احوال سے بحث کی جائے۔

ظاہر ہے کہ اللہ پاک کی کیا مراد ہے؟ اور اللہ پاک نے اس کے کیا معنیٰ مراد لئے ہیں یہ تو انسان کے بس کی بات نہیں ہے، لیکن انسان اپنی استطاعت کے مطابق اس کے معانی و مفاہیم متعین کرنے اور احکام وغیرہ کو ثابت کرنے کے لئے ان سارے علوم کا محتاج ہے، جن کے ذریعہ بندہ اپنی بساط کے بقدر مرادِ الٰہی پر مطلع ہو سکتا ہے۔ اس لئے علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ انسانی طاقت کے بقدر مرادِ الٰہی پر دلالت کی حیثیت سے قرآن مجید کے احوال سے بحث کرنے کا نام علمِ تفسیر ہے۔

تفسیر اور تاویل میں فرق:

علامہ ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الفاظِ قرآنی کے معانی کو قطعیت کے ساتھ بیان کیا جائے کہ اس لفظ کے یہی معنیٰ ہیں، اس کا نام تفسیر ہے۔ اور تاویل کہتے ہیں کہ لفظ کے چند محتمل معانی میں سے کسی معنیٰ کو بغیر قطعیت کے ترجیح دی جائے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ تفسیر کا تعلق روایات سے ہوتا ہے اور تاویل کا تعلق درایات سے ہوتا ہے یعنی آیات سے متعلق روایات بیان کرنے کو تفسیر کہتے ہیں اور معانیِ قرآن اور اس کے احکام کے بیان وغیرہ کو تاویل کہتے ہیں۔

علامہ راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تفسیر اور تاویل میں فرق یہ ہے کہ لفظِ تفسیر الفاظ اور مفردات میں استعمال ہوتا ہے اور تاویل معانی اور جملوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور آگے فرماتے ہیں کہ کتبِ الٰہیہ کے لئے تاویل اور دیگر کتابوں کے لئے تفسیر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

---

[1] مناهل العرفان في علوم القرآن: المبحث الثاني عشر في التفسير والمفسرين وما يتعلق بهما۔

ابو طالب التغلبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تاویل، مراد الٰہی اور اس کی حقیقت کی خبر دینے کا نام ہے اور تفسیر مراد کی دلیل بتانے کا نام ہے۔[1]

تفسیر کی ضرورت کیوں؟

علماء نے لکھا ہے کہ تین امور ایسے ہیں جن کی وجہ سے تفسیر کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۱) مصنف انتہائی باکمال اور بافضیلت اور باعلم ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا جیسا کمال ہوگا ویسا ہی اس کا کلام بھی ہوگا، اس کے اسی کمال اور علمی قوت کی وجہ سے اس کے کلام کے معانی بہت ہی دقیق ہوتے ہیں جس سے اس کی مراد کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے اس لئے تفسیر کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۲) صاحبِ کلام، بعض تتمات اور شرائط اور اس کے علاوہ دیگر چیزیں واضح ہونے کی وجہ سے سامع پر اعتماد کر کے بیان نہیں کرتا ہے لیکن سامع پھر بھی اس کو سمجھ نہیں پاتا، اس لئے شارع کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں کی توضیح کرے۔

(۳) بعض اوقات ایک لفظ کے کئی معانی اور مطالب ہوتے ہیں، جیسا کہ کبھی الفاظ کے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنیٰ مراد ہوتے ہیں، تو اس کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے سحر کا وقت بتلاتے ہوئے فرمایا کہ جب تک کالے دھاگے کے مقابلہ میں سفید دھاگہ واضح نہ ہو جائے اس وقت تک کھاؤ، اس آیت میں اللہ پاک نے "خیطِ ابیض اور خیطِ اسود" کا لفظ استعمال فرمایا، جس کے معنیٰ سفید دھاگے اور کالے دھاگے کے ہیں اور حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے بھی اس کے یہی معانی مراد لئے، اور اس کے مطابق عمل کیا کہ اپنے تکیہ کے نیچے یہ دو رنگ کے دھاگے رکھ لئے اور سحر میں ان دونوں کو دیکھتے جاتے کہ سفید دھاگہ کالے دھاگہ کے مقابلہ میں واضح ہوا یا نہیں، اور کھاتے جاتے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی آپ نے فرمایا کہ اے عدی تمہارا تکیہ تو بڑا چوڑا ہے، پھر آپ نے اس کی توضیح فرمائی کہ اس سے مراد آسمان پر ظاہر ہونے والی سفیدی اور سیاہی ہے، سفید دھاگا اور کالا دھاگا مراد نہیں ہے۔[2]

---

[1]: الاتقان فی علوم القرآن: النوع السابع والسبعون: فی معرفۃ تفسیرہ وتأویلہ وبیان شرفہ والحاجۃ الیہ۔

[2]: صحیح البخاری: کتاب تفسیر القرآن: باب قول اللہ تعالیٰ وکلوا واشربوا۔ الخ

علمِ تفسیر کا حکم:

شریعت میں علم تفسیر کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کا سیکھنا کیا ہمارے لئے ضروری ہے؟ تو اس کو یوں سمجھئے کہ کتبِ سماویہ پر ایمان لانا تو بالاجمال فرضِ عین ہے اور خود قرآن پاک پر اس حیثیت سے کہ ہم اس کے احکام کے مکلف ہیں، (ایمان اجمالی تو فرض عین ہے) البتہ تفصیلاً ایمان لانا فرضِ کفایہ ہے، اس لئے کہ ایمان فرع ہے علم کی اب اگر ایمانِ تفصیلی فرض عین ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تفصیلی علم حاصل کرنا بھی فرضِ عین ہے اور جب تفصیلی علم فرض عین ہو گیا تو لوگوں کے ذرائعِ معاش بیکار ہو کر رہ جائیں گے اس بنا پر علم تفسیر کو فرض کفایہ کے درجہ میں رکھا گیا۔

علمِ تفسیر کا مقام اور مرتبہ

علم تفسیر کا مرتبہ سب سے اونچا ہے اسی وجہ سے علم تفسیر کو رئیسِ علوم دینیہ کہا گیا ہے اس لئے کہ علم کی شرافت معلوم کے اشرف ہونے سے ہوتی ہے جیسا کہ علم کیمیا اشرف ہے کیونکہ اس کا معلوم اشرف ہے یعنی مٹی سے سونا بنانا، اسی طرح علم تفسیر کا معلوم کلامِ الٰہی کی مراد ہے اور کلامِ الٰہی کی مراد اشرف ہے تمام چیزوں کے مقابلہ میں، لہٰذا اس کا علم بھی اشرف ہو گا تمام علوم سے۔[1]

جب تک آنحضرت ﷺ دنیا میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جہاں کوئی دشواری پیش آتی وہ آپ ﷺ سے رجوع کرتے اور انہیں تسلی بخش جواب مل جاتا، لیکن آپ ﷺ کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ تفسیر قرآن کو ایک مستقل علم کی صورت میں محفوظ کیا جائے، تاکہ اُمت کے لئے قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں، اور ملحد و گمراہ لوگوں کے لئے اس کی معنوی تحریف کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس امت نے یہ کارنامہ اس حسن وخوبی سے انجام دیا کہ آج ہم یہ بات بلاخوف وتردد کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی اس آخری کتاب کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں ہیں بلکہ اس کی وہ صحیح تفسیر و تشریح بھی محفوظ ہے جو آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔

---

[1] مناہل العرفان: المبحث الثانی عشر فی التفسیر والمفسرین وما یتعلق بھما، العلوم التی یحتاجھا المفسر۔

علم تفسیر کا مأخذ:

تفسیر قرآن کے مآخذ کیا کیا ہیں؟ اور علم تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہر زبان میں ملتی ہیں انہوں نے قرآن کریم کی تشریح میں کن سرچشموں سے استفادہ کیا ہے، اور جن کے ذریعہ فن تفسیر میں مدد طلب کی جاتی ہے یہ سرچشمے کل چھ ہیں:

۱۔ قرآن کریم

علم تفسیر کا پہلا مأخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بہت کثرت سے ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآنِ کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کردیتی ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ کی دُعا میں یہ جملہ موجود ہے "صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" یعنی ہمیں اُن لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا، اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور پر متعین کردیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

"أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ"

"یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالح لوگ"

چنانچہ مفسرین کرام جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

۲۔ حدیث:

"حدیث" آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال کو کہتے ہیں اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ آپ (ﷺ) کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپ (ﷺ) لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرمادیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپ ﷺ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے، اس لئے مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں

اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصولوں پر پوری نہ اُترتی ہو، لہذا جو روایت جہاں نظر آجائے اُسے دیکھ کر قرآن کریم کی کوئی تفسیر متعین کر لینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہوسکتی ہے، درحقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اور اس میں قدم رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جنہوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

۳۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال:

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کی تعلیم براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزول وحی کے وقت وہ بہ نفسِ نفیس موجود تھے، اور انہوں نے نزولِ قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابلِ اعتماد ہوسکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا، لہذا جن آیتوں کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہو تو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں، ہاں! اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اور قواعد، اصولِ فقہ اور اصولِ تفسیر میں مدون ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

۴۔ تابعین رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال:

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین رحمۃ اللہ علیہ کا نمبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابۂ کرام سے سیکھی ہے، اس لئے اُن کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعین رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ (الاتقان: ۲/۱۷۹) لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ لُغتِ عرب:

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیر قرآن کے لئے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پسِ منظر میں چونکہ

کوئی شانِ نزول یا کوئی اور فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے اُن کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ اُن کی تفسیر کا ذریعہ صرف لغت عرب ہوتی ہے اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں محاکمہ کے لئے بھی علم لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

۶۔ تدبر اور استنباط:

تفسیر کا آخری مأخذ "تدبر اور استنباط" ہے، قرآن کریم کے نکات و اسرار ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے، جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو وہ جتنا اس میں غور و فکر کرتا ہے اُتنے ہی نئے نئے اسرار و نکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہ اپنے اپنے تدبر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار و نکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ مأخذ سے متصادم نہ ہوں، لہٰذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن و سنت ، اجماع ،لغت یا صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کے خلاف ہو یا کسی دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، بعض صوفیاء رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن اُمت کے محقق علماء نے انہیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن و سنت اور شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔[۱]

اسرائیلیات کا حکم

"اسرائیلیات" اُن روایتوں کو کہتے ہیں جو اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، پہلے زمانے کے مفسرین کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کی وہ روایات لکھ دیتے تھے جو انہیں سند کے ساتھ پہنچتی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لئے اُن کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین پہلے اہل کتاب کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انہیں قرآن کریم میں پچھلی اُمتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انہوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآن

---

[۱] الاتقان:۲/۱۸۴۔

کے واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انہوں نے اپنے پرانے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات اسرائیلیات کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہیں، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ روایات جن کی سچائی قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔ تو ایسی روایتیں صحیح ہیں، ان کو بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۲) وہ روایات جن کا جھوٹ ہونا قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً اسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے، اس کی تردید قرآن کریم سے ثابت ہے، ارشاد ہے کہ "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا" (اور سلیمان علیہ السلام کافر نہیں ہوئے، بلکہ شیاطین نے کفر کیا) اسی طرح مثلاً اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار اوریا کی بیوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مروا کر اس کی بیوی سے نکاح کر لیا، یہ بھی کھلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

(۳) وہ روایات جن کے بارے میں قرآن و سنت اور دوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ تورات کے احکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، نہ اُن کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب، البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ایسی روایات کو نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے قول فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انہیں نقل کرنا جائز تو ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اعتبار سے وہ حجت نہیں ہے۔[۱]

تفسیر بالرائے کا حکم:

علمِ تفسیر سے متعلق ایک اہم مسئلہ تفسیر بالرائے کا ہے، اس کی حقیقت اور اس کے حکم سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

---

[۱]: تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی چیز صراحتاً یا کوئی حکم کتاب اللہ میں اور سنتِ رسول اللہ اور آثار صحابہ میں نہ ملے تو کیا وہ شخص جو علمِ لسان میں تبحر کے درجہ کو پہونچا ہوا ہے اور علوم دینیہ میں مکمل مہارت رکھتا ہے اور اس کا علمی کمال اس معیار کو پہونچ گیا ہے کہ اعجاز قرآن کا خود اپنے ذوق سے ادراک کرلیتا ہے بغیر کسی کی تقلید کئے ہوئے تو اب یہ شخص خود اپنی رائے سے معنی بیان کرسکتا ہے یا نہیں تو اس کے اندر دو قول ہیں:

تفسیر بالرائے کے بارے میں کچھ علماء کا نظریہ اور ان کے دلائل:

ایک قول یہ ہے کہ اتنے علمی تبحر اور کمال کے بعد بھی اپنی رائے سے معنی بیان نہیں کرسکتا، اور اپنے مستدلات میں ایک حدیث یہ پیش کرتے ہیں:

''مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهٖ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ'' [۱]

''یعنی جس شخص نے اپنے طور پر قرآن میں کوئی گفتگو کی اور فی الواقع وہ صحیح بھی ہے تب بھی اس نے غلطی کی''

اور دوسری حدیث ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ'' [۲]

''یعنی جس شخص نے بغیر جانے ہوئے قرآن کی تشریح میں کلام کیا تو نار جہنم میں اسے اپنا ٹھکانا تلاش کرنا چاہئے''۔

ان دونوں احادیث کے پیشِ نظر بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس سے تفسیر بالرائے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

تفسیر بالرائے کے بارے میں جواز کا نظریہ اور اس کے دلائل:

علماء کی دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ جو شخص علم لسان میں تبحر کے درجہ کو پہنچا ہوا ہو، علوم دینیہ میں مکمل مہارت رکھتا ہو اور اعجاز قرآن کا درک رکھتا ہو تو یہ شخص کسی کی تقلید کئے بغیر تفسیر کرسکتا ہے، دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰٓى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ'' [۳]

''یعنی اگر اس خبر کو وہ لوگ اپنے رسول اور اپنے بااختیار لوگوں کی طرف لیکر جاتے تو یقیناً اس بات کو وہ لوگ جان لیتے جو قوتِ اجتہاد رکھتے ہیں''

---

[۱]: سنن ترمذی: کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ: باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیہ۔ [۲]: سنن ترمذی: کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ: باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیہ۔ [۳]: النساء: ۸۳۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ استنباط اور اپنی رائے سے کوئی بات کہنا کامل العلم کے واسطے درست ہے اور اسی طرح دوسری جگہ پر فرمایا:

"كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ"[1]

"یعنی ہم نے اس کتاب کو جو بابرکت ہے اس لئے اتارا ہے تاکہ اہل عقل اس کے اندر غور کرکے نصیحت حاصل کریں"۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غور کرنے کی دعوت دی ہے اب جب غور کرے گا تولا محالہ اپنی رائے سے معنی متعین کرے گا۔

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے آپ نے فرمایا:

''اَلْقُرْآنُ ذَلُوْلٌ ذُوْ وُجُوْہٍ فَاحْمِلُوْہُ عَلٰی اَحْسَنِ وُجُوْھِہٖ''[2]

"یعنی قرآن پاک کے اندر آیات متعدد صورتوں کا احتمال رکھتی ہیں تم ان میں سے جو سب سے زیادہ احسن صورت ہو آیت کو اس پر محمول کرلو تو دیکھو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے احسن صورت پر محمول کرنے کا حکم دیا ہے اور احسن صورت کا ادراک کرنا اور یہ معلوم کرنا کہ کون سی صورت احسن ہے اپنی رائے ہی سے ہو سکتا ہے لہذا فاحملوہ علی الاحسن کی اجازت دینا گویا رائے کی اجازت دینا ہے۔

مانعینِ تفسیر بالرائے کے مستدلات کا جواب

رہی وہ دو حدیثیں جن سے عدم جواز کے بارے میں استدلال کیا گیا ہے تو ان میں سے پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ ''فَقَدْ أَخْطَأَ'' کے معنی ہیں "فَقَدْ أَخْطَأَ الطَّرِيْقَ" یعنی اس نے تفسیر کے طریقہ اور اس کی ترتیب کے خلاف کیا، کیونکہ ترتیب تو یہ ہونی چاہئے کہ اگر الفاظ کی تفسیر کرنا ہو تو اہل لغت کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور ناسخ و منسوخ معلوم کرنا ہو تو اخبار کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اور اگر معنی مرادی معلوم کرنا ہو تو شارع کی طرف رجوع کرنا چاہئے لیکن اس نے غلطی کی اور بغیر اس ترتیب کا لحاظ کئے ہوئے اپنی رائے سے بات کہدی، لیکن جو شخص ترتیب کا لحاظ کرنے کے بعد اگر کوئی چیز نہ ملے اور اپنی رائے سے بیان کردے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور ہم نے یہی صورت مان رکھی ہے لہذا اس حدیث سے ہمارے خلاف استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1]: ص:۲۹۔ [2]: سنن دارِ قطنی: النوادر، رقم:۴۳۲۱۔

دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ من قال فی القرآن سے مراد قرآن کی مشکل آیتیں ہیں تو یعنی جس شخص نے مشکل قرآن کے بارے میں بغیر علم کے کوئی بات کہدی تو اس کے لئے وعید ہے پس اس سے مطلقا تفسیر بالرائے کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا وہ درست ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن پاک کی متشابہ آیتیں ہیں کہ جو آدمی قرآن پاک کی متشابہ آیات کی تفسیر بغیر علم کے کرے گا تو اس کے لئے یہ وعید ہے۔

تفسیرِ قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی:

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن کریم کی تفسیر انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لئے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو وصرف اور بلاغت وادب کے علاوہ علم حدیث، اصولِ فقہ و تفسیر اور عقائد وکلام کا وسیع و عمیق علم رکھتا ہو کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتا۔

افسوس کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لئے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شد بد رکھنے والے لوگ جنہیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ بڑے بڑے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کرکے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت مہلک اور گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، دنیوی علوم وفنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرلے تو دنیا کا کوئی صاحب عقل اُسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل نہ کی ہو، اس لئے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم وتربیت حاصل کرنا

ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی داں انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کرکے انجینئر بنناچاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینئر تسلیم نہیں کرسکتا، اس لئے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آسکتا، بلکہ اس کے لئے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لئے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن و حدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہوسکتا ہے؟ زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم و فن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کے مخصوص شرائط ہوتے ہیں، جنہیں پورا کئے بغیر اس علم و فن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن و سنت اتنے لاوارث کیسے ہوسکتے ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لئے کسی علم و فن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کردے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کردیا ہے۔

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہو تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائیداری، جنت و دوزخ کے حالات، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کرسکتا ہے، مذکورہ بالا آیات میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کردیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ للذکر (نصیحت کے واسطے) اس پر دلالت کررہا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کماحقہ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل مستنبط کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو عبد الرحمن سلمی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم

نے سرکارِ دوعالم ﷺ سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت ﷺ سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کرلیں، وہ فرماتے تھے کہ:

''تَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيْعًا''۱؎

ہم نے قرآن اور علم و عمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے۔

چنانچہ موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے صرف سورۂ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، اور مسندِ احمد رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔۲؎

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعر وادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انہیں قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں لگ جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت ﷺ کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا بھی ضروری تھا، اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عربی زبان کی مہارت اور نزول وحی کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود ''عالم قرآن'' بننے کے لئے باقاعدہ حضور ﷺ سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزولِ قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شدبد پیدا کرکے یا صرف ترجمہ دیکھ کر مفسر قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت ہوگی سرکارِ دوعالم ﷺ کا یہ ارشاد اچھی طرح یادرکھنا چاہیے:

''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ فِي النَّارِ''۳؎

جو شخص قرآن کے معاملہ میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

اور: ''مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ''

جو شخص قرآن کے معاملے میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہدے تب بھی اس نے غلطی کی۔۴؎

۱؎: الاتقان: ۲/۱۷۶۔ ۲؎: الاتقان: ۲/۱۷۶۔ ۳؎: سنن ابو داؤد، از اتقان: ۲/۱۷۹۔ ۴؎: سنن ابو داؤد از اتقان: ۲/۱۷۹۔

یہ چند ضروری باتیں تھیں جو علمِ تفسیر سے تعلق رکھتی ہیں جن کا جاننا ہر تفسیر پڑھنے والے کے لئے ضروری ہے، اس کے بعد کلامِ الٰہی کی عظمت اور اہمیت سے متعلق چند باتیں آپ کے سامنے ذکر کی جارہی ہیں تاکہ اس کی عظمت اور محبت اور اہمیت دل میں سما جائے، کیونکہ آدمی کلامِ الٰہی جتنی عظمت، دھیان اور توجہ کے ساتھ سنے گا اس کو اتنا ہی نفع ہوگا۔ اور جتنا عظمت اور احترام میں کمی ہوگی اتنا ہی اُس کو نفع بھی کم ہوگا۔

کلام پاک سے استفادہ کی دو صورتیں:

کلام اور صاحبِ کلام کی عظمت دل میں ہو۔ جس ذات کو اور جس بات کو آدمی جس نظر سے دیکھے گا اور جس اہمیت سے سنے گا اُسی نوعیت کا اثر اُس پر پڑے گا۔ قرآن کریم میں یہ مضمون اس انداز میں بیان کیا گیا ہے:

﴿إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ﴾[1]

”قرآن کریم میں نصیحت ہے اُس آدمی کے لیے (یعنی اس سے فائدہ اس شخص کو ہوگا) جس کے پاس دل ہو۔“

کلام پاک سے استفادہ کی پہلی صورت یہ ہے کہ حقیقتِ دل یعنی قلبی بصیرت اُس کو حاصل ہو۔ یوں تو دل سب کے پاس ہے، آدمی تو آدمی جانور کے پاس بھی دل ہے، وہ دل مراد نہیں ہے جو سینے میں ہوتا ہے، دل کے اندر ایک دل ہوتا ہے جس کو بصیرت سے تعبیر کرتے ہیں، جو دراصل معرفت ہوتی ہے اور جس کو حقیقت بھی کہتے ہیں، تو جس آدمی کے پاس یہ حقیقی دل ہوتا ہے اُس کو قرآن پاک سے فائدہ ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں دل سے مراد عقل ہے اب اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک سے فائدہ اسی کو ہوتا ہے جس کے پاس عقل ہو، سمجھنے کی صلاحیت

---

[1]: ق:۳۷۔

ہو۔ یہ دل والے بہت کم ہوتے ہیں، جن کو اہلِ دل کہا جاتا ہے وہ تو حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے سچے نائبین کی ذواتِ مقدسہ ہیں کہ اُن کے پاس حق تعالیٰ کی معرفت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کو جانتا ہے، اُس کے اندر اللہ تعالیٰ کے کلام کے سمجھنے اور جاننے کی صلاحیت ہوتی ہے، اور یہی مطلب ہے ﴿لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ﴾ کا کہ ایسے لوگ اس قرآن پاک سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے ہیں جن کے پاس حقیقی دل ہے اور جن کو بصیرت حاصل ہے۔

استفادہ کی دوسری صورت:

دوسری صورت قرآن پاک کو سمجھنے کی اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی یہ ہے:

﴿أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾[۱]

یا پھر وہ دل سے متوجہ ہو کر بات کی طرف کان لگا دیتا ہو۔ اگر آدمی پورے حضورِ قلب اور حاضر دماغی کے ساتھ اور عظمت کے استحضار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بات کو سنے گا تب بھی اسے غیر معمولی نفع ہو گا۔ علماء نے فرمایا کہ کلامِ الٰہی کو چاہے کوئی بھی آدمی سن لے، اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر یہ تاثیر رکھی ہے کہ اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ پہلی قسم (حقیقت دل اور قلبی بصیرت) کاملین امت کی ہے اور دوسری ان کے متبعین اور مریدین کی ہے جو ان کے اعتقاد سے دین کی باتیں مان لیتے ہیں، یہ بھی فرمایا کہ ایسا دل صوفیہ کے ہاں فنا کے بعد ہوتا ہے۔[۲]

قرآن پاک کے عجائب غیر متناہی ہیں:

غرض یہ کہ اس کلام کو عظمت کے ساتھ پڑھنا چاہیے اور توجہ سے سننا چاہیے کیونکہ قرآن مجید، اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بڑی ہے۔ بڑائی

۱: ق:۳۷۔ ۲: تفسیر مظہری:۱۱/۵۵۔

کمال اور قدرت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ جس کے پاس جتنے کمالات ہوتے ہیں وہ اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کے کمالات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اللہ پاک کی قدرت مطلق ہے۔ مطلق کا مطلب یہ ہے کہ کوئی قید اُس میں لگی ہوئی نہیں ہے یعنی جب چاہیں، جیسا چاہیں، جس کے ساتھ چاہیں جو چاہیں کریں، تو جب اتنی عظیم اور کبریائی والی ہستی کا یہ کلام ہے تو اس کے کمالات کی کیا حد ہو گی۔ اس لیے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

''لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ''[۱]

''یہ کلام ایسا ہے کہ اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔''

ہم ذرا اس پر غور کریں کہ یہ الفاظ وہ ذات کہہ رہی ہے جس کو علم الاوّلین و الآخرین ملا۔ جس کے علم کی کوئی حد نہیں۔ مخلوق میں جتنا علم سرکارِ دو عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو دیا گیا اتنا کسی اور کو نہیں، وہ یہ فرما رہے ہیں کہ اس کے عجائبات، کمالات اور خوبیوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ لوگ قیامت تک اس میں ڈوب کر اس کے معنی اور نکات نکالتے رہیں گے، لیکن اس کی تہہ تک نہیں پہونچ پائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات لامتناہی ہے اور اُن کی صفات بھی لامتناہی ہیں، اور یہ کلام بھی اُنہی کی صفت ہے، لہٰذا اس کے رموز اور اسرار بھی غیر متناہی ہوں گے۔

قرآن مجید ام المعجزات ہے:

اسی لیے اس کلام کے ذریعہ چیلنج کیا گیا ہے، یہ معجزہ ہے بلکہ معجزات کی اصل ہے،[۲] یہ کلام عاجز کر دینے والا ہے، پوری مخلوق اس طرح کا کلام کرنے سے عاجز ہے۔ قیامت تک بھی سارے کے سارے لوگ مل کر اس چیلنج کا جواب دینا چاہیں تو نہیں

[۱]: مستدرکِ حاکم: کتاب فضائل قرآن ۔ [۲]: تفسیر بیضاوی: تحت قولہ و قالو لا لا یاتینا الخ، ۷۹/۴

دے سکتے۔ نہ صرف انسان بلکہ جنات بھی شامل ہو جائیں تب بھی نہیں دے سکتے۔ یہ پورا قرآن شریف نہیں بلکہ صرف اس کا ایک تھوڑا سا حصہ یا چھوٹی سورت مثلاً سورۂ کوثر یا سورۂ عصر کے برابر بھی پوری مخلوق اس کا جواب تیار نہیں کر سکتی، اسی لئے ارشاد فرمایا:

"قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ"[1] اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ (اگر ہم نے اس کو گھڑ لیا ہے جیسا کہ تم کہہ رہے ہو) تو تم بھی اس کے مثل ایک سورت (گھڑ کر) لے آؤ۔

نبی کا معجزہ امت کے پاس

یہ ایسا عجیب و غریب معجزہ ہے کہ معجزہ ہو کر بھی اُمت کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ معجزہ نبی کی اپنی نبوت کی دلیل ہوتی ہے، کیونکہ جب وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور اللہ کے پاس سے میرے پاس پیغام آتا ہے اور میرے پاس آسمان سے احکام اترتے ہیں تو وہ بطورِ ثبوت اس کو پیش کرتے ہیں، وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر مجھے یہ چیز ملی ہے، لہٰذا اس کو دیکھ کر تم لوگ مجھ پر یقین کرو اور ایمان لاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو جو معجزات دیے ہیں اُس میں سے ایک معجزہ قرآن پاک بھی ہے۔ یہ دستورِ حیات بھی ہے، معجزہ بھی ہے، دلیل بھی ہے اور رہبر بھی ہے۔ آپ ﷺ اس دنیا سے پردہ فرما گئے لیکن آپ ﷺ کا کام چونکہ اس اُمت کو کرنا تھا اسے پھیلانا تھا اسی لیے یہ معجزہ اُمت کے ہاتھوں میں بھی دے دیا گیا۔ یہ قیامت تک کے لیے ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں جو اس کی اعجازی صفات تھیں اب وہ باقی نہیں ہیں، یہ اس وقت بھی معجزہ تھا اور آج بھی ہے، جب بھی اس کے ذریعہ چیلنج تھا اور آج بھی ہے۔ اور قیامت تک یہ چیلنج باقی رہے گا۔

---

[1] یونس:۳۸

موسیٰ علیہ السلام کا عصا یہودیوں کے پاس نہیں ہے، عیسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ تھا کہ وہ مٹی کا پرندہ بناتے اور اُس کو پھونک مارتے تو وہ اُڑنے لگتا، لیکن یہ معجزہ ان کی امت کے ہاتھ میں نہیں رہا، لیکن قرآن پاک ایسا معجزہ ہے جو اُمت کے بچے، عورتیں، بڑے اور بوڑھے سب کے پاس ہے سب اس کو پڑھتے ہیں، سیکھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو قرآن پاک کے ایک ایک لفظ پر وجد آجاتا تھا۔ جب سورۃ الکوثر کو بیت اللہ کے اندر لٹکا دیا گیا تو اس وقت پہلے سے سات قصیدے (سبع معلقات) وہاں لٹکے ہوئے تھے، اور وہ پورے عرب میں مشہور قصیدے تھے جن کا کوئی جواب نہیں تھا، جب اہل عرب نے اس سورۃ الکوثر کو دیکھا تو اپنے اپنے قصیدے اُتار لیے اور چلے گئے۔ ایک عجمی آدمی جو کہ غیرِ عرب ہے وہ یہ کہے گا کہ اس میں خاص بات کیا ہے جو اُن کے کلام میں نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اس کی یہ بات کلام کی بلاغت، فصاحت اور اعجاز سے عدم واقفیت کی بناء پر ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل کلامِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی وجہ سے کفّار لوگوں کو روکتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ کلام مت سنو کیونکہ جو یہ کلام سنتا ہے وہ مسحور ہو جاتا ہے، جادو سے متاثر ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کلام میں جادو ہے۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾[1]

"کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو مت سنو اور جب یہ قرآن پڑھیں تو اُس وقت شور مچاؤ تا کہ تم غالب آؤ"

---

[1] فصلت:۲٦۔

اور اگر تم نے شور نہیں مچایا اور ان کو قرآن پڑھنے دیا اور لوگوں نے اس کو سن لیا تو وہ اس سے متاثر ہو جائیں گے۔ اس کلام کا سننے والوں پر یہ اثر ہے تو پڑھنے والوں پر کیا اثر ہو گا، اللہ پاک کے نزدیک وہ کتنے مقبول ہوں گے؟

قرآن میں مشغول آدمی اللہ کے ہاں سائلین سے زیادہ مستحق:

حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

''مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ وَذِكْرِي عَنْ مَسْأَلَتِي أَعْطَيْتُهُ أَفْضَلَ مَا أُعْطِي السَّائِلِينَ'' [۱]

''جس کو قرآن اور میرے ذکر نے مجھ سے سوال کرنے اور مانگنے سے غافل کر دیا تو میں اسے اُس سے بھی زیادہ دوں گا جو مانگنے والوں کو میں دیتا ہوں''۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے پاس یہ کلام کتنا محبوب ہے۔ خود ہی انہوں نے اپنا کلام نازل فرمایا، خود ہی بندوں کے بارے میں یہ چاہتے ہیں کہ بندے اس سے انتہائی شغف رکھیں، حتی کہ اگر وہ قرآن پاک کو پڑھنے میں اتنے مشغول ہو جائیں کہ دعا بھی نہ کر سکیں تو جتنے دعا کرنے والے ہیں ان سب سے زیادہ اللہ پاک انہیں عطا فرمارہے ہیں۔

جیسے گھر پر کسی تقریب کے موقع پر آپ نے گھر کے کسی آدمی کے ذمہ کام زیادہ لگادیا، وہ کبھی اِدھر بھاگ رہا ہے، کبھی اُدھر بھاگ رہا ہے، کبھی مہمان کو چھوڑ رہا ہے تو کبھی اس کا استقبال کر رہا ہے غرض انہی مصروفیتوں میں اسے کھانے کا موقع تو نہیں ملا، تو گھر کے افراد اس کے لئے کچھ زیادہ ہی کھانا اٹھا کر رکھ دیتے ہیں کہ فلاں کام میں مشغول ہے، اس لئے اُس کا خیال کرنا چاہیے۔ حق تعالیٰ شانہ، بھی بندوں کے لئے اپنے کلام میں مشغولیت کی وجہ سے کہ وہ اس کو پڑھ رہے ہیں، اس کو سمجھ رہے ہیں، اس میں

[۱] سنن ترمذی: باب ما جاء کیف کانت قراءة النبی ﷺ

غور و فکر کر رہے ہیں، ان کے نہ مانگنے پر بھی دوسرے دعا کرنے والوں سے زیادہ انہیں عطا فرما دیتے ہیں۔

قیامت کے روز کلامِ الٰہی کی شفاعت:

حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ قرآن پاک ایسا شفیع ہے کہ کل قیامت کے دن اس سے بہتر اللہ کے ہاں کوئی شفیع نہیں۔ اگر مسلمان اس کو پڑھیں اور اس کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں تو کل قیامت کے دن یہ آدمی کے حق میں وکیل بن کر کھڑا ہو جائے گا اور یوں کہے گا کہ اے اللہ! میں نے اس کو دنیا میں راتوں میں سونے نہیں دیا، میں نے اس کو بہت سے خواہشات سے روک دیا، وہ رات میں نماز کی حالت میں میری تلاوت کرتا تھا، اس کو اس کے عمل کی اجرت ملنی چاہیے، لہٰذا آپ اس کو بخش دیجئے، اللہ پاک اس سے کہیں گے کہ اپنے ہاتھ پھیلا، بندہ اپنے ہاتھ پھیلائے گا تو اللہ پاک اس میں خوشنودی بھر دیں گے، اور سنن دارمی میں یہ زیادتی بھی مروی ہے کہ: اللہ پاک اس سے کہیں گے کہ بائیں ہاتھ کو (بھی) پھیلا، بندہ اپنے بائیں ہاتھ کو پھیلائے گا، تو اللہ پاک اس میں بھی اپنی رضامندی بھر دیں گے پھر کبھی اس کے بعد ناراضگی نہیں ہوگی، اس کے بعد فرمائیں گے ''اِقْرَأْ وَارْقَهْ''[1] پڑھتا جا اور چڑھتا جا، جہاں تیری تلاوت ختم ہوگی وہی تیری منزل ہوگی۔ اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ ایسا شافع ہے جو مشفع ہے یعنی اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نکتہ:

حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عجیب بات بیان فرمائی کہ اللہ پاک قرآن پاک کی سفارش ضرور قبول فرمائیں گے، کیونکہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ: من قال یشفع القرآن یوم القیامۃ و سننِ دارمی: باب فضل القرآن۔

اور کلام یہ اللہ کی صفت ہے اور صفت ذات سے جدا نہیں ہو سکتی جیسے عالم ہونا، جاہل ہونا، کالا ہونا اور گورا ہونا یہ صفات آدمی سے ہٹ کر نہیں پائے جاسکتے، اسی طرح کلام بھی اللہ کی صفت ہے وہ اللہ کی ذات سے ہٹ کر نہیں پایا جائیگا، کل قیامت میں جب قرآن اللہ تعالیٰ کے سامنے سفارش کریگا تو گویا اللہ تبارک و تعالیٰ خود اپنے آپ سے سفارش کریں گے اور جب خود اللہ پاک سفارش کریں گے تو کون ہے جو اللہ کی سفارش کو روکے؟ سفارش کی اجازت خود اللہ پاک دیتے ہیں، اس لئے قرآن پاک کی سفارش ضرور قبول کی جائیگی۔

نبی کی تلاوت پر اللہ پاک سب سے زیادہ توجہ فرماتے ہیں:

ایک حدیث مبارک میں یہ مضمون ہے کہ اللہ پاک کی سب سے زیادہ توجہ اس نبی پر ہوتی ہے جو تلاوت کر رہا ہوتا ہے۔

”مَا أَذِنَ اللهُ لِشَيْءٍ مَا أَذِنَ لِنَبِيٍّ حَسَنِ الصَّوْتِ بِالْقُرْآنِ يَجْهَرُ بِهِ“[۱]

اللہ پاک کسی چیز کو اتنا توجہ سے نہیں سنتے ہیں جتنا اس نبی کو سنتے ہیں جو قرآن پاک کو اچھی آواز سے تلاوت کر رہا ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے تمام اعمال کی اللہ تعالیٰ ہی توفیق دیتے ہیں مگر وہ بندے سے صادر ہوتے ہیں اور کلامِ الٰہی خود اللہ تعالیٰ کے پاس سے آیا ہوا ہے، اور یہ اس کی صفت ہے، اس لئے جو چیز اللہ کے پاس سے آئی ہو اور جو اللہ کی صفت ہو وہ اللہ تعالیٰ کی توجہ اور رحمت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، اُس کے ذریعے بندہ اللہ سے جتنا قریب ہو گا کسی اور چیز سے اتنا قریب نہیں ہو سکتا، اس لئے اللہ پاک اس کو اتنی توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔

---

[۱] صحیح بخاری: کتاب التوحید باب قول اللہ النبی الماہر بالقران مع الکرام البررۃ۔

اللہ پاک کے کلام کو سننے کا مطلب:

یہاں اللہ پاک کے سننے سے مراد اللہ پاک کا بندے کو قریب کرنا، اس کو عمدہ بدلہ دینا، اس کی تلاوت کو قبول کرنا اوراس سے راضی ہونا ہے۔ جیسا کہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

وَاسْتِمَاعُ اللهِ مَجَازٌ عَنْ تَقْرِيْبِهِ الْقَارِئَ وَإِجْزَالِ ثَوَابِهِ أَوْ قَبُوْلُ قِرَاءَتِهِ۔[1]

رہی یہ بات کہ اس میں نبی کی کیوں تخصیص کی گئی ہے؟ تو علماء نے اس بارے میں لکھا ہے کہ چونکہ نبی سب سے زیادہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے اور اللہ پاک سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور ساری کائنات میں وہ سب سے افضل ہوتا ہے اس لئے اللہ پاک ان کی طرف جتنی توجہ فرماتے ہیں اتنی کسی اور کی طرف نہیں فرماتے اور ان سے جتنا راضی ہوتے ہیں اتنا کسی اور سے راضی نہیں ہوتے اور ان کو جتنا قریب کرتے ہیں اتنا کسی اور کو قریب نہیں کرتے ۔

بہر حال مقصود قرآن پاک کی اہمیت کو بتانا ہے۔ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کرتا ہے حق تعالیٰ شانہ کی خاص توجہ اُس پر ہوتی ہے۔ جب تک بندہ خود دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتا اللہ تبارک و تعالیٰ بندے کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اسی لیے جتنی عظمت اور استحضار کے ساتھ اس کی طرف ہم متوجہ ہوں گے اللہ تعالیٰ شانہ اس کو ہمارے دل ودماغ پر اتنا ہی کھولیں گے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اصل چیز دل کا قرآن پاک کے مضامین کو قبول کرنا اور دل میں اُن مضامین کا آنا شروع ہو جانا ہے۔

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف
تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب

---

[1]: عمدۃ القاری: باب قول اللہ تعالی ولا تنفع الشفاعۃ عندہ۔ وشرح ابی داؤد للعینی: باب کیف یستحب الترسل فی القرآن، رقم: ۱۴۴۳۔

یعنی آپ امام رازی اور صاحب کشاف وغیرہ کے حوالے دیں، ان کی تفاسیر کا مطالعہ کریں جن کے ذریعے معلومات تو حاصل ہو جاتی ہیں مگر حق تعالیٰ کی طرف جو قلبی لگاؤ ہے اور معرفت ہے وہ ان حضرات کی اہم اور بڑی بڑی کتابوں سے بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

دل کی صفائی اور مضامینِ قرآن کی آمد

آپ کو یہ بات جان کر حیرت ہو گی کہ اگر ہم اپنے دل کی صفائی کریں، غیر کی محبت کو اپنے دل سے خالی کریں، اور حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کریں تو کلامِ الٰہی کے مضامین دل کے اندر سے نکلیں گے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ دل کی مثال کنویں جیسی ہے۔ آپ کنواں کھودیں گے، اس کے اندر سے پانی نکلے گا اور وہ پانی خراب بھی نہیں ہو گا۔ ایسے ہی اگر آپ دل صاف کریں گے تو کلام پاک کے اسرار اور موز اللہ تعالیٰ کھولیں گے اگر آپ نے دل کو صاف کر کے اُس میں سے مضامین نکالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اِدھر اُدھر سے پانی جمع کیا ہے تو اس کی مثال حوض کی سی ہے اس پانی کی وجہ سے چند ہی دن میں حوض بھی خراب ہو گا اور پانی بھی خراب ہو گا ایسے ہی اگر ہم نے اپنے دل کی صفائی نہیں کی ہے تو یہی حال ہمارے دل کا ہو گا کہ معرفت قلبی حاصل ہونے کے بجائے دل میں اور پراگندگی بڑھ جائے گی۔ ہم سب یہ نیت کریں کہ اللہ پاک اس کو ذریعہ بنا کر ہم کو اپنی معرفت سے سرفراز فرمادے اور اپنی محبت ہمیں عطا فرمادے، ہمارے دلوں سے دنیا کی گندگیوں اور مخلوق کی محبت کو نکال دے۔ یہ بہت ہی ناگوار بات ہے کہ جس دل کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں اپنے لیے رکھا ہے ہم اس میں اللہ کی محبت کے علاوہ دوسری چیزوں کی محبت بٹھائیں۔

دل ایک ہی کیوں؟:

میرے شیخ محترم رحمۃ اللہ علیہ (حضرت مسیح الامت یا حضرت شاہ صوفی غلام محمد صاحب نور اللہ مرقدہما) فرمایا کرتے تھے کہ سب اعضاء اللہ تعالیٰ نے دو دو دیے ہیں، مگر دل ایک دیا، کیونکہ وہ صرف ایک اللہ کے لیے ہے۔ حق تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ بندے کے دل میں سوائے میرے یقین کے، میری عظمت کے، میری محبت کے، میری چاہت کے، میری معرفت کے اور کوئی چیز نہ ہو۔ اسی وجہ سے دنیا آدمی کے ہاتھ میں رہنی چاہیۓ دل میں نہیں، کیونکہ دل میں تو صرف اللہ ہوں گے۔ اسی واسطے بزرگوں نے فرمایا:

"دل بیار دست بہ کار"

آدمی کے ہاتھ تو کام میں لگے ہوں مگر دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو۔

حضرت شاہ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ:

حضرت شاہ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دل کی مثال کشتی کی سی ہے اور دنیا کی مثال پانی کی سی ہے۔ اگر اس کے اندر پانی آجائے تو کشتی بھی ڈوبے گی اور آدمی بھی ڈوبے گا۔ ایسے ہی اگر ہمارے دل میں دنیا آجائے تو دنیا کے ساتھ ساتھ ہم بھی ڈوب جائیں گے، اگر دل کے اندر یہ دنیا نہ اُترے تو آدمی اللہ تعالیٰ کے قرب کے لیے دنیا کو استعمال کرے گا۔

لیکن اس قرب کو حاصل کرنے کے لئے کچھ رکاوٹیں ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام میں اُن رکاوٹوں کو دور کرنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے تا کہ میرا بندہ مجھ تک براہِ راست پہنچ جائے، اور اللہ تعالی تک پہونچنے کا طریقہ یہ ہے کہ معرفت کو صحیح کیا جائے

اور علم و ذہن کو صحیح کیا جائے کیونکہ یہ قرب، قربِ علمی ہوتا ہے، قربِ عرفانی ہوتا ہے، قربِ مسافت نہیں ہوتا ہے، جیسے یہاں سے کینیڈا ہے، ٹورنٹو ہے، لندن ہے، اتنی مسافت کے طے کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ قریب ہو جاتے ہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے قریب ہونا یہ ہے کہ روح کے اندر کی گندگی اور آلائشوں کو دور کیا جائے اور اس کو پاک اور صاف کیا جائے۔

روح کے حجابات:

روح کے پراگندہ ہونے کے کچھ مراحل اور کچھ صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ روح اللہ تعالیٰ کا انکار کردے۔ انکارِ الٰہ پر روح اللہ تعالیٰ سے حجاب میں آجاتی ہے۔ مخلوق کی ایک بڑی تعداد کا یہ نظریہ تھا اور ہے۔ روس کا جتنا نظام چلا وہ دہریت کی بنیاد پر چلا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر زمانے میں ایسے لوگ بہت ہی کم رہے ہیں۔ مشرکوں کی تعداد تو بہت تھی اور آج بھی ہے لیکن ملحدوں کی تعداد کم رہی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تو اقرار ہو مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کو معطل قرار دے دیا جائے کہ انہوں نے دنیا کو بنایا لیکن اب وہ دنیا سے غیر متعلق ہوگئے، ہم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں اور کائنات خود بخود چل رہی ہے اس صورت میں بھی آدمی اللہ کے قریب نہیں پہنچ سکتا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو معطل تو نہ مانے، اور اللہ تعالی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہی مدبر الامر ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ دیگر مخلوقات کو بھی شریک کردے۔ کہ اللہ تعالی نے کسی کو پانی پر لگادیا، کسی کو روزی پر لگادیا، کسی کو اولاد دینے پر لگادیا، کسی کو لوگوں کی مصیبتیں دور کرنے پر لگادیا، اللہ تعالیٰ خود بھی کر رہے ہیں اور یہ لوگ بھی کر رہے ہیں، یہ بھی شرک ہے۔ یہ بھی ایسی چیز ہے

جس سے آدمی اللہ تعالیٰ سے قریب نہیں ہو سکتا۔ یہ تین خاص مراحل ایسے ہیں اگر آدمی ان عقائد کے ساتھ اس دنیا سے گیا تو ہمیشہ کے لیے حق تعالیٰ سے حجاب میں ہو گا اور ایسے آدمی کے بارے میں فیصلہ خداوندی یہ ہے کہ کبھی بھی اسے معاف نہیں کیا جائے گا۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ ا

"اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے اس بات کو کہ اُن کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، اس کے علاوہ جو اور گناہ ہیں اُن میں سے جس کو چاہیں گے معاف کریں گے اور جس کو چاہیں گے نہیں۔"

لیکن شرک کے لیے ان کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کو معاف نہیں کیا جائے گا۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو مدبر الامر یعنی کام کرنے والا بھی مانا جائے اور اُن کے ساتھ کسی کو شریک بھی نہ کیا جائے لیکن آخرت کا انکار کیا جائے۔

﴿إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ﴾ ۲

"کچھ نہیں یہی جینا ہے ہمارا دنیا کا، مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو پھر اٹھنا نہیں ہے"۔

جو آدمی آخرت کو نہیں مانتا گویا وہ اللہ تعالیٰ کو "غیر عادل" مانتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ کیونکہ وہ اللہ کیسے ہو گا جو حق کو حق ظاہر نہ کرے اور باطل کو باطل ظاہر نہ کرے، ظالم سے ظلم کا بدلہ نہ چکائے، مظلوم کی فریاد نہ سنے، نیک آدمی کو اُس کی جزا نہ دے، بُرے آدمی کو اُس کی سزا نہ دے، پھر تو وہ اللہ معطل ہو جائے گا۔ جو روح انکارِ آخرت پر مبنی ہوتی ہے وہ روح بھی اللہ تعالیٰ سے دور ہوتی ہے۔ کچھ لوگ آخرت کو تو مانتے ہیں مگر آخرت کو ماننے کے ساتھ آخرت کی جزاوسزا کو نہیں مانتے، اور یہ سمجھتے ہیں

ا: النساء: ۴۸۔ ۲: المومنون: ۳۷۔

کہ دوبارہ جب ہم اُٹھائے جائیں گے تو جس طرح اس دنیا میں مزے میں تھے وہاں پر بھی مزے میں ہوں گے۔ اس کا عمل پر مدار نہیں رکھتے کہ اگر آدمی کا عمل اچھا ہو گا تو اچھا بدلہ ملے گا اور آدمی کا عمل بُرا ہو گا تو بُرا بدلہ ملے گا، ظاہر ہے ایسا آدمی بھی اللہ کے قریب نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ کی جو سنت اور محکم نظام ہے وہ اس کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ ایک اور قسم یہ ہوتی ہے کہ اللہ کو واحد مانا جائے، آخرت کو بھی مانا جائے، آخرت کی جزا و سزا کو بھی مانا جائے، مگر ساتھ ساتھ اتقان علی الشفاعۃ کا عقیدہ بھی رکھا جائے کوئی ہمارا کام بنادے گا، کوئی ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے گا اور ہمارے مصیبت کے وقت میں کام آکر ہماری مصیبت کو ٹلا دے گا، ایسا سمجھ کر بھی آدمی غفلت میں رہتا ہے اور ایسی روح بھی اللہ تعالیٰ سے قریب نہیں ہو سکتی۔ یہ سب کی سب رکاوٹیں، حجابات اور موانع ، عقل و فہم اور اعتقادات سے متعلق ہیں ایک صورت دوری کی یہ ہے کہ عمل کے لحاظ سے دور رہا جائے یعنی ان تمام چیزوں کا یقین اور ان کو ماننے کے باوجود آدمی بد عمل ہے۔ جو ذمے داریاں اُس پر ہیں عبادات کی، معاملات کی، معاشرت کی، اخلاق کی اُن میں وہ کمی اور کوتاہی کرتا ہے، ایسا آدمی بھی آخرت میں اللہ تعالیٰ سے دور ہو گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنا قرب عمل کی بنیاد پر رکھا ہے۔

اگر یہ سب رکاوٹیں ختم ہو جائیں یعنی آدمی اللہ تعالیٰ کو مانے، اللہ تعالیٰ کو واحد مانے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، اللہ کو مدبر مانے، آخرت کو مانے اور آخرت کی جزا و سزا کو مانے اور آخرت میں اللہ کے علاوہ کسی کے اوپر اعتماد و اتقان نہ ہو کہ کوئی میرا کام کروا دے گا، اور یہ یقین ہو کہ اگر کوئی میرا کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرے گا، اور میرے اعمال کے مطابق میرے ساتھ برتاؤ ہو گا اور ساتھ ساتھ بد عملی بھی نہ کرے تو انشاء اللہ حق تعالیٰ شانہ کا اُس کو قرب مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی معرفت اسے عطا فرما دیں گے اور اُسے اپنے قریب کرلیں گے۔

یہ چند باتیں تو کلامِ الٰہی کی عظمت اور اہمیت اور فوائد سے متعلق تھیں۔

اس کے بعد سورۂ فاتحہ کا آغاز کرتے ہیں:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، إِيَّاكَ نَعْبُدُ وإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، اِهْدِنَــا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْنَ.

پوری سورۃ کا ترجمہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیا ہے:

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کو لائق ہیں جو مربّی ہیں ہر ہر عالَم کے، جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں، جو مالک ہیں روزِ جزا کے، ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست استعانت کی کرتے ہیں، بتلا دیجیے ہم کو راستہ سیدھا، راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ اُن لوگوں کا جو راستے سے گم ہو گئے۔''

ہمارے اسلاف کی احتیاط میں سے ایک احتیاط یہ بھی ہے کہ وہ لوگ اپنی طرف سے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے سے بہت زیادہ گریز کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے ترجمے پر اعتماد ظاہر کیا گیا اور سب لوگوں نے اس کو تسلیم کیا وہی ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ ترجمہ بہت نازک چیز ہے۔ ترجمہ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کہہ رہے ہیں، ترجمہ سے ترجمانی ہوتی ہے۔ ترجمے میں نزاکت بڑھ جاتی ہے اور تھوڑے سے لفظوں کی اونچ نیچ سے مطلب بدل جاتا ہے۔

تعوذ کے بارے میں چند باتیں آپ کے سامنے ذکر کی جا رہی ہیں، کیونکہ جب آپ قرآن کریم کی تلاوت کریں گے تو سب سے پہلے تعوذ ہی پڑھنے کا حکم ہے، اَعُوْذُ

بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (اللہ کی پناہ مانگتا ہوں میں شیطان مردود سے) قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ﴾[1]

سو جب تو پڑھنے لگے قرآن مجید تو پناہ لے لے اللہ کی شیطان مردود سے۔

تعوذ سے متعلق چند نکات:

پہلی بات تو یہ ہے کہ تعوذ کے لئے کئی عبارتیں مستعمل ہوتی ہیں، "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ"، اور بعض روایات میں "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ"، اور بعض میں "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ"۔ احناف رحمۃ اللہ علیہ اور شوافع رحمۃ اللہ علیہ پہلی صورت کے قائل ہیں، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دوسری صورت بہتر ہے، اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تیسری صورت بہتر ہے۔[2]

پہلا نکتہ:

(۱) لفظِ اعوذ میں مخلوق سے خالق کی طرف اور ممکن سے واجب کی طرف رجوع کرنا ہے، اور اللہ پاک کی معرفت حاصل کرنے کے لئے اول یہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ بندہ مخلوق کی احتیاج دیکھ کر ذاتِ واجب الوجود کو پکڑ لے، جو غنی اور قادرِ مطلق ہے، اس میں گویا بندہ یہ اقرار کرتا ہے کہ میں فقیر اور محتاج ہوں، کیونکہ پناہ وہی شخص چاہتا ہے، جو اپنے آپ کو محتاج اور فقیر سمجھتا ہو۔

---

[1]: النحل:۹۸۔ [2]: تفسیر عزیزی:۱۲و۱۳۔

لفظِ باللہ میں دو باتوں کا اقرار ہے (۱) اللہ پاک کی قدرت کا کہ اللہ پاک ہر خیر اور ہر شر کے دفاع پر قادر ہیں۔ (۲) اللہ پاک ہر حاجت کو پورا کرنے والے ہیں، مصیبت کو دور کرنے والے ہیں، پس جب بندہ اس کا خیال اور تصور کرتا ہے تو "فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ" کا مضمون اس کے ذہن میں جاگزیں ہوتا ہے اور اللہ پاک اس کے ذہن میں مستحضر ہو جاتے ہیں، اور یہ حالت اور کیفیت لفظ اعوذ کہنے پر پیدا ہوتی ہے جو کہ مطلوب ہے۔

دوسرا نکتہ:

اعوذ باللہ کہنے میں اپنے نفس کی عاجزی کا اقرار ہوتا ہے، اور عجزِ نفس کے اقرار سے اللہ پاک کی قدرت کا اقرار ہوتا ہے، اور اللہ پاک کے قرب کا بہترین وسیلہ اور ذریعہ سوائے عاجزی اور انکساری کے کچھ نہیں ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے: "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ" [۱]

یعنی جس نے اپنے نفس کے عجز و قصور کو پہچان لیا تو اس نے اپنے رب کی قدرت کو پہچان لیا، اور جس نے اپنے نفس کی جہالت کو پہچان لیا تو اس نے اپنے رب کے علم فضل اور عدل کو جان لیا، اور جس نے اپنے نفس کی فناء کو پہچان لیا تو اس نے اپنے رب کے کمال اور بقا کو پہچان لیا۔

---

[۱] تفسیرِ رازی: ۱/ ۸۲۔ (امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ کلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے البتہ اس کے معنی صحیح ہیں وَقَالَ النَّوَوِيُّ إِنَّهٗ لَيْسَ بِثَابِتٍ يَعْنِيْ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَإِلَّا فَمَعْنَاهُ ثَابِتٌ فَقَدْ قِيْلَ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْجَهْلِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْعِلْمِ وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْبَقَاءِ وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْعَجْزِ وَالضَّعْفِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْقُدْرَةِ وَالْقُوَّةِ۔ (الاسرار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعۃ: ۱/ ۳۵۲۔) اور یہ کلام یحیی بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ (المقاصد الحسنۃ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنۃ: ۱/ ۶۵۷)

تیسرا نکتہ:

شیطان انسان کا دشمن ہے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾[1]

''یقین جانو کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لئے اس کو دشمن سمجھتے رہو''۔ اور اللہ تعالیٰ بندوں کے مولیٰ اور ان کے خالق ہیں، اور ان کے کاموں کو درست کرنے والے ہیں، پس جس وقت انسان عبادت شروع کرتا ہے تو اس کے دل پر دشمن کا خوف غالب رہتا ہے، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ دشمن کی آفتوں اور پریشانیوں سے محفوظ ہو جائے، پس وہ اعوذ باللہ الخ کہہ کر دشمن سے بھاگ کر اللہ پاک کے دربار میں حاضر ہو جاتا ہے، اور بسم اللہ الخ کہہ کر اللہ پاک کے دربار میں قرار پکڑ لیتا ہے۔

چوتھا نکتہ:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾[2]

نہ چھوئیں اس کو مگر پاک لوگ۔

اور آدمی کا دل ہر وقت غیر اللہ میں بسا ہوا ہوتا ہے، اور اس کی زبان بھی غیر اللہ ہی میں مشغول ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ آلودہ اور پراگندہ ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کی صفائی اور پاکی کی ضرورت ہوتی ہے، پس جس وقت آدمی اعوذ باللہ کہتا ہے تو اس کو پاکی حاصل ہو جاتی ہے۔

پانچواں نکتہ:

مومن کا دل سب جگہوں سے اشرف ہوتا ہے، کیونکہ اس میں اللہ پاک کی معرفت ہوتی ہے، اور ایسی معرفت ہی کی وجہ سے اللہ کے یہاں اس کا مقام ہوتا ہے اس

---

[1]: فاطر:٦۔ [2]: الواقعہ:٧٩۔

کا اکرام ہوتا ہے اور معرفت کا مقام قلب ہے، جہاں بندہ اللہ پاک کو بٹھاتا ہے اور اسکو جماتا ہے گویا اللہ پاک بندہ سے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے بندے تیرا دل میرا باغ ہے اور میری جنت تیرا باغ ہے، پس اگر تو بخل کرے گا اور مجھے اپنے دل میں نہیں بٹھائے گا اور میری معرفت حاصل نہیں کرے گا تو میں بھی بخل کروں گا کہ میں تجھے اپنی جنت میں جگہ نہ دوں گا۔[۱] تو گویا اللہ پاک یوں کہتے ہیں کہ اے میرے بندے میں نے اپنی جنت تیرے لئے بنائی اور تو نے اس میں آنے کا ارادہ کیا تو میں نے تیرے دشمن کو وہاں سے بھگادیا اور اس کو مردود کہا، اور جب کہ میں تیرے دل میں آچکا ہوں اور اتر چکا ہوں تو پھر بھی تو نے میرے دشمن کو وہاں سے نہیں نکالا تو بندہ اپنی بے کسی و عاجزی ظاہر کرتا ہے کہ یا اللہ میری قدرت میں نہیں ہے کہ میں اس کو بھگاؤں وہ تو آپ کی قدرت میں ہے تو اللہ پاک اس سے کہتے ہیں کہ تو اعوذ باللہ کہہ، پس وہ اعوذ باللہ کہہ کر دل کی صفائی کرتا ہے اور اللہ کے دشمن کو بھگادیتا ہے۔[۲]

چھٹا نکتہ:

تعوذ میں شیطان پر الف لام داخل کیا گیا ہے تاکہ جنس شیطان سے پناہ مانگی جائے، اس واسطے کہ شیطان بہت ہیں بعض دیکھنے میں آتے ہیں اور بعض آنکھوں سے غائب ہوتے ہیں لہٰذا الف لام کے داخل کرنے سے سب شیاطین اس میں داخل ہو جاتے ہیں اس لئے تعوذ سے آدمی ہر قسم کے شیاطین سے محفوظ ہو جاتا ہے۔[۳]

تعوذ کے چند فضائل اور انعامات:

اس کے کئی فضائل اور فوائد نصوص میں موجود ہیں اور اس کا ورد صرف امت محمدیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ نبی اور اس امت کے نہیں بلکہ سابقہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کا

۱: تفسیر رازی: ۱/۸۳۔ ۲: حوالہ سابق ۔ ۳: تفسیرِ رازی۔

بھی ورد رہا اوراس کی وجہ سے انعامات اور احسانات کا سلسلہ جاری رہاہے، چنانچہ نوح علیہ السلام نے جس وقت اپنے (کافر) بیٹے کے لئے اللہ پاک سے دعا کی اور اللہ پاک نے انہیں متنبہ فرمایاتو انہوں نے کہاتھا:

﴿رَبِّ إِنِّیٓ أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِی بِهِ عِلْمٌ﴾ [۱]

اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں آپ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

اللہ پاک نے ان کی اس دعا پر دو انعام انہیں عطا فرمائے۔ایک سلام اور دوسری برکات، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ﴾ [۲]

اے نوح (کشتی سے) اترجاؤ ہماری طرف سے وہ سلامتی اور برکتیں لے کر جو آپ پر ہیں۔

اسی طرح عزیز مصر کی بیوی زلیخاء نے یوسف علیہ السلام کو نفسانی خواہش پوری کرنے کی دعوت دی تھی تو انہوں نے کہا تھا:

﴿مَعَاذَ اللهِ إِنَّهُ رَبِّیٓ أَحْسَنَ مَثْوَایَ﴾ [۳]

اللہ کی پناہ وہ میرا آقا ہے، اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے۔

اس استعاذہ پر بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں دو چیزیں عطاء فرمائی تھیں، جس کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَالْفَحْشَاءَ﴾ [۴]

اور ہم نے ایسا اس لئے کیا تاکہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کا رخ پھیر دیں۔

---

[۱] ہود:۴۷۔ [۲] ہود:۴۸۔ [۳] یوسف:۲۳۔ [۴] یوسف:۲۴۔

اسی طرح جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک کے حکم سے جب اپنی قوم کو قاتل کے ڈھونڈنے کے لئے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو ان لوگوں نے کہا تھا کہ کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہیں، تو موسی علیہ السلام نے اس وقت تعوذ پڑھا تھا، جواب میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عطا فرمائیں، ایک تو ان سے تہمت کو دور کیا اور دوسرے مقتول کو زندہ کیا، جس کا ذکر اس آیتِ مبارکہ میں ہے:

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾[1]

چنانچہ ہم نے کہا کہ اس (مقتول) کو اس (گائے) کے ایک حصہ سے مارو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔

اسی طرح حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے جس وقت جبرئیل امین علیہ السلام کو خلوت میں دیکھا تھا تو اللہ کی پناہ مانگی تھی:

﴿إِنِّىٓ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا﴾[2]

میں تم سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ اگر تم میں خدا کا خوف ہے۔

جواب میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عطا فرمائی تھیں، ایک تو قوم نے جو تہمت لگائی تھی اس کو دور کیا اور دوسرے بغیر باپ کے بیٹا عطا کیا۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں اس کی اور بھی مثالیں ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ پاک نے اس کا حکم دیا ہے، جیسا کہ سورۂ فلق وناس میں ہے۔

غرض یہ کہ استعاذہ عام ہے حتیٰ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی اس کا حکم دیا گیا، اور اس کے فضائل کا اندازہ استعاذہ میں انعامات و احسانات کے ذکر فرمانے سے ہوتا ہے، اس

---

[1]: البقرۃ:۷۳۔ [2]: مریم:۱۸۔

وجہ سے بطور خاص اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔احادیثِ مبارکہ میں بھی اس کے کافی فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ایک حدیث میں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

”جو آدمی صبح کی نماز کے بعد دس مرتبہ تعوذ پڑھتا ہے تو اللہ پاک اس پر دو فرشتے بھیجتے ہیں جو اس کے گھر حفاظت کرتے ہیں ایسے ہی جو مغرب کے بعد اس کو پڑھتا ہے فجر تک دو فرشتے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں“۔[۱]

ایک اور حدیث میں ہے:

”كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُعَوِّذُ الْحَسَنَ وَ الْحُسَيْنَ يَقُوْلُ : أُعِيْذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَ هَامَّةٍ وَ مِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّامَةٍ ثُمَّ يَقُوْلُ هٰكَذَا كَانَ إِبْرَاهِيْمُ ابْنَيْهِ إِسْمَاعِيْلَ وَ إِسْحَاقَ“[۲]

”نبی ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ کے لئے تعوذ فرماتے تھے۔اور کہتے تھے کہ میں تم دونوں کے لئے پناہ مانگتا ہوں اللہ کے مکمل کلمات سے ہر شیطان اور موذی جانور سے اور ہر بد نظری سے، پھر آپ کہتے تھے کہ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے دونوں بیٹے اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے لئے تعوذ فرماتے تھے“۔بہر حال تعوذ انبیاء کرام علیہ السلام کا بھی طریقہ رہا ہے اس لئے اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

❁❁❁

---

[۱]: جامع الاحادیث: مسند علی ابن ابی طالب: ۱۰۲/۳۲۔ [۲]: مستدرکِ حاکم: باب مناقب الحسن و الحسین۔

بسم اللہ کے فضائل:

بسم اللہ داروغۂ جہنم سے حفاظت کا ذریعہ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بھی بہت سے فضائل احادیث میں مروی ہیں۔ اس کے فضائل سے متعلق ایک حدیث حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا کہ: بسم اللہ میں انیس حروف ہیں اور داروغۂ جہنم بھی انیس ہیں۔ جو آدمی سنت کے موافق ہر ہر کام پر بسم اللہ کا اہتمام کرے گا تو حق تعالیٰ شانہ، بسم اللہ کے ہر حرف کو جہنم کے فرشتوں میں سے ہر فرشتے کے مقابلہ میں ڈھال بنا دیں گے۔[1]

بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے والے کو اس کی طرف سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اس میں انیس حرف ہیں اور ہر حرف گویا ایک زبانیہ کے مقابلے میں ہے، اس طرح جو اس کی کثرت کرے گا تو وہ جہنم میں نہیں جائے گا یعنی جہنم کے جو ذمہ دار ہیں وہ اس کو جہنم میں داخل نہیں کر پائیں گے۔ کتنی عجیب و غریب فضیلت ہے کہ کام کچھ بھی نہیں۔ اور فائدہ ہی فائدہ ہے جیسا کہ ہمارے ہاں مثل مشہور ہے کہ ”ہینگ لگے نہ پھٹکری اور اتنا بڑا کام بھی ہو جائے“۔ اس لیے اس بات کا بڑا اہتمام کرنا چاہیے کہ آدمی ہر کام کے شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو پڑھا کرے۔

بسم اللہ کے نزول کی کیفیت:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: اس آیتِ کریمہ کے نزول کے وقت پوری کائنات میں ایک خاص قسم کا اثر پیدا ہو گیا تھا۔ اچانک بادل مشرق کی سمت چلنے لگے اور ہواؤں میں سناٹا چھا گیا، دریاؤں کے اندر جوش آ گیا، شیاطین کو آسمان سے رجم کر کے بھگا دیا گیا اور پوری جاندار مخلوق کو ایسا محسوس ہوا کہ حق تعالیٰ

---

[1]: تفسیر قرطبی: ۱/ ۹۲۔

کی طرف سے کوئی خاص بات کہی جارہی ہے جسے متوجہ ہوکر سننا ہے۔ پھر اُس کے بعد حق تعالیٰ شانہ، نے فرمایا کہ میری عزت کی قسم! ''أَلَا يُسَمّٰى اسْمُهٗ عَلٰى شَيْءٍ إِلَّا بَارَكَ فِيْهِ''[۱] ''سن لو جس چیز پر ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھی جائے گی اُس میں اللہ تعالیٰ برکت نازل فرمائیں گے۔ اور اللہ نے جس شان وشوکت اور عظمت کے ساتھ اور جس بڑائی کے ساتھ اس کو نازل کیا ظاہر ہے کہ وہ اس کی عظمت اور اہمیت بتانے کے لئے تھا۔

بسم اللہ کے ذریعہ حضور ﷺ کی شفایابی:

ایک مرتبہ حضور ﷺ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور پوچھا: ''یَامُحَمَّد! اِشْتَکَیْتَ''۔ ''آپ بیمار ہوگئے؟''

فرمایا: ''طبیعت تھوڑی ناساز ہوگئی۔''

جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ میں آپ کو رقیہ پڑھتا ہوں اور یہ کلمات پڑھے:

''بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْئٍ يُؤْذِيْكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ، بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ''[۲]

بسم اللہ پڑھ کر جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دم کیا تو حضور پاک ﷺ کو افاقہ ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ خود باضابطہ دوا ہے۔ اتنی بڑی دولت ہم کو دی گئی لیکن ہم اس کو بھول گئے۔ سارے کام ہم کرتے ہیں لیکن بسم اللہ پڑھنا ہمیں یاد نہیں ہوتا۔ چونکہ ''بسم اللہ'' کہنے میں بہت آسان ہے، اس کو کہنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، اور نہ اس کے پڑھنے میں کوئی وقت لگتا ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک معمولی چیز ہے، حالانکہ یہ ایسی چیز ہے کہ اگر آدمی صحیح اعتقاد سے پڑھے گا تو ہر کام میں

---

[۱]: تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۹۔ [۲]: صحیح مسلم: السلام/ باب الطب والمرض والرقی۔

برکت پیدا ہو گی اور ہر ضرر رساں چیز سے آدمی محفوظ ہو جائے گا، تاریخ میں کئی واقعات ایسے موجود ہیں جو اس کے اثرات اور فوائد بتلاتے ہیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر زہر کا اثر نہ کرنا:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ایک قصہ مشہور ہے جو جنگِ حیرہ میں پیش آیا تھا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا، جس کے ہاتھ میں زہر تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ کیا ہے اس نے کہا کہ زہر ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ زہر مجھے دے دو یہ کہہ کر آپ نے وہ زہر اس کے ہاتھ سے لیا، لوگوں نے روکنا چاہا لیکن آپ نے جلدی کی بسم اللہ کہا اور اس کو نگل لیا، آپ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، جس آدمی کے پاس زہر تھا اس نے کہا کہ خدا کی قسم اے عرب کے لوگو جب تک تم لوگ اس زمانہ میں رہو گے تو تم ہی مالک اور غالب رہو گے۔[1]

یہ قصہ مختلف الفاظ اور حذف واضافہ کے ساتھ بہت سی کتابوں میں مروی ہے۔

بسم اللہ کی تاثیر کب ہو گی؟:

اب آپ کہیں گے کہ ہم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کئی دفعہ پڑھی لیکن ایسی برکت کہیں دیکھنے میں نہیں آئی اور ایسا اثر کہیں دیکھنے میں نظر نہیں آتا تو بات دراصل یہ ہے کہ اللہ کے کلام کے ساتھ دل میں یقین بھی ہونا چاہئے، آدمی صاحبِ تقویٰ ہو، اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو، اُس کی نیت صحیح ہو، خدا کے کلام کی برکت پر یقین ہو تو اُس پر اس کا ظہور ہو گا۔ یقین دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، جب یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تو

---

[1] معجم کبیر: باب الخاء، رقم: ۳۸۰۸ و مجمع الزوائد: ۹ / ۳۵۰۔ بعض معاصرین نے اس کا انکار کیا ہے لیکن حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ، علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ، ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ، اور علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے بڑے علماء نے اس کو نقل کیا ہے، لیکن کسی نے اس کی تردیدی نہیں کی۔ (أبو بكر الصديق رضي الله عنه شخصيته وعصره: ۵/ ۲۳)

اُس کے منہ سے نکلنے والی ہر چیز میں اثر آجاتا ہے۔ ہم میں اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں یہی فرق ہے۔ بزرگانِ دین میں اور ہم میں یہی فرق ہے، اللہ کے کلام اور بات کا جو یقین دل میں آنا چاہیے تھا وہ نہیں آیا۔ آج پوری دنیا میں اسی کی محنت اصالۃً کرنی چاہیے کہ ہمارے ایمانیات اور دینیات کا تعلق دل میں مستحکم ہو جائے۔ یقین کی کمزوری اِس وقت کی سب سے بنیادی بیماری ہے۔ پوری اُمت مسلمہ میں یہ مشترک بیماری ہے۔ اگر یہ بیماری ہم میں سے نکل جائے تو آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں غیبی مدد آئے گی اور اس یقین کی طاقت سے اُن کا کام بن جائے گا۔

اگر اس کے متعلق خالص علمی مضامین آپ کے سامنے پیش کروں تو وہ ایک مدرسہ کا درس ہو جائے گا اور آپ لوگوں کے سر کے اوپر سے گزر جائے گا اور آپ لوگ کہیں گے کہ پتہ نہیں مولوی صاحب کیا کچھ کہہ رہے تھے؟

چونکہ واقعات سے بات جلدی ذہن میں بیٹھ جاتی ہے اور آسانی سے سمجھ میں آتی ہے اس لئے کچھ اس کی فضیلت اور برکت سے متعلق واقعات آپ کے سامنے ذکر کئے جارہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ:

ایک مرتبہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کھانا کھا رہے تھے، اُن کے ساتھ ایک شخص بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک اُس شخص کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر کافی دور چلا گیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے اللہ والے اور صاحبِ کشف تھے۔ دوسرے دن حضرت ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے، وہاں ایک جِن سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگا کہ آپ نے کل کا تماشہ دیکھا تھا۔ فرمایا کہ ہاں! دیکھا تو تھا۔ جِن کہنے لگا کہ ہم نے اُس کا کھانا چھیننے کی کوشش کی تھی مگر اُس نے بسم اللہ پڑھ لی تھی اس لیے وہ کھانا ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر نکل گیا۔

بسم اللہ نہ پڑھنے سے شیطان کی شرکت:

اسی طرح ایک دیہاتی صحابی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بسم اللہ کے بغیر کھانا شروع کر دیا، وہ کھاتے رہے، حتیٰ کہ اخیر لقمہ کو بھی کھانے کے لئے اٹھایا اور کھانا چاہا، لیکن اس وقت بسم اللہ یاد آگئی تو ہاتھ روک کر بسم اللہ پڑھی اور کھانا کھایا، آپ ﷺ ان کو دیکھ کر تبسم فرمائے، صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ آپ نے تبسم فرمایا لیکن ہمیں یہاں کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بسم اللہ کے بغیر ان صاحب نے کھانا شروع کیا تو شیطان بھی اس میں شریک ہو گیا حتیٰ کہ اخیر لقمہ تک اس نے ساتھ کھایا، لیکن جب انہوں نے بسم اللہ پڑھی تو جتنا کھانا اس نے کھایا تھا بسم اللہ کہنے سے سارے کھانے کی قئے کر دی۔[1]

اب آپ اندازہ لگائیے کہ بسم اللہ میں کتنی برکت ہے؟ اس کے اندر کتنی روحانیت اور معنویت ہے؟

آج کے سبق میں میری یہ درخواست ہے کہ ہر آدمی بسم اللہ کی عادت بنالے، یہ اللہ کے نام کی برکت حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے، یہ دعا بھی ہے، یہ دوا بھی ہے بلکہ یہ سب کچھ ہے۔ اس لئے حضور پاک ﷺ نے اُمت کے بڑے کو، چھوٹے کو، عالم کو، جاہل کو، مرد کو، عورت کو، بڑے سے بڑے عارفِ کامل کو، چھوٹے سے چھوٹے مبتدی کو یہی تعلیم دی ہے کہ ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنی ہے۔

بسم اللہ کے چھوڑ دینے کا نقصان:

ایک طرف تو بسم اللہ کے یہ فضائل ہیں اور دوسری طرف بسم اللہ نہ پڑھنے پر کاموں کے ناتمام اور ناقص ہونے سے متعلق روایتیں بھی مروی ہیں، ایک روایت میں

---

[1] سنن ابی داؤد: کتاب الاطعمہ: باب التسمیۃ علی الطعام۔

آیا ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کام کی ابتداء بسم اللہ سے نہ کرے تو وہ نا تمام اور ناقص ہوتا ہے:

''كُلُّ أَمْرٍ ذِىْ بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فهو أَقْطَعُ''[1]

ہر ذی اہتمام امر جس کو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے تو ناتمام ہوتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے:

كُلُّ كَلَامٍ لَا يُبدَأُ فِيْ أَوَّلِهِ بِذِكْرِ اللهِ فَهُوَ أَبْتَرُ۔[2]

ہر وہ کلام جس کی ابتداء اللہ کے ذکر سے نہ کی جائے تو وہ ناقص اور ادھورا ہوتا ہے۔

اس مضمون کی اور بھی رویتیں مروی ہیں، جن کے الفاظ مختلف ہیں، لیکن سب کا حاصل یہی ہے کہ کسی بھی کام کی ابتداء اللہ کے نام سے ہونی چاہئے۔

بسم اللہ آیت بھی اور دعا بھی:

''بسم اللہ'' یہ ایسی چیز ہے جو قرآن پاک کی آیت بھی ہے اور دعا بھی ہے۔ قرآن پاک کی آیت ہونے کی حیثیت سے جنبی حالتِ جنابت میں غسل سے پہلے اس کو نہیں پڑھ سکتا۔ اور ناپاک عورت ناپاکی میں غسل سے پہلے نہیں پڑھ سکتی۔ لیکن دعا ہونے کے اعتبار سے اس کو پڑھا جاسکتا ہے۔ قرآن پاک کی آیتوں میں دو خصوصیات ہیں، بعض آیتیں دعا کے طور پر بھی پڑھی جاتی ہیں اور تلاوت کی حیثیت سے بھی پڑھی جاتی ہیں۔ اس جگہ نیت کا اعتبار ہوتا ہے: ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ''، اعمال کا اعتبار نیتوں پر ہے۔ اگر قرآن پاک کی تلاوت کی نیت سے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھیں گے تو غیر طاہر کو یعنی ناپاک کو بسم اللہ کہنے کی اجازت نہیں ملے گی، کیونکہ بڑی ناپاکی میں قرآن پاک نہ چھوا جاسکتا ہے اور نہ پڑھا جاسکتا ہے۔ چھوٹی ناپاکی میں قرآن پاک صرف چھوا نہیں جاسکتا البتہ پڑھا جاسکتا ہے۔

---

[1]: جامع الاحادیث: ۱۵۵۸۴۔ [2]: السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۰۳۳۱۔

جنبی اور غیرِ جنبی کے لئے قرآن پاک پڑھنے اور نہ پڑھنے کی حکمت:

اس میں بھی ایک راز ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک آدمی پر وضو فرض ہو گیا تو اُس شخص کے جسم کا باہر کا حصہ تو ناپاک ہو گیا، (ظاہر اًناپاک ہونا مراد نہیں ہے) لیکن اُس کے منہ کے اندر کا حصہ اور ناک کے اندر کا حصہ ناپاک نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے وضو کرتے وقت منہ میں اور ناک میں پانی ڈالنا اس کے لئے فرض بھی نہیں ہے، چونکہ اندر کا حصہ ناپاک نہیں ہوا اس لئے وضو فرض ہونے کی صورت میں وہ قرآن پاک پڑھ سکتا ہے، البتہ اس کے لئے چھونا جائز نہیں ہے کیونکہ اس کے باہر کے اعضاء سب ناپاک ہیں۔ اگر آدمی پر غسل فرض ہو جائے تو اُس کے جسم کے باہری حصہ کے ساتھ منہ اور ناک کے اندر کا نرم حصہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے اسی وجہ سے ایسے آدمی کے لئے غسل میں کلّی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے، چونکہ غسل واجب ہونے کی صورت میں اندرون اور بیرون دونوں ناپاک ہوتے ہیں، اس لئے ایسے آدمی کے لئے نہ پڑھنا جائز ہے اور نہ چھونا۔ ایسے ہی عورت ناپاکی کی حالت میں یا اپنے مخصوص ایام میں ہو تو وہ بحیثیتِ تلاوت قرآن پاک نہ پڑھ سکتی ہے اور نہ چھو سکتی ہے کیونکہ وہ بھی بڑی ناپاکی کی حالت میں ہے۔

اب کھانا کھاتے ہوئے بڑی ناپاکی والی عورت بسم اللہ کہے گی یا نہیں کہے گی؟ سالن پکاتے ہوئے بسم اللہ کہے گی یا نہیں کہے گی؟ جھاڑو دیتے ہوئے اور کپڑے دھوتے ہوئے بسم اللہ کہے گی یا نہیں کہے گی؟ بچے کو دودھ پلاتے ہوئے بسم اللہ کہے گی یا نہیں کہے گی؟ تو مسئلہ یہ ہے کہ ناپاکی کی حالت میں بطورِ دعا اس کا پڑھنا جائز ہے، اور اس پڑھنے کا ایک خاص اثر بچے پر ہو گا۔ جیسے دودھ بچہ میں منتقل ہو گا ایسے ہی بسم اللہ کا نور بھی منتقل ہو گا۔

بسم اللہ کہہ کر دودھ پلانے کا اثر:

ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ جب اُس کا بیٹا جنگ میں شریک ہوا تو خبر یہ آئی کہ وہ شکست کھا گیا اور اُلٹے پاؤں میدانِ جنگ سے بھاگ آیا ہے۔ بادشاہ کی بیوی نے بادشاہ سے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، لوگوں نے کہا کہ مخبر خبر لے کر آیا ہے اور آپ یہ کہہ رہی ہیں؟ بادشاہ کی بیوی نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا یا تو وہ شہید ہو جائے گا یا غالب ہو جائے گا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ اطلاع آئی کہ بادشاہ کا بیٹا پینترا بدلنے کے لیے پیچھے ہٹا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اُس کو فتح دی اور وہ غالب ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ تم نے پہلے اتنے وثوق سے کیسے کہا تھا کہ میرا بیٹا شکست نہیں کھا سکتا؟ اُس نے کہا کہ میں نے جب تک اپنے اس بچے کو دودھ پلایا ہمیشہ باوضو رہی ہوں اور بسم اللہ کہہ کر دودھ پلایا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ جب اللہ کے نام سے میں نے اس کو دودھ پلایا تو خدا کے حکم سے یہ کبھی بغاوت نہیں کر سکتا۔ پہلے کی مائیں بھی ایسی تھیں اور ان کی گود بھی ایسی تھی، اللہ کے نام کے ساتھ دودھ بھی آتا تھا، اللہ کے نام کی برکتیں بھی اس دودھ کے ساتھ بچوں میں منتقل ہوتی تھیں۔

بسم اللہ کے نزول کا سبب:

مشرکین کی یہ عادت تھی کہ جن بتوں کو پوجتے تھے اُن بتوں کا نام لے کر کام شروع کیا کرتے تھے، حق تعالیٰ نے اس کی تردید کرتے ہوئے بسم اللہ کہنے کا حکم دیا۔[1]

"اللات" اللہ کا مؤنث ہے اور "عزّیٰ" عزیز کا مؤنث ہے چونکہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں اور خدائی میں شریک سمجھتے تھے اس طرح انہوں نے خدا کے نام مؤنث بنا رکھے تھے۔ اور انہی ناموں سے اپنے کاموں کی ابتداء کرتے تھے، اس لئے حق تعالیٰ

---

[1]: تفسیرِ حقی: ۱/۱۔

شانہ نے اسے جڑ سے اکھاڑ دیا اور یہ بتلا دیا کہ تم اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کے نام کی برکت سے کام شروع کیا کرو۔ اس کے علاوہ کسی اور کی مدد کی ضرورت ہی نہیں۔

کیا تسمیہ اس امت کی خصوصیت ہے؟:

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر کتاب کا آغاز اللہ کے نام ہی کے ساتھ کیا ہے، لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ خاص کلام اس امت ہی کی خصوصیت ہے، پہلے آپ ﷺ "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" لکھتے تھے، پھر سورۂ ہود کی آیت "بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا"[۱] نازل ہوئی تو آپ نے بسم اللہ لکھنے کا حکم دیا پھر اس کے بعد سورۂ اسراء کی آیت "قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ" نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے بسم اللہ الرحمن لکھنا شروع کیا، پھر اس کے بعد سورۂ نمل کی آیت "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"[۲] نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اس پورے جملہ کو لکھنے کا حکم دیا۔[۳]

یہ بسم اللہ کی فضیلت اور اثرات سے متعلق چند باتیں تھیں، اب ہم بسم اللہ کے جو الفاظ ہیں ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں، بسم اللہ میں سب سے پہلے "ب" کا لفظ ہے۔

بسم اللہ میں "ب" کے معنیٰ:

"ب" عربی میں عموماً تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ "ب" برکت کے معنی کے لیے آتا ہے اور "ب" مدد واستعانت کے معنی کے لیے بھی آتا ہے اور "ب" مصاحبت یعنی ساتھ ہونے کو بتانے کے لیے بھی آتا ہے۔ ان تینوں معنوں کا اس جگہ مراد لینا صحیح ہے، اس وجہ سے مفسرین اس کا ترجمہ کرتے ہیں، "اللہ کے نام کی برکت سے یہ کام کرتا ہوں یعنی اِس کام میں اللہ کی برکت شامل کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ کے نام کی مدد سے یہ کام کرنا چاہتا ہوں یعنی جب تک اللہ کی مدد نہ ہو اُس وقت تک کام صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور اللہ پاک کی معیت میں میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔

۱: ہود: ۴۱۔ ۲: النمل: ۳۰۔ ۳: مصنف ابن ابی شیبۃ: کتاب الاوائل، باب اول من فعل ومن فعلہ۔

بسم اللہ میں فعل ذکر نہ کرنے کی حکمت:

بسم اللہ کا لفظی ترجمہ ہوتا ہے ”اللہ کے نام کی برکت سے“۔ لیکن اللہ کے نام کی برکت سے کیا کرنا ہے اس کا تذکرہ نہیں ہے، اس کو کرنے والے پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ اگر تم کھا رہے ہو تو کہو کہ اللہ کے نام کی برکت سے ”کھاتا ہوں، اگر پی رہے ہو تو کہو کہ اللہ کے نام کی برکت سے پیتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اگر اللہ پاک بسم اللہ کے ساتھ ایک کام کی تخصیص کر دیتے مثلاً یوں حکم ہوتا کہ کہو فلاں کام اللہ کے نام کی برکت سے کرتا ہوں تو وہ مناسب نہیں تھا کیونکہ برکت اسی کام میں منحصر ہو جاتی اور اسی خاص کام کے وقت ہی بسم اللہ کہا جاتا، دوسرے کاموں کے لئے نہیں، اور اگر بسم اللہ کے ساتھ سارے کام بیان کرتے تو وہ بسم اللہ، بسم اللہ نہیں رہتی بلکہ سارے کاموں سے بھر جاتی۔ اللہ کے کلام کا اعجاز اور بلاغت دیکھئے کہ بسم اللہ کہنے کا حکم دیا گیا لیکن کب کہنا ہے اس کو بندوں پر چھوڑ دیا گیا کہ جب بھی اچھا کام کرو تو اس سے پہلے تمہیں یہ کہنا ہے۔

بہر حال اللہ کے نام کی برکت بھی ضروری ہے، اللہ کے نام کی مدد بھی ضروری اور اللہ کے نام کا ساتھ لینا بھی ضروری ہے۔

اسمِ اللہ کہنے کی حکمت:

بسم اللہ الرحمن الرحیم میں بسم اللہ کہا گیا ہے، ”باللہ“ نہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ کیونکہ استعانت اور برکت اللہ ہی سے حاصل کی جانی چاہئے، درمیان میں اسم کا اضافہ کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ پاک کی ذات نہایت ہی عظیم الشان ہے اس کی بڑائی کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، اس لئے بغیر وسیلہ کے براہِ راست اللہ پاک سے استعانت اور تبرک حاصل کرنے میں جرأت معلوم ہوتی ہے، اور جب اللہ کے نام کو وسیلہ بنا لیا گیا تو اب کوئی جرأت کی بات نہیں ہے، اس لئے لفظ اللہ سے پہلے ”اسم“ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ "ب" کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ "ب" قسم کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور دوسرے برکت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے اس معنیٰ کو بتانے کے لئے لفظِ اسم کو بڑھادیا، کیونکہ جو "ب" قسم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ اللہ پاک ہی کے اسماء پر داخل ہوتا ہے، اور یہاں اسم اللہ پر "ب" داخل نہیں ہے بلکہ "لفظِ اسم" پر "ب" داخل ہے معلوم ہوا کہ "ب" یہاں برکت کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے قسم کے معنیٰ میں نہیں۔ [1]

ایک اور حکمت یہ بھی ہے کہ چونکہ حق تعالیٰ شانہ کو یہ علم ہے کہ مجھے ہر بندہ نہیں پا سکتا اور اُس کا ذہن اور اُس کی معرفت براہِ راست مجھ تک نہیں پہونچ سکتی، اس لئے اپنا نام لینے کا حکم دے دیا کہ بندہ میرے نام کے ذریعہ مجھ تک پہونچے، کیونکہ اللہ پاک کے نام اور اس کے ذکر سے بندہ اللہ تک پہونچ سکتا ہے، اسی وجہ سے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [2]

"اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، لہٰذا تم اسے انہی ناموں سے پکارو۔

اسمِ اللہ کی تعریف:

"بسم اللہ" میں لفظ "اللہ" موجود ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذاتی ناموں میں سے ہے۔

صاحبِ روح المعانی نے اللہ پاک کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وَاجِبُ الْوُجُوْدِ مُتَّصِفٌ بِصِفَاتِ الْكَمَالِ مُنَزَّهٌ عَنْ كُلِّ مَا لَا يَلِيْقُ بِشَأْنٍ مِنْ شُؤنِهِ الْجَلِيْلَةِ" [3]

"اللہ ایسی ذاتِ واجب الوجود کا نام ہے جو تمام صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے اور ہر ایسے نقص اور ایسی چیز سے پاک ہے جو اس کی جلیل القدر شان کے مناسب نہیں ہے"۔

---

[1]: بیضاوی: ۱/۲۔ [2]: الاعراف: ۱۸۰۔ [3]: روح المعانی: ۱۸/۱۸۷۔

تو اب بسم اللہ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے نام کے ساتھ یعنی اُس ذات کے نام کی برکت سے اور اُس ذات کی مدد لے کر میں کام کرتا ہوں جو تمام خوبیوں والی ہے، صفاتِ کمالیہ کی جامع ہے۔

رحمٰن اور رحیم کے معنٰی اور ان میں فرق:

"اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ"

"بے حد مہربان نہایت رحم والا"۔

"رحمن" اور "رحیم" دونوں رَحْمٌ سے بنے ہیں، رحمٰن بھی مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی بہت رحم کرنے والا اور رحیم بھی مبالغہ کا صیغہ ہے اس کے معنی بھی بہت رحم کرنے والا ہے۔ لیکن دونوں میں مفسرین فرق بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رحمن کے معنٰی عَامُّ الرَّحمة کے ہیں اور رحیم کے معنٰی تَامُّ الرَّحۡمَة اور خاص الرَّحمة کے ہیں، یعنی رحمٰن وہ ہے جس کی رحمت عام ہو، چونکہ دنیا میں اللہ پاک کی رحمت سب کو عام ہوتی ہے،اس کی رحمت سے نہ کوئی مستثنیٰ ہوتا ہے اور نہ کوئی محروم، مومن، مشرک، ملحد، اور کافر سب اس کی رحمت میں شامل ہوتے ہیں، اس لئے اللہ پاک کو دنیا کے اعتبار سے رحمن کہا جاتا ہے۔ چونکہ رحمن کے معنٰی میں عمومیت پائی جاتی ہے اور اس کی رحمت میں سب شامل ہوتے ہیں اس لئے صفتِ "رحمن" صرف اللہ کی خصوصیت ہے، اللہ کے علاوہ کسی میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اس کی رحمت سب پر ہو اس لئے رحمن سوائے اللہ کے کسی کا نام نہیں ہے، اور نہ کسی کے لئے صرف رحمن کہنا جائز ہے۔ جیسے نوال الرحمٰن اگر کسی کا نام ہے، تو اُس کو صرف "رحمن" کہنا غلط ہے۔

رحیم کے معنی تام رحمت اور خاص رحمت کے ہیں، چونکہ آخرت میں اللہ کی رحمت خاص ہوگی، کفار، مشرکین، ملحدین اور دہریوں کو شامل نہیں ہوگی اس لئے اللہ

پاک کو آخرت کے اعتبار سے رحیم کہا جاتا ہے۔اور چونکہ ”رحیم“ کے معنٰی خاص رحمت اور تام رحمت کے ہیں تو ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے کے ساتھ خاص رحمت اور مکمل رحمت کا معاملہ کرے اس لئے رحیم کا لفظ اللہ کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی جائز ہے۔اسی وجہ سے خود حضور ﷺ کے اسمائے گرامی میں رحیم ہے۔

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾[1]

”آیا ہے تمہارے پاس تم میں کا رسول، بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہونچے، حریص ہے تمہاری بھلائی پر، ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے“۔

لفظ رحمن اور رحیم کے بارے میں حضرت عبد اللہ ابن مبارکؒ کی تفسیر:

حضرت عبد اللہ ابنِ مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے رحمن اور رحیم کی تفسیر میں فرمایا:

”اَلرَّحْمٰنُ إِذَا سُئِلَ أَعْطٰى وَالرَّحِيْمُ إِذَا لَمْ يُسْئَلْ غَضِبَ“[2]

”رحمٰن وہ ہے کہ جب اس سے مانگا جائے تو وہ دے دے اور رحیم وہ ہے کہ اس سے نہ مانگا جائے تو غصہ ہو جائے۔

بہر حال جو کوئی حضور ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرے گا اور اُن کی اتباع کرے گا تو وہ آخرت کی دائمی رحمت اور اللہ پاک کی اس خصوصی رحمت سے مستفید ہو گا۔

تسمیہ میں ان تین اسماء کا ذکر کیوں؟

کسی کام کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کی تعلیم کیوں دی گئی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر کام کے تین مراحل ہوتے ہیں۔(۱)اس کا وجود میں آنا(۲)اس کا باقی رہنا(۳)اس سے فائدہ اٹھانا۔اور اللہ پاک کے یہ تین اسماء ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک ان تین کاموں میں سے کسی ایک کا فائدہ دیتا ہے۔کیونکہ اللہ کہتے ہیں ایسی ذات

---

[1]: التوبۃ:۱۲۸۔ [2]: روح المعانی:۱/۲۹۔

کو جو صفاتِ کمال کی جامع ہے، اُس کے اندر کمال کی صفات ہونے سے اُس نے کائنات کو پیدا کیا۔ آدمی کسی چیز کو خود پیدا نہیں کر سکتا، آدمی کا کام صرف پیدا شدہ چیزوں میں تصرف کر کے اُن سے فائدہ اُٹھانا ہے، اگر کوئی چیز پیدا ہی نہ ہو تو آدمی کیا فائدہ اُٹھائے گا ،تو اللہ ہی ہے جس سے تمام چیزیں اور اسباب وجود میں آتے ہیں ۔ دوسری چیز یہ ضروری ہے کہ وہ باقی ہو، کیونکہ اگر وہ چیز باقی نہ ہو تو آدمی کیا فائدہ اُٹھائے گا، یہ صفتِ رحمانیت کا ثمرہ ہے، کیونکہ بقاء عالم اسی صفت کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ تیسری چیز یہ ضروری ہے کہ اس سے نفع اٹھایا جائے، اگر نفع آدمی کو حاصل نہ ہو سکتا ہو تو آدمی اُس چیز کو لے کر کیا کرے گا، اور نفع حاصل کرنا اور اس سے مستفید ہونا صفتِ رحیمی کا ثمرہ ہے کیونکہ اللہ پاک اپنی رحمت سے بندوں کے کاموں کو برباد نہیں کرتے۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہ، نے بسم اللہ کہنے کا حکم فرمایا۔

بسم اللہ میں توحید کی تعلیم مضمر ہے:

علماء نے اس سلسلہ میں ایک بات یہ لکھی ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مخلوق کو خالق سے جوڑنے اور ملانے کے لیے آتے ہیں، اور بسم اللہ میں بھی بندہ کا اللہ سے جوڑ ہوتا ہے، اسی وجہ سے ہر کارِ خیر سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اسی لئے جو آدمی بسم اللہ کو حقیقی معنی میں پڑھتا ہے اور ان مضامین کو سامنے رکھ کر بسم اللہ کہتا ہے تو وہ در اصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو نیا اور تازہ کرلیتا ہے۔ اور گویا وہ اس بات کا اپنے دل میں اقرار کرتا ہے کہ نہ میں اپنی ذات سے موجود ہوں اور نہ یہ چیز اپنی ذات سے موجود ہے۔ اگر خدا مجھے زندگی نہ دیتا تو میں موجود نہ ہوتا، اور یہ چیز نہ ہوتی تو میں اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اب اس سے جو میں فائدہ اُٹھا رہا ہوں یہ خاص اُن کی مہربانی ہے۔ گویا یوں سمجھ لیجیے کہ بسم اللہ میں توحید کی تعلیم دے دی گئی ہے اور مخلوق کا خالق سے تعلق جوڑ دیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جتنے کام آدمی کرتا ہے، حق تعالیٰ شانہ، نے اُن کو اپنی طرف منسوب کیا اور رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو جو دعائیں سکھائی ہے اور جو تربیت فرمائی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے سکھلائی ہے۔ مثال کے طور پر ہم کھانا کھاتے ہیں، تو کھانے کے بعد کی نبی ﷺ نے ہمیں یہ دعا سکھلائی:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ''[۱]

''خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو کھلایا اور پلایا اور ہم کو مسلمانوں میں سے بنایا''۔

ہم نے اس طرح کیوں نہیں کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے کھایا؟ یہ بھی نہیں کہا کہ ہم نے پیا، بلکہ یوں کہا کہ آپ نے کھلایا، آپ نے پلایا اس پر آپ کا شکر ہے۔ اسی طرح آدمی استنجے کو جاتا ہے، اس میں بھی جو دعا سکھلائی گئی، اس میں بھی اللہ پاک کا نام لینے کا ہی حکم دیا گیا، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''فَإِذَا دَخَلَهَا أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: بِسْمِ اللهِ، أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ''[۲]

پس جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء میں داخل ہو تو چاہئے کہ وہ کہے اللہ کے نام سے (میں بیت الخلاء میں داخل ہوتا ہوں، اور یوں کہے کہ) اے اللہ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں سرکش شیاطین اور جنات سے یا گندگیوں سے۔

اسی طرح استنجا سے لوٹتے وقت حضور پاک ﷺ نے جو دعا سکھلائی اُس میں بھی یہی مضمون ہے۔

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ''[۳]

---

[۱]: سنن ابی داود: الاطعمۃ، باب مایقول الرجل اذا اطعم۔ [۲]: معجم طبرانی: باب من اسمہ ابراھیم، رقم: ۲۹۱۰۔
[۳]: سنن ابن ماجہ: کتاب الطھارۃ وسننھا، باب مایقول اذا خرج من الخلاء۔

تمام تعریفیں اس ذات کے لئے ہیں جس نے مجھ سے گندگی کو دور کیا اور مجھے عافیت بخشی۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ آدمی یوں کہے کہ میں نے پیشاب سے فراغت پائی، میں استنجے سے فارغ ہو کر آیا، معلوم ہوا کہ ہر جگہ توحید کا علم ہے۔ نبی کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ مخلوق کو خالق سے تعلق جوڑنے کی تعلیم دیں۔ نبی مخلوق کو خالق کا تعارف کرانے اور مخلوق کو خالق سے جوڑنے کے لیے ہی آتے ہیں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم اتنی بڑی دولت ہے کہ اگر ہم اس کو شعور کے ساتھ پڑھنے لگیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا ہی رہے گا۔ اور اس کے پڑھنے والے پر غیر معمولی اللہ کی رحمت شامل ہوتی رہے گی۔

کارِ بد میں بسم اللہ کی اجازت نہیں:

بسم اللہ تو ہر کارِ خیر پر پڑھنا ہے لیکن برے کاموں میں بسم اللہ پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ ناجائز چیزوں پر اللہ کے نام کی برکت نہیں رہ سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی برکت اللہ کے رحم اور اللہ تعالیٰ کی رضا سے تعلق رکھتی ہے۔ اور جو چیزیں حرام اور ناجائز ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی ہیں، اُن پر اگر آپ اللہ کے نام کی برکت لیں گے اور اللہ کی مدد لینا چاہیں گے تو گویا اللہ تعالیٰ ہی سے لڑائی مول لیں گے۔ اسی وجہ سے کوئی آدمی شراب پیتے ہوئے بسم اللہ پڑھے (اس کو حلال سمجھ کر) تو کافر ہو جائے گا۔ ایسے ہی بدکاری کرتے ہوقت بسم اللہ پڑھے تو کافر ہو جائے گا۔

کیا تسمیہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے؟:

ایک مسئلہ یہ ہے کہ سورۂ نمل میں جو بسم اللہ ہے، جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے بلقیس کو لکھا تھا:

﴿إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ﴾ ۱

"یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور یہ اللہ کے نام کے ساتھ ہے جو رحمٰن (اور) رحیم ہے، زور نہ کرو میرے مقابلہ میں اور چلے آؤ میرے سامنے حکم بردار ہو کر۔ اس بسم اللہ کے بارے میں تو سب متفق ہیں کہ یہ آیتِ نمل کا جزء ہے۔

لیکن جو تسمیہ سورۂ فاتحہ اور دیگر سورتوں کے شروع میں ہے وہ ان سورتوں کا جزء ہے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ صاحبِ روح المعانی نے اس سلسلہ میں دس اقوال نقل فرمائے ہیں:

امامِ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امامِ مالک، امامِ اوزاعی، اہلِ بصرہ اور اہل مدینہ یہ کہتے ہیں کہ سورہ نمل کے علاوہ تسمیہ کسی سورت کا جزء نہیں ہے، بلکہ یہ مستقل آیت ہے، ہر سورت کے شروع میں بطورِ تبرک کے پڑھی جاتی ہے۔ ۲

احناف کے دلائل

دلیلِ اول تو وہ روایات ہیں جن میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو آواز سے نہ پڑھنا صراحت کے ساتھ آیا ہے، کیونکہ بسم اللہ کو آواز سے نہ پڑھنا اس کے سورۂ فاتحہ کا جُز ونہ ہونے کی علامت ہے، جیسے حضرت عبد اللہ ابن مغفل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی ہے مگر ان میں سے کوئی بھی بسم اللہ الرحمن الرحیم کو آواز سے نہیں پڑھتے تھے، ۳ دوسری دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نماز کا آغاز الحمد للہ رب

۱: النمل: ۳۰ و ۳۱۔ ۲: روح المعانی: ۱/ ۱۔ ۳: سنن ترمذی: ابواب الصلاۃ/ باب ما جاء فی ترک الجہرِ ببسم اللہ الرحمن الرحیم۔

العالمین کے ساتھ کرتے تھے، [۱] اس حدیث میں قرأت کا افتتاح بسم اللہ کے بجائے الحمدللہ سے کرنے کا بیان ہے، اگر بسم اللہ الخ سورۂ فاتحہ کا جزء ہوتا تو اسے ضرور پڑھا جاتا۔

تیسری دلیل نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: قرآن کریم کی ایک سورت تیس آیات پر مشتمل ہے جو آدمی کی بخشش ہونے تک اس کی سفارش کرتے رہتی ہے اور وہ تبارک الذی بیدہ الملک ہے۔ سورۂ ملک کی تیس آیات اسی وقت بنیں گی جبکہ بسم اللہ کو اس میں شامل نہ کیا جائے، ورنہ اکتیس ہو جائیں گی۔

چوتھی دلیل آیتِ قرآن ہے:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾ [۲]

اس میں سبع مثانی سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک سورۂ فاتحہ ہے، کیونکہ یہ اُن سات آیات پر مشتمل ہے جو نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہیں، اور سورۃ فاتحہ کی سات آیات اُسی وقت بنتی ہیں جبکہ بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزو نہ مانا جائے، ورنہ آیتیں آٹھ ہو جاتی ہیں، اس کی تائید ان صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے جن میں آنحضرت ﷺ نے سورۂ فاتحہ کا نام، "السبع المثانی" قرار دیا ہے۔

پانچویں دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں "فَإِنِّيْ سَمِعْتُ رسول الله ﷺ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ وَلِعَبْدِيْ مَاسَأَلَ فَاذَا قَالَ الْعَبْدُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ حَمَدَنِيْ عَبْدِيْ الخ۔ [۳] یہ حدیث قدسی ہے اور اس میں پوری سورہ فاتحہ کی تفصیل اور ہر ہر آیت کی فضیلت ظاہر کی گئی ہے کہ جب بندہ الحمدللہ رب العالمین

۱: سنن ترمذی: ابواب الصلاۃ/ باب في افتتاح القراءۃ بالحمدللہ رب العالمین۔
۲: الحجر: ۸۷۔ ۳: صحیح مسلم: الصلاۃ/ باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ۔

کہتا ہے تو اللہ تعالی فرماتے ہیں حمدنی عبدی، لیکن اس میں ''بسم اللہ'' کا تذکرہ نہیں ہے جو بسم اللہ کے سورۂ فاتحہ کا جز نہ ہونے کی دلیل ہے۔

کیا تسمیہ جہراً پڑھی جائے گی؟:

بسم اللہ سے متعلق ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ کیا سورۂ فاتحہ سے قبل بسم اللہ جہری نمازوں میں آہستہ پڑھی جائے گی یا بلند آواز سے؟

سورۂ فاتحہ میں سات آیتیں ہیں جیسا کہ گزشتہ احادیثِ مبارکہ سے آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا، تو جن ائمہ نے بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جز بنایا ہے وہ ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے لے کر ﴿ولا الضآلین﴾ تک ایک ہی آیت مانتے ہیں تاکہ بسم اللہ کو شامل کرنے سے سات آیات مکمل ہو جائیں، پس جب ان لوگوں نے بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ میں داخل مانا تو یہ بھی کہدیا کہ جہری نمازوں میں چونکہ سورۂ فاتحہ آواز سے پڑھی جاتی ہے اسلئے بسم اللہ بھی بلند آواز سے پڑھنا چاہئے، کیونکہ اگر اس کو سورۂ فاتحہ کا جز مان کر اس کی ایک آیت کو آہستہ پڑھیں اور بقیہ آیات کو بلند آواز سے پڑھیں تو ظاہر ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اور نہ کوئی اس کا قائل ہے۔

مسلکِ حنفیہ اور اس کے دلائل:

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جز نہیں ہے، اس لیے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو آہستہ پڑھا جائے گا اور سورۂ فاتحہ کو جہر سے پڑھا جائے گا۔ اس کے علاوہ باضابطہ طور پر احادیث میں تسمیہ کے آہستہ پڑھنے کے دلائل بھی موجود ہیں، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

صَلَّيْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ فَكَانُوا يَسْتَفْتِحُونَ بِ{ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ } لَا يَذْكُرُونَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ فِي أَوَّلِ قِرَاءَةٍ وَلَا فِي آخِرِهَا۔[۱]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ، ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی، پس وہ لوگ الحمد اللہ رب العالمین سے (قرأت) شروع کرتے تھے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھتے تھے، نہ قرأت کے شروع میں اور نہ آخر میں۔

حضرت عبد اللہ ابنِ مغفل رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو جہراً بسم اللہ پڑھتے ہوئے سنا تو کہا کہ میں نے نبی ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، اور عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی، لیکن کسی سے بھی جہراً بسم اللہ نہیں سنی لہٰذا تم بھی مت پڑھو۔ اور یہ اسلام میں نئی چیز ہے۔ اس کے بعد امامِ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہی اہلِ علم کا مذہب اور خلفاء راشدین کا طریقہ ہے، اور ان کے بعد تابعین کا بھی یہی مذہب ہے، اور امامِ احمد رحمۃ اللہ علیہ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، عبد اللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور اسحاق ابن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل ہیں کہ بسم اللہ جہراً نہیں پڑھی جائے گی؛ بلکہ دل میں پڑھی جائے گی۔[۲]

لہٰذا اس روایت سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ بسم اللہ جہراً نہیں پڑھنی ہے، نہ آپ کا یہ عمل تھا اور نہ خلفاء راشدین کا اور نہ تابعین وغیرہ کا۔

۱: صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب حجۃ من قال لا یجہر بالصلاۃ۔ ۲: سننِ ترمذی: کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی ترک الجہر بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

کیا ضمِ سورت سے قبل بسم اللہ پڑھنی ہے؟

بسم اللہ سے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی یاد رکھیں کہ جب سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے تو اس کے مکمل ہونے کے بعد سورت ملانے سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھی جائے گی، لیکن اگر کسی نے پڑھ لی تو کوئی حرج نہیں ہے۔

قاعدہ یہی ہے کہ صرف سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائی گی اور ضم سورت سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھی جائے گی۔

۷۸۶ کی حقیقت:

بسم اللہ سے متعلق اس مسئلہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بسم اللہ کے بجائے نمبر "۷۸۶" لکھتے ہیں۔ یہ نمبر بسم اللہ کا بدل نہیں ہے، یہ نمبر کیا ہیں؟ اصل میں ا، ب، ت، ث، ج جتنے حروف ہیں ان حروف کے اعداد نکالے جاتے ہیں۔ تو جیسے ۷۸۶ بسم اللہ کے نمبر ہیں ایسے ہی کسی اور چیز کے بھی ہوسکتے ہیں۔ اچھی چیز کے بھی ہوسکتے ہیں اور خراب چیز کے بھی ہوسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض حساب کرنے والوں نے حساب کرکے بتایا کہ جس طرح بسم اللہ کیلئے ۷۸۶ کے اعداد ہوتے ہیں اسی طرح ہری کرشنا کے بھی اعداد ۷۸۶ ہوتے ہیں، کیونکہ ہر حرف کے اعداد متعین ہیں کہ فلاں حرف کے اتنے نمبر ہیں، مثلاً ہری کرشنا کے اعداد اگر نکالنا چاہیں تو اس کی تفصیل یہ ہوگی کہ "ہ" کے پانچ (۵)، "ر" کے دوسو (۲۰۰)، "ی" کے دس (۱۰)، "ک" کے بیس (۲۰)، "ر" کے دوسو (۲۰۰)، "ش" کے تین سو (۳۰۰)، "ن" کے پچاس (۵۰)، اور "ا" کا ایک (۱) نمبر ہوگا۔ جب ان اعداد کو جمع کیا جائے تو ان کا مجموعہ ۷۸۶ ہوتا ہے، لہٰذا بسم اللہ ہی کا بدل یہ نمبر کیسے ہوجائیں گے؟ اگر کوئی

آدمی اعدادِ بسم اللہ یعنی ۷۸۶ کو بسم اللہ کی نیت سے لکھے گا تو وہ باعثِ برکت ہو سکتا ہے مگر وہ بسم اللہ کا بدل نہیں کہلائے گا اور بسم اللہ والا حکم اُس پر نہیں لگے گا۔ بسم اللہ تو قرآن مجید کی آیت ہے، اس کو بغیر وضو کے چھو نہیں سکتے۔ اور ۷۸۶ نہ آیت ہے نہ اُس کا بدل لہٰذا اُس کو چھوا بھی جا سکتا ہے۔ عام طور پر لوگ اس لیے بھی لکھتے ہیں کہ کہیں بسم اللہ کی بے ادبی نہ ہو جائے، مگر کوئی آدمی خط کے شروع میں ۷۸۶ لکھتا ہے یا اپنے بورڈ کے اوپر ۷۸۶ لکھ دیتا ہے تو اُس کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اُس نے بسم اللہ لکھدی، بلکہ بسم اللہ لکھنا پڑے گا تب کہیں جا کر اُس کو بسم اللہ کی فضیلت حاصل ہو گی۔ یہ تعوذ اور تسمیہ سے متعلق کچھ تفصیل تھی، اب سورۂ فاتحہ سے متعلق بھی چند باتیں آپ کے سامنے ذکر کی جائیں گی۔

سورۂ فاتحہ کے فضائل:

سورۂ فاتحہ کی بھی مستقل فضیلتیں احادیثِ مبارکہ میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب سورت ہے۔ سب سے پہلے یہی سورت مکمل نازل ہوئی۔[1]

پہلے سورۂ قلم کی پانچ آیتیں نازل ہوئیں، اسی طرح سورۂ مزمل کی بھی چند آیتوں کا نزول ہوا، پھر سورۂ مدثر کی کچھ آیتیں اُتریں، لیکن ان سورتوں کو مکمل نازل کرنے سے پہلے اللہ پاک نے سورۂ فاتحہ کو مکمل نازل فرمادیا۔ اور اس کو نماز میں پڑھنے کے لئے کہا، اس سے خود اللہ پاک کی شانِ کریمی ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ اس میں اللہ پاک نے مانگنے کا طریقہ بتایا ہے، اگر اس کو بندے پر چھوڑ دیا جاتا کہ تو مجھ سے مانگ اور میری تعریف کر اور میرے سامنے اپنی عاجزی کو پیش کر تو بندے کو اس کا حوصلہ، قدرت اور استطاعت نہیں تھی، اور وہ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ کس طریقے سے اللہ پاک کی

---

[1]: تفسیر منار: ۱ /۲۹۔

تعریف کی جائے، کیسے اللہ پاک سے مانگا جائے اور کیسے اللہ پاک کے سامنے عاجزی کی جائے؟ اگر وہ اپنے الفاظ ہی سے کہتا بھی تو خود بندے کے اندر اتنی گندگی ہے کہ وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ وہ اللہ کا نام لیتا اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اگر میں ایک ہزار مرتبہ بھی اپنے منہ کو مشک و عنبر و گلاب سے دھولوں پھر بھی آپ کا نام لینا چاہوں تو اصلاً وہ بھی بے ادبی ہے۔

یہ تو اُن کا کرم ہے اور اُن کی مہربانی ہے کہ انہوں نے اپنا نام لینے کی اجازت دے دی اور اس کا طریقہ بھی بتلا دیا کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو اور حق تعالیٰ کی شان اور بزرگی بیان کرے، اللہ سے مانگے اور اللہ کے سامنے اپنی عبودیت کا اقرار کرے، اسی وجہ سے جو سورۂ فاتحہ پڑھے گا وہ ضرور قبول ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی سورت ہے اور اللہ نے مانگنے ہی کے لیے دی ہے۔ جو اُن کے پاس مقبول ہے وہی انہوں نے دی ہے، اس لئے ہمارے پڑھنے سے وہ ضرور قبول ہوگی۔

حضور ﷺ سے منقول دعاؤں کی برکت

اسی وجہ سے دُعاؤں کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ حضور ﷺ سے جو دعائیں ثابت ہیں انہی دعاؤں سے دعا مانگنے میں زیادہ برکت ہے کیونکہ یہ وہ دعا کے الفاظ ہیں جو سرکارِ دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہیں اور آپ ﷺ کی زبان مبارک سے جو کچھ بھی ظاہر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا ہوتا ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾[1]

---

[1]: النجم: ۳-۴۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دعا حضور ﷺ کو سکھائی گئی تو اللہ کے ہاں وہ دعا پہلے سے مقبول ہے تب ہی تو آپ ﷺ کو سکھائی گئی۔ اس لیے اُس دعا کے پڑھنے میں جو برکت ہے وہ اپنی طرف سے پڑھنے میں نہیں ہے۔ اسی طریقے سے یہاں بھی حق تعالیٰ شانہ نے خود ہی سکھایا ہے اور انہوں نے بتایا کہ میرے پاس کس طریقے سے درخواست دی جائے، اس لئے جب بندہ ان الفاظ کے ساتھ مانگتا ہے اور دعا کرتا ہے تو اس کی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

سورۂ فاتحہ اللہ اور بندے کے درمیان ایک راز ہے:

حدیث پاک میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ سورۂ فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے۔[۱]

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سورۂ فاتحہ کی یہ تین ابتدائی آیات وہ ہیں جو خالص اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں۔ اور ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ یہ وہ آیت ہے جو آدھی اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے اور آدھی بندے سے متعلق ہے۔ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ سورۂ فاتحہ کا یہ وہ حصہ ہے جو صرف بندے سے متعلق ہے۔

بندہ کی نماز میں اللہ پاک سے ہم کلامی:

اور یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں آتا ہے جب بندہ الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے (کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے عالموں کا پالنے والا ہے) تو حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: ”حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ“ میرے بندے نے میری تعریف کی۔

---

[۱] صحیح مسلم: الصلاۃ/ باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ۔

اس لئے جب ہم نماز شروع کریں تو ہماری ساری توجہ اللہ پاک کی طرف ہو اور ہمیں یہ استحضار ہو کہ اللہ پاک میری طرف متوجہ ہیں اور میں نماز میں اللہ تعالیٰ سے بات کر رہا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا:

’’إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا قَامَ فِي صَلاتِهِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ، وَإِنَّ رَبَّهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، فَلاَيَبْزُقَنَّ أَحَدُكُمْ قِبَلَ قِبْلَتِهِ‘‘[1]

’’جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اور بے شک اس کا رب اس کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے، اس لئے تم میں سے کوئی اپنے قبلہ کی جانب نہ تھوکے۔‘‘

ایک بزرگ کا قصہ:

ایک بزرگ نماز پڑھا رہے تھے۔ جب انہوں نے ’’الحمدللہ ربّ العالمین‘‘ پڑھا تو خاموش ہوگئے۔ پھر دوسری مرتبہ الحمدللہ ربّ العالمین پڑھا تو پھر خاموش ہوگئے، اسی طرح کئی مرتبہ انہوں نے اس کو دہرایا، لوگوں نے سمجھا کہ شاید بھول گئے ہوں اس لئے لقمہ دینے لگے، لیکن انہوں نے ان کا لقمہ نہیں لیا، بالآخر آگے پڑھا اور نماز مکمل کی، فراغت کے بعد لوگوں نے کہا کہ حضرت! آپ نے اس آیت کو کئی مرتبہ دہرادیا اور آپ لقمہ بھی نہیں لے رہے تھے، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کہنے لگے کہ ہمارے کچھ راز ہیں، اس کا تم سے کوئی سروکار نہیں، اپنے کام سے کام رکھو، لوگوں نے کہا کہ آپ کو بتانا پڑے گا۔ انہوں نے فرمایا کہ جب میں سورۂ فاتحہ پڑھتا ہوں تو اللہ جل جلالہ کا جواب سن کر آگے بڑھتا ہوں۔ جب میں ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ‘‘ کہا تو ’’حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ‘‘ کے الفاظ میرے کانوں میں نہیں آرہے تھے، میں اس لیے دہرا

[1]: صحیح بخاری: الصلاۃ/ باب حک البزاق بالید من المسجد۔

رہا تھا کہ کیا بات ہے؟ اللہ پاک کا جواب میں سن نہیں پا رہا ہوں، یہ کیسے اللہ والے تھے! انہوں نے اللہ پاک سے کتنا تعلق جوڑ لیا تھا، یہ ان کی کرامت تھی کہ انہیں یہ الفاظ سنائی دیتے تھے۔

پھر جب بندہ "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" (کہ اللہ پاک بہت ہی مہربان اور نہایت رحم فرمانے والے ہیں)۔ کہتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: "اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ" میرے بندے نے میری ثنا بیان کی۔ جب بندہ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتا ہے: تو حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: "مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ" میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی اور میری بڑائی بیان کی۔ اور پھر اس کے بعد جب "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" کہتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے۔ پھر اُس کے بعد فرماتے ہیں: "وَلِعَبْدِیْ مَاسَأَلَ" میرے بندے کو میں وہ ضرور دوں گا جو اس نے مانگا۔

جب بندہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ، صِرَاطَ الَّذِیْنَ أَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ پڑھتا ہے تو حدیث میں آتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "هٰذَا لِعَبْدِیْ" یہ پورا کا پورا میرے بندے کا حصہ ہے۔ "وَلِعَبْدِیْ مَاسَأَلَ" اور میرے بندے کے لئے وہ سب ہے جو اس نے مانگا۔[ا] میرا بندہ مجھ سے ہدایت مانگتا ہے اور زندگی گزارنے کا کامیاب راستہ مانگتا ہے میں ضرور اُس کو اس راستے پر چلاؤں گا۔

"سورۂ فاتحہ" قرآن پاک کا خلاصہ:

سورۂ فاتحہ دراصل پورے قرآن پاک کا متن اور سرخی ہے۔ علماء نے فرمایا کہ قرآن پاک میں جتنے مضامین ہیں اُن سب کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں فرما دی ہے۔ جب کوئی کتاب لکھی جاتی ہے تو اُس کے شروع میں تمہید لکھی جاتی ہے کہ یہ کتاب

[ا]: صحیح مسلم: باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ۔

کیوں لکھی گئی؟ اس کتاب میں کیا کیا مضامین ہیں؟ یہی نوعیت سورۂ فاتحہ کی بھی ہے۔ کیونکہ اس میں حق تعالیٰ شانہ نے دین کے اصول، فروع عقائد، عبادات، تشریعات، ایمان بالبعث اور ایمان بصفات اللہ، دعا، استعانت، دینِ حق اور صراطِ مستقیم کی ہنمائی وطلب، گمراہ اور اللہ کے راستے سے انحراف کرنے والوں سے بچنے کا ذکر فرمایا ہے۔

سورۂ فاتحہ کا نزول:

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے آسمان سے ایک بڑی آواز سنی اور تھوڑی دیر کے بعد حضور پاک ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور اُن کے ساتھ ایک فرشتہ بھی آیا، جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: "یہ دروازہ ایسا ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا اور یہ ایسا فرشتہ ہے جو پہلی مرتبہ زمین پر اُترا ہے پھر فرمایا کہ دونوروں کی خوشخبری دیدو، سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری کی دو آیتوں کی، یہ دونوں ایسی ہیں کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو بھی عطا نہیں کی گئی ہیں۔[۱]

قرآن مجید میں اسی سورت کے بارے میں کہا گیا ہے:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾[۲]

"اے نبی ﷺ! ہم نے آپ کو سات آیتیں دی ہیں جو بار بار پڑھی جانے والی ہیں اور قرآن عظیم دیا۔" قرآن عظیم میں خود سورۂ فاتحہ بھی شامل ہے لیکن اس کی اہمیت کی وجہ سے علاحدہ اس کو ذکر فرمایا پھر قرآن عظیم کا ذکر فرمایا۔

سورۂ فاتحہ کا مثل دیگر کتبِ سماویہ میں بھی نہیں:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ ایسی سورت ہے کہ نہ توریت میں، نہ انجیل میں نہ زبور میں اور نہ قرآن مجید میں ایسی سورت نازل ہوئی۔[۳]

۱: تفسیر خازن: ۱/ ۱۶۔ ۱۷۔ ۲: الحجر: ۸۷۔ ۳: سنن بیہقی: باب تعیین القراءۃ الفاتحۃ....۔

عرش کے خزانوں میں سے ایک خاص خزانہ:

حضور پاک ﷺ نے اس سورۃ کے بارے میں فرمایا کہ سورۂ فاتحہ عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے:

''أَرْبَعُ آيَاتٍ نَزَلْنَ مِنْ كَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ، لَمْ يَنْزِلْ مِنْهُنَّ شَيْءٌ غَيْرُهُنَّ: أُمُّ الْكِتَابِ، فَإِنَّهُ يَقُوْلُ: وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ (الزخرف:۴)، وَآيَةُ الْكُرْسِيِّ، وَسُوْرَةُ الْبَقَرَةِ، وَالْكَوْثَرِ''[۱]

چار چیزیں عرش کے نیچے کے خزانہ میں سے مجھے دی گئی ہیں، جن میں سے ان کے علاوہ کوئی چیز نازل نہیں فرمائی، ان میں سے ایک ام الکتاب، (سورۂ فاتحہ) آیۃ الکرسی، سورۂ بقرہ کی (اخیر کی) آیتیں اور سورۂ کوثر ہے۔

سورۂ فاتحہ کے اسماء:

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ فاتحہ کے بارہ نام بتلائے ہیں:

(۱) سورۂ صلاۃ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ''[۲]

میں نے صلاۃ (سورۂ فاتحہ) کو میرے اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کردیا ہے، اس حدیث میں سورۂ فاتحہ کو صلاۃ کہا گیا۔

(۲) سورۂ حمد، کیونکہ اس میں حمد باری کی گئی ہے۔

(۳) فاتحہ الکتاب، کیونکہ فاتحہ کے معنیٰ ابتداء اور آغاز کے آتے ہیں اور قرآن کی قرأت کی ابتداء اسی سورت سے ہوتی ہے، اور قرآن میں کتابت کی بھی ابتداء اسی سورت سے ہوتی ہے اور نماز کی ابتداء بھی اسی سورت سے ہوتی ہے اس لئے اس کو فاتحۃ الکتاب کہتے ہیں۔

۱: معجم طبرانی: رقم: ۷۸۴۵، ۷/ ۲۶۹۔ ۲: صحیح مسلم: باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ۔

(۴)ام الکتاب۔(۵)ام القرآن۔ ترمذی شریف کی ایک روایت میں اس کی صراحت بھی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ الحمد للہ ،ام القرآن ہے،ام الکتاب ہے اور سبع مثانی ہے۔

(۶)مثانی بھی اس کا ایک نام ہے، کیونکہ اس کے معنٰی دہرانے اور بار بار پڑھنے کے ہیں، چونکہ یہ آیات بار بار دہرائی جاتی اور پڑھی جاتی ہیں،اس لئے اس کو مثانی بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ سابقہ حدیث میں آپ ﷺ نے اس کو مثانی کہا ہے۔

(۷) قرآن عظیم، کیونکہ یہ سورت قرآن مجید کے تمام علوم کو جامع ہے۔

(۸)شفا، کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''فَاتِحَةُ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ سَمٍّ'' کہ فاتحۃ الکتاب ہر زہر سے شفا ہے۔اس وجہ سے اس کو سورۂ شفا بھی کہتے ہیں۔

(۹)اس کا ایک نام اساس بھی ہے،اس کے معنی اصل ،بنیاد ، جڑ اور ابتداء کے آتے ہیں، ایک مرتبہ حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے کولہے میں درد کی شکایت کی گئی تو انہوں نے کہا کہ تم پر قرآن مجید کی اساس یعنی فاتحۃ الکتاب (سورۂ فاتحہ) لازم ہے،(اس سے علاج کرو) کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے میں نے سنا ہے کہ ہر چیز کی ایک اساس اور بنیاد ہوتی ہے، دنیا کی اساس مکہ ہے اس لئے کہ زمین اسی سے پھیلائی گئی ہے، آسمانوں کی اساس عریب ہے اور وہ ساتواں آسمان ہے،اور زمینوں کی اساس عجیب ہے اور وہ سب سے آخری ساتویں زمین ہے۔اور جنتوں کی اساس جنت عدن ہے جس پر جنت کی بنیاد ہے،اور جہنم کی اساس درک ہے جو سب سے نیچے اور ساتویں نمبر پر ہے،اور مخلوق کی اساس حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور انبیاء کی اساس حضرت نوح علیہ السلام ہیں،اور بنی اسرائیل کی اساس یعقوب علیہ السلام ہیں،اور کتابوں کی اساس قرآن مجید ہے،اور قرآن مجید کی اساس

سورۂ فاتحہ ہے، اور فاتحہ کی اساس بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے، لہٰذا جب تم بیمار ہو تو سورۂ فاتحہ کے ذریعہ شفا حاصل کرو۔

(۱۰)اس سورت کا ایک نام وافیہ بھی ہے، وافیہ کے معنی مکمل ہونے اور پورے ہونے کے ہیں۔ چونکہ اس سورت کی نمازوں میں تنصیف نہیں ہوسکتی، اس کو آدھا نہیں پڑھا جاسکتا، کیونکہ اگر دوسری سورتیں نماز میں آدھی پڑھی جائیں تو نماز ہوجائے گی لیکن سورۂ فاتحہ اگر آدھی پڑھی جائے تو نماز نہیں ہوگی، اس لئے اس کو وافیہ بھی کہتے ہیں۔

(۱۱)اس کو کافیہ بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ یہ سورت دوسری سورتوں کے مقابلہ میں کافی ہوجاتی ہے لیکن دوسری سورتیں اس کو چھوڑ کر کافی نہیں ہوں گی، جیسا کہ ایک روایت سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"أُمُّ الْقُرْآنِ عِوَضٌ مِنْ غَيْرِهَا وَلَيْسَ غَيْرُهَا مِنْهَا عِوَضٌ" [۱]

ام القرآن اپنے ماسوا کا بدل ہے، لیکن دوسری صورتیں اس کا بدل نہیں ہوسکتیں۔

(۱۲)سورہ رُقیۃ بھی اس کا ایک نام ہے، کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ دوران سفر ایک قبیلہ والوں کے پاس داخل ہوئے، انہیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی، اور اُس زمانے میں یہ طریقہ بھی تھا کہ راستے میں جو بستی ملے اُن بستی والوں پر ضروری ہوتا کہ وہ مسافروں کو کھانا کھلائیں، کیونکہ ہوٹلوں کا کوئی نظام نہیں تھا اور راستوں میں ریگستانی علاقے تھے اس لئے کھانے کا انتظام بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر بستی والے نہ کھلائیں تو مسافر مر جائیں، اسی پسِ منظر میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

---

[۱]: مستدرک حاکم: باب التامین، ۸۳۳ و تفسیرِ قرطبی: ۱/ ۱۱۱، ۱۱۲۔

''مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ''[۱]

''جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُس کو چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔''

پہلے تو مہمان کا اکرام فرائض میں سے تھا اور پھر حضور ﷺ نے حقِ مہمان مقرر کر دیا اور یہاں تک فرمایا کہ اگر کوئی میزبان یہ نہ کرے اور مہمان مجبوری محسوس کرے تو زبردستی اُس کا کھالے۔ آپ ﷺ نے یہاں تک کی اجازت دے دی کیونکہ اس کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہے گا۔ تو غرض یہ کہ اس بستی پر سے یہ لوگ گزرے۔ وہاں اتفاق سے لوگوں نے میزبانی کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم اتنے سارے لوگوں کو نہیں کھلا سکتے، ہمارے پاس خود پریشانی ہے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس قبیلے کے سردار کو بچھو یا سانپ نے کاٹ لیا اور وہاں کوئی منتر پڑھنے والا نہیں تھا۔ اس کا خادم دوڑا ہوا آیا اور کہا:

''فَهَلْ مِنْكُمْ رَاقٍ؟''

''تم میں کوئی منتر پڑھنے والا ہے؟''

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم پڑھ تو دیں گے لیکن تم نے ہماری ضیافت سے انکار کر دیا لہٰذا ہم اس وقت تک نہیں پڑھیں گے جب تک کہ تم ہمارے لئے کچھ طے نہ کر دو، وہ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے ہم آپ لوگوں کو اتنی بکریاں دے دیں گے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کی تو اُس کا پورا زہر اُتر گیا۔ سب صحابہ معلوم کرنے لگے کہ آپ کو کون سا عمل کیا؟ فرمانے لگے کہ مجھے کون سا عمل آتا ہے؟ میں نے تو سورۂ فاتحہ پڑھا اور دَم کر دیا، اللہ پاک نے اس سے شفا دے دی۔ اب جب ان لوگوں کو کھانا مل گیا تو مسئلہ یہ تھا کہ اس کو کھائیں یا نہ کھائیں؟ پھر وہ بکریاں لے کر آپ ﷺ

---

[۱]: صحیح البخاری: الآدب / باب من کان یومن باللہ والیوم الاخر....۔

کے پاس آئے وہ تیس بکریاں تھیں اور واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ تبسم فرمائے اور اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیا اور آپ نے اپنے لئے بھی ایک حصہ رکھنے کا حکم فرمایا۔[۱]

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے پوچھا "مَا أَدْرَاكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ" کہ تمہیں کیسے معلوم کہ یہ رُقیۃ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ "أُلْقِيَ فِي رُوعِي"[۲] یا رسول اللہ! میرے دل میں ایسی ہی بات ڈال دی گئی یا میرے دل میں ایسی ہی بات آئی۔

چونکہ آپ ﷺ نے اس کو رقیہ کہا ہے، اس لئے اس کا ایک نام سورۂ رقیہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی نام علماء نے بتلائے ہیں جو دیگر کتابوں میں موجود ہیں۔

قرآن پاک کے ذریعہ علاج کر کے اُجرت لینا:

یہیں سے ایک مسئلہ یہ نکلا کہ اگر آدمی قرآن پاک کے ذریعے علاج کرے تو اُس کی اجرت لے سکتا ہے۔ بعض علماء کا رجحان یہ ہے کہ مطالبہ تو صحیح نہیں ہے بغیر مطالبے کے علاج کے بعد اگر کوئی چیز حاصل ہو جائے تو پھر اس کو استعمال کرنا صحیح ہے۔

لیکن احناف کے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ بطورِ رقیہ قرآن پاک کا پڑھنا اور اس پر اُجرت لینا جائز ہے۔[۳] کیونکہ اس واقعہ میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

"إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللهِ"[۴]

بیشک سب سے زیادہ حق دار چیز جس پر تم اجرت لو تو وہ کتاب اللہ ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ رقیہ کی اجرت جائز ہے۔

---

[۱]: صحیح بخاری: الإجارة / باب مایعطی فی الرقیۃ علی احیاء العرب بفاتحۃ الکتاب۔ [۲]: مسند احمد: مسند ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ، ۱۱۴۱۷۔ [۳]: رد المحتار: مطلب فی الاستیجار علی الطاعات۔ [۴]: صحیح بخاری: کتاب الطب: باب الشرط فی الرقیۃ بقطیع من الغنم۔

نماز میں سورۂ فاتحہ کی حیثیت:

سورۂ فاتحہ قرآن پاک کا ایک حصہ ہے اور اسے نماز میں پڑھنا لازمی قرار دیا گیا ہے اور متعدد احادیث میں یہ مضمون موجود ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لَاصَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ'' [۱]

''جس آدمی نے سورۂ فاتحہ کی تلاوت نہیں کی اُس کی نماز نہیں ہوتی۔''

''مَنْ صَلّٰى صَلٰوةً لَمْ يَقْرَأْ فِيْهَا بِاُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ'' [۲]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس نے کوئی نماز پڑھی اور اُس میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت نہیں کی تو وہ نماز ناقص ہے۔

اس لیے سب اس بات پر متفق ہیں کہ جب آدمی نماز پڑھے تو اُسے سورۂ فاتحہ پڑھنی ہے۔ البتہ سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کی حیثیت کے بارے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اماموں کی تحقیق میں فرق پایا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان احادیث کی وجہ سے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہر آدمی (منفرد اور امام) کے لیے واجب ہے۔ دوسرے لوگوں کے نزدیک فرض ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: قرآن پاک کی آیت ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ [۳] سے ''پڑھو تم جو تمہارے لیے آسان ہو قرآن میں سے'' اس کی فرضیت معلوم ہوئی۔ اب ضروری نہیں ہے کہ سورۂ فاتحہ ہی آسان ہو، سورۃ الکوثر اور سورۃ العصر چھوٹی ہیں، کسی کو یہ آسان ہو سکتی ہیں۔ اس لئے قرآن کے پڑھنے سے فرض تو ادا ہو جائے گا چاہے سورۂ فاتحہ پڑھیں یا کوئی اور سورہ پڑھیں۔ قرآن شریف کا پڑھنا فرض ہے لیکن یہ فرض دو واجبوں کے بیچ ادا ہوتا ہے۔

۱: صحیح بخاری: الصلاۃ/باب وجوبِ القراءۃ للامام والمأموم الخ۔ ۲: صحیح مسلم: الصلاۃ/باب وجوبِ قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، الخ۔ ۳: المدثر: ۲۰۔

فرض اور واجب میں فرق یہ ہے کہ اگر سورۂ فاتحہ بھول کر چھوٹ جائے تو دوسرے اماموں کے نزدیک نماز ہی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ ان کے ہاں فرض ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز میں سجدۂ سہو واجب ہو گا، کیونکہ یہ ان کے ہاں واجب ہے۔ کیونکہ فرض کے چھوٹنے پر سجدۂ سہو نہیں ہوتا، فرض کی تلافی سجدۂ سہو سے نہیں ہو سکتی جبکہ واجب کی تلافی سجدۂ سہو سے ہو سکتی ہے، آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ کوئی سورۂ فاتحہ کیسے بھولے گا؟ لوگ سورۂ فاتحہ بھی بھول جاتے ہیں۔ عام طور پر رمضان شریف میں حافظوں کو اپنے قرآن پاک سنانے کی پڑی رہتی ہے۔ بعض ایسے حفاظ کے بارے میں بھی سننے میں آیا کہ رکوع میں بھی وہ سوچ رہے ہیں جو دوسری رکعت میں پڑھنا ہے، سجدے میں بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ کھڑے ہونے کے بعد کیا سنانا ہے۔ رمضان شریف میں یہ سارے حفاظ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور اپنی اپنی روداد سناتے ہیں۔ ہمارے دوستوں میں سے ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ آج تو میرے ساتھ ایک لطیفہ ہو گیا۔ جب میں سجدہ سے اُٹھا تو پارے کی تلاوت شروع کر دی کیونکہ تھوڑا کچا تھا، رکوع اور سجدے میں وہی سوچ رہا تھا، کھڑے ہوتے ہی وہیں سے تلاوت شروع کر دی، اب میری نماز ہوئی یا نہیں؟ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے۔

مسئلہ قرأت خلف الامام

دوسرا اختلافی مسئلہ جسے میں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب امام کے پیچھے مقتدی کھڑے ہوں تو انہیں سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ آج کل یہ مسئلہ بہت چلا ہوا ہے۔ ہمارے امریکا میں بھی ہے اور انڈیا پاکستان میں بھی یہ مسئلہ چل رہا ہے۔ حکومتوں کے اعتبار سے مسائل اوپر آجاتے ہیں جبکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دلائل کی بنیاد پر یہ مسائل اوپر آئے ہیں۔ یہ مسائل دلائل کی بنیاد پر اوپر نہیں آتے بلکہ اقتدار کی بنیاد پر اوپر

آتے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی ایک خاص اعتبار سے اوپر آیا ہے صرف دلیل کی بنیاد پر اوپر نہیں آیا۔ ورنہ دلیل کے اعتبار سے یہ مسائل ہمارے علماء کرام برسوں پہلے حل کرچکے ہیں۔ یہ میں فضول بات نہیں کررہاہوں، میں آپ لوگوں کے ذہن میں ایک بات لانا چاہتاہوں، اللہ کرے وہ بات ذہن میں آجائے۔ علماء کرام جو فتاویٰ دے چکے ہیں اُن لوگوں نے اپنے اور اُمت کے اوقات ضائع نہیں کیے۔ جتنی محنت اُن لوگوں نے احتیاط اور امانت داری کے ساتھ ان مسائل کے حل کرنے میں کی ہے اتنی محنت بعد والا نہیں کرسکتا۔

بہرحال اس کی بھی تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتاہوں مگر یہ مسئلہ اتنا چھوٹا نہیں ہے کہ آدھے گھنٹے میں سمجھایا جاسکے۔ عام طور پر لوگ اس بارے میں پریشان کرتے رہتے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے، یہ لوگ بخاری، ترمذی کی احادیث کے حوالے بھی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ احادیث حنفیوں اور شوافع کو نہیں معلوم ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہمارے امتحان میں یہ سوال آیا تھاتو میں نے اس کے جواب میں بیس بڑے صفحے لکھے تھے۔ جب بیس صفحے میں نے لکھے تھے تو اندازہ کیجیے کہ استاد نے اس مسئلے کے ضمن میں ہمیں چالیس صفحے تو پڑھائے ہی ہوں گے۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسئلہ کتنا پھیلا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ میں نے شیخی کے لیے ذکر نہیں کیا بلکہ اعتماد کے لیے ذکر کیا ہے کہ مسائل میں تفصیلات ہوتی ہیں جسے ہر آدمی نہیں سمجھ سکتا، اس کا خلاصہ آپ سے عرض کروں گا کہ اس کی کیا نوعیت ہے۔

قرأت خلف الامام کے بارے میں ائمہ اربعہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کا مسلک

علماء احناف فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام مکروہِ تحریمی ہے۔ لیکن سرّی نمازوں میں ترک اولیٰ ہے۔

یہی مسئلہ اختلافی مسائل میں زیادہ نازک ہے۔ دوسرا مسئلہ جیسے ہاتھ اُٹھانے کا مسئلہ ہے، یہ ضروری اور غیر ضروری کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا مسئلہ ہے۔ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اُٹھنے کے بعد ہاتھ اُٹھانے کا مسئلہ زیادہ بہتر کا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ''آمین'' کہنے کا مسئلہ بھی اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا ہے کہ باآواز بلند کہنا بہتر ہے یا آہستہ کہنا بہتر ہے، مگر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلے میں اختلاف شدید ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا تحقیقی قول یہ ہے کہ واجب نہیں ہے۔ جیسا کہ کتاب الام کی ایک عبارت اس پر دلالت کرتی ہے:

''وَنَحْنُ نَقُوْلُ كُلُّ صَلَاةٍ صُلِّيَتْ خَلْفَ الْإِمَامِ وَالْإِمَامُ يَقْرَأُ قِرَاءَةً لَا يَسْمَعُ فِيْهَا قَرَأَ فِيْهَا''

امامِ مالک اور امامِ احمد کا ایک قول یہ ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام واجب نہیں ہے، اور ایک قول مستحب اور مکروہ کا بھی مروی ہے، اور سری نمازوں میں تین قول مروی ہیں، (۱) واجب (۲) مستحب (۳) مباح۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تحقیقی طور پر دیکھا جائے تو قرأت خلف الامام کے واجب ہونے کے متعلق ائمہ اربعہ میں سے کسی کا بھی مسلک نہیں ہے، حتیٰ کہ داؤد ظاہری بھی اس کے قائل نہیں ہیں، [۱] اور ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بھی جہری نمازوں میں اس کے قائل

---

[۱]: کمافی احسن الکلام، بحوالہ المغنی لابن قدامہ: ۱۶۰۹۔

نہیں ہیں، نیز ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی حنفیہ کے مسلک کے مطابق ہے۔ا؎ چاروں ائمہ سے ہٹ کر غیر مقلدین کا طبقہ یہ کہتا ہے کہ پڑھنا ضروری ہے۔ پہلے تو لوگوں کو اس اختلاف کا علم ہی نہیں ہے کہ یہ کیا ہے۔

قرأت خلف الامام کے مجوزین کے دلائل اور جوابات:

جو لوگ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے قائل ہیں، ان کی دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت فرمارہے تھے اور قرأت کرنے میں آپ کو دشواری ہو رہی تھی، نماز کے بعد آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کیا تم قرأت کررہے تھے؟ صحابہ نے کہا کہ ہاں یارسول اللہ، آپ نے فرمایا:

''لَا تَفْعَلُوْا اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا''

''تم اس طریقہ پر مت پڑھو سوائے ام القرآن کے، کیونکہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو اس کو نہ پڑھے''۔

یہ روایت اگرچہ صریح ہے لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو معلول قرار دیا ہے، علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے معلول کہا ہے۔۲؎

نیز حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے اور دیگر محدثین نے بھی اسے معلول قرار دیا ہے لہذا، اس سے استدلال درست نہیں ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں فصاعدا کی زیادتی بھی ثابت ہے، تو اب روایت یوں ہوگی: ''لَاصَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَءْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَصَاعِداً''

ا؎: احسن الکلام: ۱/۶۸ تا ۷۰ و ۷۱۔ ۲؎: فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲/۱۷۸۔

"اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جس نے فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور سورت نہ پڑھی ہو"۔

اس روایت سے سورۂ فاتحہ کے ساتھ ساتھ ضم سورت کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے، اب اس زیادتی کا کیا جواب ہے، جو جواب اس کا ہے وہی جواب سورۂ فاتحہ کی قرأت کا ہے۔ بلکہ حنفیہ کہتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ بنتا ہے کہ جو شخص مطلق قرأت نہ کرے، نہ سورۂ فاتحہ، اور نہ ضم سورت تو اس کی نماز نہیں ہوتی، لہذا اس حدیث کا تعلق مطلق قرأت سے ہے نہ کہ سورۂ فاتحہ سے۔

اور دوسری دلیل: "لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَءْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ" [۱]

"اس شخص کی نماز ہی نہیں ہوتی جس نے فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھی"

اس حدیث کے متعلق ہماری تحقیق یہ ہے کہ ہم اس کو امام یا منفرد پر محمول کرتے ہیں کہ امام کی نماز یا منفرد کی نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی۔

مقتدیوں کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔ کیونکہ مقتدی امام کے تابع ہوتا ہے، اور جب مقتدی امام کے تابع ہوتا ہے تو اسے قرأت کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ امام کی قرأت مقتدی کے لئے کافی ہے، جیسا کہ ایک حدیث مبارکہ اس پر دلالت کرتی ہے:

"مَنْ کَانَ لَہٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَۃُ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَاءَۃٌ" [۲]

"جن لوگوں کا کوئی امام ہو تو امام کا پڑھنا مقتدیوں کا ہی پڑھنا ہے"

قرأت کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) حقیقی (۲) حکمی۔

حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی واقعۃً پڑھے۔ حکمی کا مطلب یہ ہے کہ حقیقۃً تو قرأت نہ کی جائے لیکن وہ پڑھنے کے حکم میں ہو جائے۔ یہاں آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ

---

[۱]: صحیح بخاری: الصلاۃ/ باب وجوب القراءۃ للامام والماموم۔ [۲]: سنن ابن ماجہ: کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا / باب اذا قرأ الامام فانصتوا۔

''فاتحہ کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی'' یہ عام ہے، حقیقی قرأت کو بھی شامل ہے اور حکمی قرأت کو بھی شامل ہے،تو جب لوگ امام کے پیچھے کھڑے ہوں،امام قرأت کر رہا ہو اور مقتدی خاموش کھڑے ہوں تو ان کا امام کے پیچھے خاموش کھڑا رہنا بھی پڑھنے کے ہی حکم میں ہے،لہٰذا مقتدی اگرچہ خاموش کھڑے ہیں لیکن وہ قرأت کرتے ہوئے کھڑے ہیں،اور ان کی اور امام کی نماز فاتحہ کے ساتھ ادا ہو رہی ہے،البتہ امام کی قرأت حقیقۃً پائی جارہی ہے،اور مقتدی کی حکماً پائی جارہی ہے۔اور مقتدی کی یہ حکما قرأت کافی ہے، حقیقتاً پڑھنا ضروری نہیں ہے۔پس آپ ﷺ کے اس فرمان کے مطابق (کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی) ہمارا بھی عمل ہے۔

احناف کے دلائل:

یہ بحث تو ان روایتون کے متعلق تھی جن سے مقتدیوں کے لئے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ امام کے ساتھ سورۂ فاتحہ پڑھیں، اب مقتدی کے لئے قرأت نہ کرنے سے متعلق روایات سنئے،پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ نماز کے احکام کچھ تدریجاً آئے ہیں۔جب نماز ہوتی تھی لوگ چل پھر لیتے تھے۔نماز کے دوران سلام و دعا اور مزاج شریف کا پوچھنا بھی ہوتا تھا۔دھیرے دھیرے نماز میں سکون آتا گیا۔یہی حال تنہا نماز کے بعد جماعت کی نماز کا بھی ہوا،جماعت کی نماز کے احکام کی تفصیل بھی یہی ہے کہ پہلے لوگ امام کے ساتھ صرف جمع ہو جایا کرتے تھے،امام کے ساتھ مقتدی کی نماز بندھی ہوئی نہیں تھی۔ دھیرے دھیرے حضور اکرم ﷺ نے دوسروں کو امام کے ساتھ پابند کیا۔جن روایتوں میں یہ مضمون ہے کہ سورۂ فاتحہ مقتدی پڑھتے تھے یہ اُسی زمانے کی بات ہے۔ پھر اس کے بعد کیا واقعات ہوئے:ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نماز سے فارغ ہوئے اور دریافت فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی میرے پیچھے قرآن شریف پڑھ رہا تھا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم

میں سے کسی نے کہا کہ جی ہاں! پڑھ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ کچھ لوگ پڑھ رہے تھے کیونکہ کچھ لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی اور کچھ لوگوں کو معلوم نہیں ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ لوگ میرے ساتھ قرآن میں جھگڑ کیوں رہے ہیں؟(سنن ابی داود: کِتَاب الصَّلَاۃِ، بَابُ مَنْ کَرِہَ الْقِرَاءَۃَ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ إِذَا جَھَرَ الْإِمَامُ) کیونکہ جب ایک آدمی قرآن پڑھ رہا ہو اور دوسرا بھی پڑھنے لگے تو ایک قسم کا ڈسٹرب(Disturb)ہوجاتا ہے اور صرف زور سے پڑھنے سے ڈسٹرب (Disturb) نہیں ہوتا آہستہ پڑھنے سے بھی ڈسٹرب ہوجاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی اچھا وضو نہ کرے اور میرے پیچھے کھڑا ہو تو میری نماز میں خلل ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پیچھے قرأت مت کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ نے قرأت پر ممانعت فرمائی تھی اور صحابہ اس سے رک گئے تھے اوراس میں آپ نے علت بھی بیان کردی۔اور یہ علت جس طرح قرأت میں پائی جاتی ہے اسی طرح سورۂ فاتحہ میں بھی پائی جاتی ہے، لہٰذا فاتحہ کی بھی ممانعت اس سے ثابت ہوئی۔ پھر قرآن کریم کی ایک آیت نازل ہوگئی۔ جس کا یہ مضمون ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾[1]

”جب قرآن پاک پڑھا جائے تو سنو اور خاموش رہو“۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت خطبۂ جمعہ کے بارے میں نازل ہوئی لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ نماز ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، خطبہ ضمناً اس میں شامل ہے، جیسا کہ حافظ ابن جریر، ابنِ ابی حاتم رازی، اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مرسل روایتیں اور آثارِ صحابہ کو بیان کیا ہے، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ آیت نماز ہی کے بارے میں

[1]: الاعراف: ۲۰۴۔

نازل ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت مکی ہے، اور خطبۂ جمعہ مدینہ منورہ میں مشروع ہوا، تو کیسے یہ آیت خطبے کے بارے میں ہو سکتی ہے؟ آپ لوگ انداز کر چکے ہیں کہ قرآن پاک کے ہر ہر لفظ میں نزاکت ہے۔ ''سنو'' کہنا کافی تھا ''خاموش رہو'' کیوں کہا گیا؟ مفسرین نے فرمایا ہے کہ اگر تمہیں سنائی دے رہا ہے تو سنو اور اگر تمہیں سنائی نہیں دے رہا ہے تو خاموش رہو۔ ۱؎ اس وجہ سے بڑی جماعت ہے تو قریب والوں کو سنائی دیتا ہے اور دور والوں کو سنائی نہیں دیتا۔ کوئی آدمی دور ہے وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تو دور ہوں، مجھے سنائی نہیں دے رہا، میں کیا کروں؟ اس کے لیے یہ حکم ہے کہ اگر سنائی نہیں دے رہا ہے تو خاموش رہو۔ اور باضابطہ حضور ﷺ نے بھی منع فرما دیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ .. وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا'' ۲؎

''امام کو مقرر اسی لئے کیا گیا ہے تاکہ اُس کی اقتداء کی جائے لہٰذا.. جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔'' ایک اہم بات یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ابھی ہم بتا چکے ہیں کہ ''من صلی صلوۃ لم یقرأ فیها بأمّ القرآن فهی خداج'' کہ سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے سے نماز ناقص اور ناتمام ہوتی ہے۔

یہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ علم بعد میں ہوا اور انہوں نے اسے بتا دیا۔ پھر محدثین نے اس روایت کو نقل کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ محدثین نے ہر وہ بات جو حدیث ہونے کی حیثیت سے آئی اور صحیح سند کے ساتھ مل

۱؎: روح المعانی: ۵/ ۱۴۲۔ ۲؎: سنن ابی داود: الصلاۃ/ باب الامام یصلي من قعود۔

گئی انہوں نے جمع کر دیا۔ محدث اس سے بحث نہیں کرتا کہ یہ مقدم ہے یا مؤخر ہے، یہ کام محدث کا نہیں ہوتا بلکہ فقیہ کا ہوتا ہے۔

"وقال أحمد: ما رأيت أحداً من الفقهاء أعلم بالقرآن والسنن منه"[۱]

" امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے قرآن و سنن کے معنی کو فقہاء سے زیادہ کسی کو جاننے والا نہیں دیکھا ۔'' امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیثوں کو جمع کر دیا۔ بخاری شریف میں کئی احادیث ایسی ہیں جس پر کسی کا بھی عمل نہیں ہے حالانکہ وہ حدیث ہے مگر وہ منسوخ ہو چکی ہیں کیونکہ وہ ابتدائے اسلام میں تھیں۔ اُن کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صحیح سند کے ساتھ پہنچ گیا تو انہوں نے اسے جمع کر دیا۔ غرض یہ کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فاتحہ کے بغیر نماز نہ ہونے کے بھی راوی ہیں اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش ہو جاؤ کے بھی راوی ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ احکام تدریجاً آئے ہیں اور پہلے مسئلہ الگ تھا اور بعد میں تبدیلی آئی ہے۔

اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں۔

''اِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا'' وَاِذَا قَرَأَ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ فَقُوْلُوْا آمِيْنَ۔[۲]

"جب (نماز میں امام) تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو، اور جب قرأت کرے تو خاموش رہو اور جب غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو۔

ان روایات سے صراحۃً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام کی قرأت کے وقت مقتدی خاموش رہیں، قرأت نہ کریں۔

---

[۱]: تھذیب التھذیب: ۴/ ۱۲۱۔ [۲]: صحیح مسلم: باب التشھد فی الصلاۃ و سنن نسائی: تاویل قولہ عز وجل اذا قرئ القرآن فاستمعوا....

اس میں کچھ اصولی بحثیں ہوتی ہیں، مثال کے طور پر حدیثوں کا مضمون قرآن شریف سے نہیں مل رہا ہے تو اُس کو تطبیق یعنی ملانے کی کوشش کی جائے گی نہیں ملے گا تو چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ تو سب ہی سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید مقدم ہے اور حدیث اُس کے بعد ہے۔ قرآن شریف میں تو آگیا﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾ ”جب قرآن شریف پڑھا جائے تو سنو اور خاموش رہو“۔ اب حدیث میں کچھ بھی ہو لیکن اُسے اسی آیت پر لایا جائے گا۔ اُس کا مفہوم آیت سے متعلق نکالا جائے گا۔ اگر مفہوم نکلتا ہے تو نکالا جائے گا ورنہ اس کی کوئی تاویل کی جائے گی کہ کوئی بات ہے جس کی وجہ سے اُس پر عمل نہیں ہو سکتا، اسے علماء سمجھتے ہیں، کیونکہ اصل اس میں آیت کریمہ ہے، کیونکہ آیت نص قطعی ہوتی ہے۔ احادیث ظنی طور پر دلالت کرنے والی ہوتی ہیں، اُن کا درجہ دوسرے نمبر پر ہوتا ہے، آیت کی وجہ سے دوسری حدیثوں میں پائے جانے والے معنی ملا کر اُن حدیثوں کی توجیہ کی جاتی۔ اُن کو ملانے کے بھی کچھ ضابطے اور اصول ہیں۔ ہر زمانے میں اس مسئلے پر بحث ہوئی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں بھی بہت بحثیں ہوئی۔ کچھ لوگ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مناظرہ کرنے کے لیے گئے کہ ہم آپ سے اس مسئلے میں بحث کرنا چاہتے ہیں چونکہ اس بارے میں احادیث بہت سی موجود ہیں کہ سورۂ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنی چاہیے۔ دس پندرہ افراد اپنے اپنے دلائل دینے لگے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سب بیٹھ جاؤ اور تم میں سے جو سب سے زیادہ باصلاحیت ہو وہ مجھے اپنا مسئلہ بتائے، میں اُسے سن کر اُس کا جواب دوں گا۔ سب اس پر متفق ہو گئے کہ ایک آدمی ہماری طرف سے بات کرے گا اور ہم سب خاموش رہیں گے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جاؤ! مسئلہ حل ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! آپ نے تو کوئی بھی دلیل نہیں دی، مسئلہ کیسے حل ہو گیا؟ فرمایا کہ ہم لوگ بھی سورۂ

فاتحہ کے بارے میں یہی کہہ رہے ہیں کہ سب لوگ مل کر پڑھنا شروع مت کردو، اللہ تعالیٰ کے سامنے بے ادبی ہوتی ہے، ایک آدمی پڑھے اور سب سنیں۔

خود حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ ، فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ''[۱]

کہ امام کا قراءت کرنا مقتدیوں کا قراءت کرنا ہے۔

جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے تو یہ مقتدی خاموش ہو کر بھی پڑھ رہے ہیں۔ جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے کہ قرأت دو قسم کی ہوتی ہیں قرأتِ حقیقی اور قراءتِ حکمی۔ ایک ہے واقعتاً پڑھنا اور ایک ہے حکم کے اعتبار سے پڑھنا۔ ایک آدمی زبان سے اقرار کرے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اور ایک شخص گونگا ہے، گونگا کلمہ کیسے پڑھے گا۔ جب وہ توحید کا اشارہ کرے گا تو کلمہ پڑھنے والے کے حکم میں آجائے گا۔ گونگے کا پڑھنا باعتبار حکم کے ہے کہ اُس پر پڑھنے کا حکم لگا دیا گیا۔ اسی طرح جو مقتدی امام کے پیچھے کھڑے ہیں یہ لوگ نہ پڑھ کر بھی پڑھنے ہی کے حکم میں ہیں۔

قرأت خلف الامام کے بارے میں فیصلہ کن روایت:

اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے مرض الوفات میں آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر کو نماز پڑھانے کا حکم دیا اس سلسلہ میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

'' أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَخَذَ مِنَ الْقِرَاءَةِ مِنْ حَيْثُ اِنْتَهٰى أَبُوْ بَكْرٍ۔ قَالَ حُسَيْنٌ سَلِيْمٌ أَسَدٌ : إِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ''[۲]

---

[۱]: سنن ابن ماجہ: باب اِذا قرا الامام فانصتوا۔ [۲]: سنن ابنِ ماجہ کتاب الصلاۃ: باب ما جاء فی صلاۃ رسول اللہ ﷺ فی مرضہ، مسندِ ابی یعلیٰ: مسندِ ابنِ عباس، ۲۷۰۸ واللفظ لمسند ابی یعلیٰ۔

نبی ﷺ نے قرأت کو وہیں سے لیا جہاں پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ختم کیا تھا۔ حسین سلیم اسد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے"۔

"عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی مرضِ وفات میں ارشاد فرمایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے، اور (جب) نبی ﷺ نے (اپنی طبیعت میں) خفت اور ہلکا پن محسوس کیا تو آپ دو آدمیوں کا سہارا لیتے ہوئے نکلے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پیچھے ہوئے، آپ ﷺ نے ان کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی جگہ ٹھہرے رہیں، پس آپ آئے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ گئے، پھر سورت کی اسی جگہ سے قرأت فرمائی جہاں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ختم فرمایا تھا۔[۱]

ایک اور روایت میں آیا ہے:

"وَاسْتَفْتَحَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ حَيْثُ انْتَهَى أَبُو بَكْرٍ مِنَ الْقِرَاءَةِ"[۲]

اور نبی ﷺ نے قرأت وہیں سے شروع کی جہاں پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ختم فرمایا تھا۔

یہ روایتیں اس باب میں صریح ہیں کہ نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ ضروری نہیں ہے، کیونکہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی صراحت کے مطابق ان روایتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی قرأت کے دوران نماز میں شریک ہوئے اور اس وقت تک یا تو آپ نے سورۂ فاتحہ ختم کر کے دوسری سورت شروع کی تھی یا کم از کم سورۂ فاتحہ کی کچھ تلاوت تو ہوگئی تھی اس کے بعد آپ ﷺ نے مابقیہ حصہ پڑھا۔ ظاہر کہ پہلی صورت میں مکمل سورۂ فاتحہ ترک ہوگئی اور دوسری صورت میں کچھ نہ کچھ حصہ آپ ﷺ کا ترک ہوا، معلوم ہوا کہ آپ کی یہ آخری نمازوں میں سے ایک نماز تھی

---

[۱]: سنن دارِ قطنی: باب صفۃِ صلاۃ التطوع فی السفر الخ، ۱۵۰۱۔ [۲]: معجم طبرانی: ۱۲۴۶۷، وشرح معانی الآثار: کتاب الصلاۃ: باب صلاۃ الصحیح خلف المریض وسنن بیہقی: ۵۲۸۱، کتاب الصلاۃ: باب ما روی فی صلاۃ المأموم قائماً الخ۔

جس میں آپ نے مکمل سورۂ فاتحہ کو ترک کیا تھا یا اس کے کچھ حصہ کو لہٰذا اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ترک سے نماز فاسد نہ ہوگی۔ اگر فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہوتا تو آپ اس کو ضرور تلاوت فرماتے، جہاں تک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پڑھا تھا وہاں سے شروع نہ فرماتے۔[1] اور یہ نماز جہری ہی تھی کیونکہ جب راوی کہتے ہیں کہ آپ نے وہیں سے قرأت شروع کی جہاں تک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پڑھا تھا تو اس سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ جہری نماز تھی نہ کہ سرّی۔

ترکِ قرأت خلف الامام ۸۰ صحابۂ کرام سے ثابت ہے:

اس طرح کے مختلف فیہ مسائل میں صحابۂ کرام کا مسلک اور ان کا عمل بھی کافی اہمیت اور فیصلہ کن درجہ رکھتا ہے، اس لئے اگر آثارِ صحابہ کو دیکھا جائے تو حنفیہ کا مسلک راجح اور باوزن معلوم ہوتا ہے، علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ترک قرأت خلف الامام ۸۰ صحابۂ کرام سے ثابت ہے، جن میں خلفاء راشدین، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔

نیز علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن اسلم کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ دس صحابۂ کرام سختی کے ساتھ امام کے پیچھے قرأت سے منع کرتے تھے، جن میں خلفاء راشدین، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ ابن

---

[1] شرحِ مشکل الآثار: باب ماروی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الصلاۃ التی سماھا خداجا ماھی؟ وما حکمھا فی ذالک الخ۔ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے اس کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی دوسری اور چھٹی جلد میں تصحیح و تحسین کی ہے۔ (فیض الباری: ۱/۴۳۶)

عباس رضی اللہ عنہ حضرت سعد ابن ابی وقاص، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں۔[۱]

ایک اور بات سمجھنے کی کوشش کریں کہ اگر ہم اُن حدیثوں کی وجہ سے جس میں سورۂ فاتحہ کے عام پڑھنے کا حکم دیا گیا" اگر ان پر عمل کریں گے تو یہ احادیث جس میں منع کیا گیا ہے چھوڑ دینی پڑیں گی، یوں سمجھئے کہ ہم نے ایک حدیث اختیار کی اور بقیہ حدیثیں چھوڑ دیں۔ لیکن اگر آپ امام کے پیچھے نہیں پڑھتے ہیں تو" جب امام قرأت کرے تو خاموش رہو " امام کا پڑھنا تمہارا پڑھنا ہے۔" ان احادیث پر بھی عمل ہوا اور جو سورۂ فاتحہ کے پڑھنے سے متعلق احادیث ہیں اگر منفرد ہو تو براہ راست عمل ہوا اور اگر امام کی اقتدامیں ہو تب بھی اُن پر عمل ہوا کیونکہ یہ بھی حکماً پڑھ رہا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں یہ جامعیت ہے کہ عمل کے اعتبار سے پوری حدیثیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اصل عامل بالحدیث مقلدین ہیں، غیر مقلدین عامل بالحدیث نہیں ہوتے۔ اگر آپ میں سے کوئی ہو تو بُرا ماننے کی بات نہیں، میں نے جو پڑھا ہے وہ آپ لوگوں کو سنا رہا ہوں۔ عمل بالحدیث تقلید کرنے والوں کا کام ہے۔ اہلِ حدیث کا کام عمل بالحدیث نہیں ہے، آپ لوگ یہ اچھی طرح لکھ لیجیے۔ یہ دعویٰ بالدلیل ہے کیونکہ حدیث ایک نہیں ہے۔ بعض مرتبہ پچیس تیس احادیث سامنے رکھنے کے بعد ایک مسئلہ بنتا ہے۔ اب یہ روایتیں آپ لوگ جمع کریں گے تو بہت سی ہو جائیں گی۔ وہ حدیث جس میں مقتدیوں کے لیے امام کے پڑھنے کو کافی بتایا گیا وہ اپنی جگہ اور قرآن پاک کی وہ آیت جس میں قرآن پاک کی تلاوت کی جائے تو سننے کا حکم دیا گیا وہ اپنی جگہ، ان ساری حدیثوں سے یہ مفہوم نکلتا ہے

---

[۱] عمدۃ القاری: باب وجوب القراءۃ للإمام والمأموم فی الصلوات کلھا فی الحضر والسفر۔

کہ جب آپ تنہا نماز پڑھ رہے ہوں تو سورۂ فاتحہ پڑھو، جب آپ امامت کر رہے ہوں تو سورۂ فاتحہ پڑھو، جب آپ اقتداء کر رہے ہوں تو اس صورت میں آپ سورۂ فاتحہ نہ پڑھو بلکہ امام کے پڑھنے پر قناعت کرلو، یہی آیتِ قرآنی، احادیث شریفہ، آثارِ صحابہ اور عملِ صحابہ سے ثابت ہوتا ہے۔

یہ میں نے ایک صاحب کی درخواست پر کچھ بات آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اب لوگ آپ سے اُلجھیں گے، اس میں غیر عالم کے لیے ایک قاعدہ یاد رکھنے کا ہے کہ کبھی بھی بحث نہ کریں کیونکہ بحث کرنے والا خود شک میں آئے گا اور دوسرے کو مطمئن نہیں کرسکے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہیں آپ بحث کریں گے تو اُس کی باتوں میں آجائیں گے لہٰذا اس کو روکا جارہا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ آدمی کی کسی بھی مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے جو صلاحیت اور مواد درکار ہے وہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا جب صلاحیت اور مواد نہ ہو تو وہ لاجواب ہوگا یا شک میں آجائے گا۔ اس لیے ہر اختلافی مسئلہ میں جو ہمارے معتمد علماء ہیں اُن سے مسئلہ پوچھ کر عمل کرلیا کریں۔ بقیہ اس کی تفصیلات علماء کرام سے معلوم کرلیں۔ ایک اور بات یہ ذہن میں رکھیں کہ دیگر ائمہ ساتھ بدگمانی نہ کریں، کیونکہ وہ اپنی جگہ مخلص ہیں، انہوں نے بھی حدیثوں کو دیکھ کر عمل کیا ہے۔، ہم اُن کی اتباع بھی نہیں کرسکتے کیونکہ ہماری تحقیق کے اعتبار سے وہ مسئلہ صحیح نہیں ہے۔ ہم اُن سے بحث بھی نہیں کریں گے، ہم کہیں گے کہ ہم نے اپنے علماء سے مسئلہ پوچھا ہے اور ہم اُس پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ صحیح، سالم اور سیدھا راستہ ہے۔

❀❀❀

حمد کے معنی

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ"۔

"تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا ہے سارے جہانوں کا"

"حمد" کے معنی "تعریف" کے ہیں۔ اور اصطلاح میں حمد کہتے ہیں:

"هُوَ الثَّنَاءُ عَلٰى قَصْدِ التَّعْظِيْمِ سَوَاءٌ تَعَلَّقَ بِالنِّعْمَةِ أَوْ بِغَيْرِهَا"[۱]

زبان کے ذریعہ تعظیم کے طور پر تعریف کرنا خواہ اس کا تعلق نعمت کے ساتھ ہو یا غیرِ نعمت کے ساتھ"۔

اسی کے قریب ایک اور لفظ "شکر" بھی ہے، اس کے معنی بھی تعریف ہی کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے:

"وَالشُّكْرُ فِعْلٌ يُنْبِئُ عَنْ تَعْظِيْمِ الْمُنْعِمِ لِكَوْنِهٖ مُنْعِمًا سَوَاءٌ كَانَ بِاللِّسَانِ اَوْ بِالْجِنَانِ اَوْ بِالْاَرْكَانِ"[۲]

اور شکر وہ ایسا فعل ہے جو منعم کی تعظیم کو بتلاتا ہے اس کے منعم ہونے کی وجہ سے، خواہ وہ زبان سے ہو یا دل سے ہو یا ارکان سے ہو۔

حمد اور شکر میں فرق

(۱) حمد اور شکر دونوں میں تعریف ہوتی ہے لیکن حمد میں کمال اور تعظیم کی بنیاد پر تعریف ہوتی ہے، کسی کے صرف احسان کے بدلہ تعریف نہیں ہوتی، اور شکر میں احسان کے بدلہ تعریف ہوتی ہے۔

(۲) حمد صرف زبان سے ہوتی ہے، اور شکر زبان سے بھی ہوتا ہے، دل سے بھی ہوتا ہے اور دیگر اعضاء سے بھی ہوتا ہے۔

۱: مختصر المعانی:۴۔ ۲: مختصر المعانی:۴۔

(۳) شکر ظاہری نعمتوں پر کیا جاتا ہے، جبکہ حمد باطنی نعمتوں پر کی جاتی ہے۔

حمد اور مدح میں فرق:

حمد اور شکر کے ساتھ ایک لفظ مدح کا بھی استعمال ہوتا ہے، اس کے معنٰی بھی تعریف ہی کے ہیں، لیکن اس میں اور حمد میں علماء نے کئی فرق بیان کئے ہیں۔

(۱) فرق یہ ہے کہ حمد اختیاری خوبی اور ذی علم پر کی جاتی ہے، جبکہ مدح اختیاری اور غیر اختیاری، ذی علم اور غیر ذی علم دونوں پر کی جاتی ہے۔ اور بقول بعض مدح غیر اختیاری خوبی پر کی جاتی ہے۔

(۲) حمد میں دوسرے کی خوبیاں محبت اور تعظیم کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں، جبکہ مدح میں محض خوبی بیان کی جاتی ہے۔

(۳) حمد مامور بہ ہے جب کہ مدح مامور بہ نہیں اور کبھی منہی عنہ بھی ہوتی ہے۔

(۴) مدح حیّ اور غیر حیّ دونوں کے لئے ہوتی ہے لیکن حمد نہیں۔[۱]

(۵) مدح احسان سے پہلے اور احسان کے بعد ہوتی ہے، اور حمد احسان کے بعد ہوتی ہے۔[۲]

حمد کے فضائل:

احادیثِ مبارکہ میں نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کے کافی فضائل بیان فرمائے ہیں، ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا:

”وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَآنِ (أَوْ تَمْلَأُ) مَا بَیْنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ“[۳]

” الحمدللہ اعمال کے آدھے ترازو کو نیکیوں سے بھر دے گا۔ اور سبحان اللہ اور الحمدللہ آسمان وزمین کے درمیان کو بھر دے گا۔

۱: اللباب:۱/۱۔ ۲: تفسیر خازن:۱/۱۔ واضح رہے کہ بعض علماء نے ان کی تعریفات اس کے برعکس بھی کی ہیں۔ ۳: صحیح مسلم: کتاب الطھارۃ/باب فضل الوضوء۔

سبحان اللہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت سے بہتر ہے:

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک قصہ ہے۔ وہ ایک مرتبہ تختِ شاہی پر کہیں جا رہے تھے۔ ایک کاشت کار نے انہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی بادشاہت عطا فرمائی ہے کہ ہَوا بھی ان کو لے کر چلتی ہے، یہ دیکھ کر اُس شخص نے کہا ''سبحان اللہ''، یہ بات ہوا نے سلیمان علیہ السلام تک پہونچا دیا، سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ اس بندہ کو میرے پاس لے آؤ۔ اب وہ شخص پریشان ہو گیا کہ پتہ نہیں ایسا میں نے کیا کر دیا، نہ میں نے کوئی حرص کی اور نہ کوئی لالچ کی بلکہ میں نے تو اللہ تعالیٰ کی تعریف کی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُس سے پوچھا کہ تم نے کیا کہا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں نے یہ کہا تھا۔ فرمایا کہ تم نے جو سبحان اللہ کہا ہے اس کا ثواب قیامت کے دن سلیمان کی سلطنت سے بھی بہت بڑا ہے۔[۱]

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سبحان اللہ نصف المیزان یعنی اعمال کے ترازو کا آدھا پلڑا نیکیوں سے بھر دیتا ہے۔

الحمد للہ افضل ذکر اور افضل دعا ہے:

ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اَفْضَلُ الدُّعَاءِ''[۲]

''الحمد للہ افضل دعا ہے'' اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا دعا ہی ہے۔ ایک دوسری روایت میں الحمد للہ کو افضل ذکر بھی کہا گیا ہے۔[۳]

الحمد للہ شکر کی اصل ہے:

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

''اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّکْرِ مَا شَکَرَ اللّٰہَ عَبْدٌ لَا یَحْمَدُہٗ''[۴]

---

[۱]: الدر المنثور: ۶/۴۳۱۔ [۲]: مستدرکِ حاکم: کتاب الدعاء و التکبیر والتھلیل و التسبیح و الذکر۔ [۳]: شعب الایمان: ۴/۹۰، رقم حدیث: ۴۳۷۱۔ [۴]: روح المعانی: ۱/۴۳۔

الحمد للہ شکر کی اصل ہے، جو بندہ اللہ پاک کا شکر نہیں کرتا ہے، تو وہ اللہ کی حمد بھی نہیں کرتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی اونٹنی گم ہوگئی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ پاک میری اونٹنی لوٹا دیں تو میں ضرور اللہ پاک کا شکر کروں گا، وہ اونٹنی ایک عورت کے ہاتھ لگ گئی، عورت اس کو لے کر مدینہ طیبہ حاضر ہوئی، صحابہ اس کو دیکھ کر خوش ہوئے اور آپ کے پاس لے کر آئے، آپ نے اس کو دیکھ کر الحمد للہ کہا، صحابہ انتظار میں کھڑے رہے کہ شاید آپ نماز پڑھیں گے یا روزہ رکھیں گے، لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا، صحابہ نے گمان کیا کہ شاید آپ بھول گئے، اس لئے کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے کہا تھا کہ اونٹنی ملنے پر شکر ادا کریں گے، لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا، تو آپ نے فرمایا کہ کیا میں نے الحمد للہ نہیں کہا؟!۱

اب آپ اندازہ لگائیں کہ اس کلمہ کی کتنی اہمیت ہے اور شکر کی ادائیگی میں اس کا کتنا مقام ہے؟۔

حضرت حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

"إِذَا قُلْتَ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن"، فَقَدْ شَكَرْتَ اللّٰهَ"۲

جب تم نے الحمد للہ کہہ دیا تو تم نے اللہ کا شکر ادا کر دیا۔

اللہ پاک کو حمد سے زیادہ کوئی چیز پسندیدہ نہیں:

ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

"لَيْسَ شَيْءٌ أَحَبَّ إِلَيْهِ الْحَمْدِ، مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى، وَلِذٰلِكَ أَثْنٰى عَلٰى نَفْسِهٖ فَقَالَ: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ"۳

۱: الدر المنثور: ۱/۱۔ ۲: تفسیرِ طبری: ۱/۱۳۶۔ ۳: تفسیرِ طبری: ۱/۱۳۶۔

اللہ کے نزدیک حمد سے زیادہ کوئی چیز پسندیدہ نہیں ہے، اسی وجہ سے اللہ پاک نے اپنی تعریف کی اور فرمایا ''الحمد للہ''۔

حضور پاک ﷺ نے ''الحمد للہ'' کہنے کی بڑی تعلیم فرمائی ہے۔ ہر موقع اور ہر حال میں الحمد للہ ہی کہنا چاہیے۔ کئی سال تک حضور ﷺ نے محنت فرمائی، پوری جد وجہد کی، پوری قربانی دی، اسلام کو غالب فرمادیا۔ عرب میں اسلام کو غالب کرنا یہ سمجھ سے باہر ہے۔ عرب کے مزاج میں، وہاں کے صفات میں، وہاں کے تمدن میں ایک آدمی کا تنہا محنت کر کے اسلام کو غالب کر دینا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد حضور اکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں فاتح ہونے کی حیثیت سے داخل ہو رہے ہیں تو آپ اپنی زبان مبارک سے یہ کلمات ادا فرماتے ہوئے داخل ہو رہے ہیں:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ، وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ''[۱]

''اس اللہ کے لیے تعریف ہے جو تنہا ہے، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور تنہا اس نے سارے لشکروں کو شکست دی''۔ (ہم نے کچھ نہیں کیا)۔

یہ تو حضور ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا یہ آپ کو سنا دیتا ہوں۔ مشہور قول کے موافق سب سے آخر میں اُترنے والی سورت ''سورۃ النصر'' ہے، اللہ پاک نے فرمایا:[۲]

﴿ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ، وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴾

''جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح (حاصل ہوگئی) اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے ہیں، تو آپ اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح بیان کیجئے اور اس سے مغفرت مانگیے، بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔

---

[۱]: سنن نسائی: کتاب القسامۃ / ذکر الاختلاف علی خالد الحذاء۔ [۲]: صحیح مسلم: کتاب التفسیر۔

ایسے موقع پر ہمارے ہاں جشنِ اعترافِ خدمت چلتا ہے کہ فلاں کا یہ کارنامہ ہے، اُس کا جشن مناؤ۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ حضور ﷺ کی خدمات کا جشن منایا جائے۔ لیکن قرآن پاک میں یہ بتایا گیا کہ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ تم اپنے پروردگار کی حمد بیان کرو، یہ سب اللہ نے کیا جتنا کچھ ہوا۔

ہر کمال اللہ کا عطا کردہ ہے:

کیونکہ جو کمال آدمی کے اندر موجود ہے یا کوئی خوبی اس کے پاس ہے تو وہ سب اللہ ہی کی عطا کردہ ہے، اُس کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو ''میں'' ہے کہ ''یہ میں نے کیا، یہ میں نے کیا'' اس نے تو پوری دنیا میں ہم مسلمانوں کا ستیاناس کر دیا۔ ہمارے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا، کرنے والی ذات صرف ایک اللہ کی ہے۔ ہم کو قرآن کریم کے پہلے جملے میں یہ سبق دیا گیا کہ حمد، اللہ کی ہونی ہے، کیونکہ جو بھی خوبی ہے وہ اللہ ہی کی ہے، بندہ کا اس میں کچھ دخل نہیں۔

لفظِ حمد میں دراصل توحید کا سبق ہے:

''الحمد للہ'' میں دراصل توحید کا ذہن بنتا ہے، اپنی ذات کی نفی اس سے ہوتی ہے، مخلوق کی نفی اس سے ہوتی ہے، جب آدمی نے مخلوق کی نفی کر دی کہ مخلوق کچھ بھی نہیں اور جو بھی ہے وہ اللہ ہی کا عطا کردہ ہے تو اُس کا دماغ مخلوق سے ہٹ کر خالق کی طرف چلا جاتا ہے، اُس کے اندر بندگی آجاتی ہے اور وہ تمام سطحی چیزوں سے اوپر ہو جاتا ہے۔ آپ لوگوں کے علم میں ہونا چاہیے کہ جتنی جدید تحقیقات ہیں ان سب سے اللہ پاک کی توحید کا مضمون اور اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ اسلام نے یہ بتایا کہ سب چیزیں مخلوق ہیں اور وہ تمہاری خدمت کے لیے ہیں، تم تمام مخلوق میں سب سے بڑی اور افضل مخلوق

ہو، چاند، سورج اور ستارے یہ بظاہر بڑے ہیں، لیکن وہ تمہارے کام کے لئے بنائے گئے ہیں، تمہارے لئے مسخر کئے گئے ہیں، تم اُسے دیوتا سمجھ رہے ہو، یہ سب کی سب مخلوق ہیں، یہ تو اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کو بتانے والے ہیں، لیکن تم نے انہیں ہی معبود بناڈالا، اب جب تم نے اس پر قدم رکھا تو وہاں رب ذوالجلال کی وحدانیت سمجھ میں آئی، اس کی کاریگری نے اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

حضرت صوفی غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ:

ہمارے والد صاحب (صوفی غلام محمد صاحب) رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سبحان اللہ، الحمدللہ، لاالٰہ الا اللہ یہ اسلام کے گُر ہیں۔ یعنی پوری بحث کو ایک ایک جملے میں پرو دیا گیا ہے۔ ہر چیز سے مخلوق کی نفی ''سبحان اللہ'' میں ہے۔ سب کچھ کرنے والے اللہ ہیں، اس کا بیان ''الحمدللہ'' میں ہے، اس لیے آدمی کو ''سبحان اللہ'' کہنے سے آدھا ثواب ملتا ہے (نصف المیزان) اور ''الحمدللہ'' کہنے سے پورا مل جاتا ہے۔

ان جملوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے توحید سکھلائی، ذہن بنایا، ہماری فکر بنائی، اور اپنا تعلق ہمیں نصیب فرمایا، اس لئے ہر وقت سورۂ فاتحہ کے اس کلمہ کا ورد رکھنا چاہئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ بندہ ایک لقمہ کھائے تو الحمدللہ کہے اور ایک گھونٹ پانی پیئے تو الحمدللہ کہے۔ کھانا کھانے کے بعد جو دعا ہمیں سکھلائی گئی اس میں بھی الحمدللہ ہی ہے، اور درمیان میں بھی آدمی کو الحمدللہ ہی پڑھنا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی نعمت آدمی کو ملتی ہے تب بھی الحمدللہ ہی کہنا ہے۔ اگر کسی پر نعمت کا ظہور ہو تو وہاں ماشاء اللہ (جو اللہ نے چاہا) کہنا ہے، اس لیے کہ یہ تمہاری نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے تمہیں ملی ہے، یعنی خدا نے جو چاہا وہ تمہیں دیا، تاکہ لینے والا دینے والے کی طرف سے نظر ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف کرلے۔

یہ "ماشاءاللہ"، "الحمدللہ"، "سبحان اللہ" اور "بسم اللہ" دیکھنے اور کہنے میں معمولی (آسان) الفاظ ہیں، لیکن یہ ہمارے لئے بڑے کارآمد، فائدہ مند اور انتہائی ثواب کا باعث ہیں۔

توحید جنت کا اور الحمدللہ جنت کی نعمتوں کا ثمن ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے:

"اَلتَّوْحِيْدُ ثَمَنُ الْجَنَّةِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ ثَمَنُ كُلِّ نِعْمَةٍ، وَيَتَقَاسَمُوْنَ الْجَنَّةَ بِأَعْمَالِهِمْ"[۱]

"توحید جنت کا ثمن ہے، اور الحمدللہ جنت کی تمام نعمتوں کا ثمن ہے، لوگوں کو جنت میں ان کے اعمال کے اعتبار سے نعمتیں تقسیم کی جائیں گی۔

الحمدللہ داڑھ، کان اور پیٹ کے درد کے لئے شفا ہے

مَنْ قَالَ عِنْدَ كُلِّ عَطْسَةٍ سَمِعَهَا(اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ) عَلٰى كُلِّ حَالٍ مَّا كَانَ . لَمْ يَجِدْ وَجَعَ الضَّرْسِ وَالْأُذُنِ أَبَداً۔[۲]

جو آدمی ہر چھینک کے سننے کے وقت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" علی کل حال ما کان کہتا ہے تو وہ کبھی بھی داڑھ اور کان کا درد نہیں پائے گا۔ بعض روایات میں پیٹ، کوکھ اور سر کے درد سے شفا کا تذکرہ ہے۔

بظاہر اس سورہ کے پہلے کلمہ میں اللہ کی تعریف ہے، لیکن اس میں لوگوں کی بد عملی کا بھی علاج ہے اور بد عقیدگی کا بھی، نیز یہ بندوں کے امراض کے لئے شفا بھی ہے۔

نظم قرآن کی فصاحت و بلاغت:

اللہ پاک نے یہاں جو کلمات استعمال فرمائے ہیں اگر وہاں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ ہوتا تو اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً الحمد کی جگہ پر الشکر کہا جائے تو وہ فائدہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حمد کے معنی ہیں تمام اعتبار سے لائقِ تعریف ہونا اور اختیاری

---

[۱]: الدر المنثور: ۱/۲۔ [۲]: الادب المفرد: باب العطاس: باب من سمع العطسۃ یقول الحمد للہ۔

کمالات پر کسی کی خوبی اور تعریف کرنا اور اس تعریف میں بھی عظمت اور محبت کا پہلو غالب ہونا، اور شکر میں یہ چیزیں نہیں ہوتیں، کیونکہ شکر کا مطلب ہے احسان کی وجہ سے کسی کی تعریف کرنا، اس سے ظاہر ہے کہ حمد کا جو مفہوم و مطلب ہے وہ شکر سے ادا نہیں ہو سکتا، ایسے ہی یہاں حمد کے بجائے مدح بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ مدح اور حمد میں بھی فرق ہے، جیسا کہ گذر چکا ہے۔ لیکن اُردو میں ان سب کیلئے ''تعریف'' کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی میں یہ بات نہیں ہے۔ عربی میں ''تعریف'' کے لیے مدح کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اور حمد کا بھی۔ لیکن اختیاری کمال کے لیے ''حمد'' کا لفظ آتا ہے اور غیر اختیاری خوبی کے لیے ''مدح'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ موتی میں چمک زیادہ ہے تو آپ اس کی تعریف کریں گے۔ اُردو میں لفظ ''تعریف'' کہیں گے مگر عربی میں اُس کے لیے ''حمد'' اور شکر نہیں استعمال کریں گے بلکہ ''مدح'' استعمال کریں گے۔ گلاب کی پنکھڑی دیکھ کر آپ کی طبیعت مچل گئی کہ کیا اس میں نزاکت ہے! اور کیا اس میں لطافت ہے! کیا اس میں خوبصورتی ہے! عربی میں ایسی تعریف کے لیے ''مدح'' کا لفظ ہے، یہاں ''حمد'' کا لفظ استعمال نہیں ہوگا۔ یہ پھول کی ''مدح'' ہو رہی ہے، پھول کی ''حمد'' نہیں ہو سکتی، موتی کی ''حمد'' نہیں ہو سکتی، یاقوت و زمرد کی ''حمد'' نہیں ہو سکتی، کسی حسینہ و نازنین کی ''حمد'' نہیں ہو سکتی، چاند و سورج کی وسعتوں کی ''حمد'' نہیں ہو سکتی، پہاڑوں اور دریاؤں کی ''حمد'' نہیں ہو سکتی، یہ سب ''مدح'' کے ذیل میں آئیں گے۔ لفظ ''حمد'' میں جو بات ہے وہ نہ شکر میں ہے اور نہ مدح میں، کیونکہ ''حمد'' کا استعمال اختیاری کمال پر عظمت اور محبت کے ساتھ ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ شانہ ہی کے پاس اختیاری کمالات ہیں اور انہی کی تعظیم کی جا سکتی ہے اس لئے لفظ حمد ہی یہاں مناسب ہے۔

اس کے بعد ''للہ'' ہے۔ ''اللہ'' کے بجائے اگر ''غفور'' یا کوئی اور اسم مبارک ہوتا کہ سب تعریفیں غفور کے لیے ہیں، تو اس میں وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا جو اسم اللہ سے ہوتا ہے، کیونکہ تعریف کے لیے کمالات کا آنا ضروری ہے اور ''اللہ'' کہتے ہیں اُس ذات کو جو

جامع کمالات ہو۔ ''غفور'' اُس ذات کو کہتے ہیں جو خوب معاف کرنے والی ہو۔ صرف معاف کر دینا تمام صفات کو جامع نہیں ہوا۔ اس لئے اسمِ اللہ ہی یہاں مناسب ہے، اب آپ تھوڑا غور کیجئے کہ اس کلام کا ایک ایک لفظ کتنا عجیب و غریب ہے؟ کتنا دقیق ہے اس کے اندر کتنے معانی مضمر ہیں، یہی کلامِ پاک کا اعجاز ہے۔

ہر خوبی اللہ کی عطا کردہ ہے:

پس ''الحمد'' کا مطلب یہ ہے کہ جتنی خوبیاں، جتنی تعریف، جتنی ستائش، کائنات کے بننے سے لے کر آج تک، جہاں کہیں بھی ہو، جو کچھ بھی ہو، وہ سب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ خوبی اور تعریف کسی اور کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی خوبی ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کا مظہر ہے، اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، وہ کسی اور کا نہیں ہے، اُس کے پیچھے اللہ تعالیٰ ہی کی کار فرمائی ہے۔

جیسے اگر کوئی آدمی کسی بہترین قسم کے آرٹ (Art) یا کسی تعمیر یا کسی اور چیز کو دیکھے تو بے ساختہ اس کی تعریف کرتا ہے، یہ تعریف اصلاً اس چیز کی نہیں ہوتی بلکہ اس کے بنانے والے کی ہوتی ہے۔

جب آپ پتّے کی تعریف کریں گے تو اصل میں وہ پتہ بنانے والے کی تعریف ہوگی۔ کسی پھول کی تعریف کریں گے تو پھول کی نہیں بلکہ پھول بنانے والے کی تعریف ہوگی۔ کسی خوبصورت منظر کی آپ تعریف کریں گے تو یہ تعریف منظر کی نہیں بلکہ منظر بنانے والے کی تعریف ہوگی۔

حق تعالیٰ شانہ نے کائنات کا مستحکم اور مضبوط نظام بنایا ہے، چاند و سورج کا نظام بنایا، قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾[۱]

''اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ (خدائے) غالب اور دانا کا (مقرر کیا ہوا) اندازہ ہے۔''

۱؎ یس:۳۸۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں سے پندرہ کروڑ کلومیٹر دور سورج بنایا، یہ سورج اتنا بڑا ہے کہ اگر اس کو اندر سے کھوکلا کر کے خول بنایا جائے تو اُس کے اندر ہماری زمین جیسی تین لاکھ پچیس ہزار پانچ سو زمینیں سما سکتی ہیں، (قرآن اور سائنسی انکشافات:۱۰۸) اور اُس کے سپورٹ میں نیچے کوئی پلر بھی نہیں ہے، بغیر پلر کے وہ گھوم رہا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس میں گرمی بھی رکھی ہے، اور اس کو ایسا سیٹ کیا ہے کہ اگر اس کو زمین کے سامنے کر دیا جائے تو زمین پر اتنی گرمی ہو جائے گی کہ لوگ زندہ نہ رہیں۔ اگر تھوڑا سا پیچھے کر دیا جائے تو زمین پر اتنی گرمی نہیں آئے گی جتنی گرمی زمین پر چاہیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُس کے ساتھ چاند کا نظام بنایا۔ اور اس میں بھی کچھ خصوصیات رکھی ہیں، ان کا مستقل ایک نظام کے تحت چلنا، گردش کرنا، ان کے اندر گرمی اور ٹھنڈک کی صفات کا ہونا یہ ان کا ذاتی کمال نہیں۔ بلکہ یہ سب اللہ نے کیا ہے اس لئے تعریف اللہ اور عبادت اللہ ہی کی ہونی ہے۔

غیر مسلموں نے یہ سوچا کہ جب چاند اور سورج مخلوق کو اتنا نفع دے رہے ہیں تو یہ واقعی پوجے جانے کے قابل ہیں۔ لہٰذا اسے پوجنے لگے، جن لوگوں کے پاس نبیوں اور رسولوں کی تعلیمات نہیں پہنچی وہ اُن کے سامنے جھک گئے اور ان کی پرستش شروع کر دی، پانی کو دیکھا کہ یہ ایسی طاقتور مخلوق ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تو پانی کی پرستش شروع کر دی۔ درختوں کو دیکھا کہ کیسے کیسے درخت ہیں؟ کیا کیا ان کی خوبیاں ہیں، ان سے کیسے کیسے منافع حاصل ہو رہے ہیں؟ بس اُن کو پوجنا شروع کر دیا۔ یعنی ہر وہ چیز جس میں کوئی نفع نظر آیا اُس کو پوجنا شروع کر دیا اور ہر وہ چیز جس میں نقصان نظر آیا اُس کو بھی پوجنا شروع کر دیا۔ کون سی ایسی چیز ہے جس کو غیر مسلم نہیں پوجتے؟ یہ لوگ اس لیے پوجتے ہیں کہ اس میں انہیں نفع نظر آ رہا ہے، اور سمجھتے ہیں کہ جہاں سے نفع آ رہا ہے اُس کو پوجنا چاہیے۔

ہمیں بتایا گیا کہ یہ چیز جو تمہیں محسوس ہو رہی ہے یہ اللہ کی جانب سے ہے لہٰذا اللہ ہی کی تعریف کرنی چاہیے۔ جس اللہ کے لیے تعریف ہو گی اُسی اللہ کی عبادت بھی ہو گی۔ حق تعالیٰ شانہ، نے پہلے ہی جملے میں مسلمانوں کو یہ سبق دے دیا کہ تعریف در اصل میری ہونی ہے، کیونکہ میں ہی ہر چیز کا بنانے والا ہوں۔ اور میں ہی اس میں نفع اور نقصان رکھنے والا ہوں۔

باری تعالیٰ کی حمد کیوں؟

الحمد للہ میں جب اللہ پاک نے اپنی تعریف کرنے کے لئے کہا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ تعریف اللہ کی کیوں کرنی ہے؟ اس کا جواب اللہ پاک نے اسی آیت میں دیا ہے، اور وہ ہے ”ربّ العالمین“، ساری تعریف اللہ کے لیے کیوں ہے؟ اس واسطے کہ وہ اللہ ہے، اور اللہ کہتے ہیں ایسی ذات کو جو تمام صفاتِ کمال کی جامع ہو۔ اور حقیقۃً تعریف اُسی کی ہوتی ہے جس میں صفاتِ کمالیہ ہوں۔ اور اللہ پاک کا کمال کیا ہے؟ اسے اگلے جملے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ساری مخلوقات اور سارے عالموں کا پیدا کرنے والا اور ان کو پالنے والا ہے، اور پالنا اور تربیت کرنا اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس میں صفاتِ کمالیہ ہوں، اور اللہ ہی کے اندر صفاتِ کمالیہ ہیں (جیسا کہ اس کی وضاحت آگے رہی ہے) اس لئے تعریف بھی اسی کی ہو گی، پھر سوال پیدا ہوا کہ وہ کیوں ایسا کرنے والا ہے؟ اس کا جواب اگلے جملے میں ہے، اس لئے کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہ کسی مجبوری یا کسی دباؤ یا کسی کی زبردستی کی وجہ سے نہیں پالتا بلکہ محض اپنی رحمت اور مہربانی سے پالتا ہے، اس کی مشیت اور ارادہ ہوا کے میں اپنی مخلوق کو پیدا کر کے انہیں پالوں اس لئے وہ پالتے ہیں۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا احسان مخلوق کے پیدا ہونے سے پہلے سے ہے، کسی نے اللہ پاک سے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ ہمیں وجود دے دیجیے اور نہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا حق تھا، حق تعالیٰ نے محض اپنی مہربانی اور رحم و کرم سے ہمیں پیدا کر دیا۔ اس لیے ”ربّ العالمین“ کے ساتھ فرمایا کہ وہ رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔

صفتِ رب کی تشریح:

﴿رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾

جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

ربّ کے معنٰی ہیں پالنا اور تربیت کرنا۔ یعنی کسی بھی مخلوق کو وجود دینے کے بعد اُس کو دھیرے دھیرے آگے بڑھانا، ایسا نہیں ہے کہ مخلوق اپنی طرف سے خود بخود بڑھ گئی۔ پانی خود بن گیا اور بڑھ گیا، زمین خود پھیل گئی، پہلے خدا نے زمین کا بلبلہ پانی پر نمودار فرمایا پھر خود ہی زمین کو دھیرے دھیرے بڑھاتے بڑھاتے اس موجودہ شکل تک پہنچا دیا۔ ہر مخلوق میں باری تعالیٰ کا یہی نظام ہے، خواہ حیوانات ہوں یا نباتات ہوں یا کچھ اور ہوں۔ وہ سب کے رب ہیں، اور سب کو اسی نظامِ ربوبیت کے تحت چلاتے ہیں۔

ربوبیت کے لئے لازمی صفات:

ربّ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ حیّ (باحیات) ہو، مکون ہو، اُس کے پاس علم ہو، ارادہ ہو، قدرت ہو، سماعت ہو، بصارت ہو، کلام ہو۔

جس میں یہ صفات ہوں گی وہی ربّ ہو گا۔

مطلب یہ ہے کہ مُردہ کسی کی کیا ضرورت پوری کر سکتا ہے جبکہ وہ خود زندگی کا محتاج ہے۔ ہاں اگر زندہ بھی ہے لیکن جانتا نہیں تو کیسے اس کی ضرورت پوری کرے گا؟ کیسے اس کی مدد کرے گا؟ کیسے اس کی تربیت کرے گا؟ اگر جانتا بھی ہے لیکن ارادہ نہیں کرتا ہے تب بھی ضرورت پوری نہیں ہو گی۔ جیسے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہیں کہ فلاں صاحب مقروض ہیں، فلاں پریشان حال ہیں، فلاں بیمار ہیں، لیکن اُس کی مدد کرنے کا ارادہ نہیں کرتے، اس لئے ارادہ بھی

ضروری ہے، کوئی زندہ بھی ہے، ارادہ بھی کرتا ہے، جانتا بھی ہے، لیکن اس کے پاس قدرت نہیں ہوتی۔ تب بھی ضرورت کی تکمیل نہیں ہو گی، ایسے بہت سے لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ کوشش کریں لیکن اُن کے پاس قدرت نہیں ہے۔ بوسنیا میں لوگ پریشان ہیں۔ کتنے آدمیوں کے دل میں یہ تڑپ ہوتی ہے کہ اگر اُن کے لیے ہم سے کچھ ہو سکے تو ہم کریں، لیکن ان کے پاس اس کی قدرت نہیں، اس لئے قدرت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد صفتِ سماعت اور صفتِ بصارت کا ہونا بھی ضروری ہے، ان صفات کے بغیر کوئی رب نہیں ہو سکتا۔ سوائے اللہ کے کوئی ایسا نہیں ہے جس میں یہ صفات جمع ہوں، اس لئے سب کے رب وہی ہیں، سب کی ضرورتوں کی تکمیل کرنے والے وہی ہیں۔

ضرورت اور مصلحت:

ایک ہوتی ہے ضرورت اور ایک ہوتی ہے مصلحت۔ چھوٹا بچہ چاقو مانگتا ہے، گرم کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے، لیکن اسے چاقو دینے میں اور گرم کھانے میں ہاتھ ڈالنے میں مصلحت نہیں ہوتی، اس لئے اس کو روک دیا جاتا ہے، ایسے ہی کوئی شخص کسی خاص عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے، کوئی اولاد چاہتا ہے، کوئی جاب (Job) چاہتا ہے کوئی مال چاہتا ہے، لیکن اس چیز کے دینے میں اس کی مصلحت نہیں ہوتی، اگر ان کو اس وقت وہ چیز مہیا کی جائے تو اُس کا کیا اثر مرتب ہو گا؟ آئندہ انجام کے اعتبار سے کیا چیز ہونے والی ہے؟ اس کا انہیں پتہ نہیں، بندے ضرورت کو تو جانتے ہیں، لیکن مصلحت نہیں جانتے، اللہ پاک ہر مخلوق کی ضرورت اور مصلحت دونوں کو جانتے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے امور کی تکمیل فرماتے ہیں۔

متعدد رب کیوں نہیں؟

اس صفت میں کوئی حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ وہ تنہا ہیں، ربّ ایک ہی ہو سکتا ہے، ایک سے زائد ربّ نہیں ہو سکتے۔[1] جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾[2]

''اور اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے''۔

تعدد ربّ کی نفی پر ایک عقلی دلیل:

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی ایک چیز کا کسی کو ربّ بنایا جائے تو اس ایک چیز کے لئے بہت سے امور کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کو روزی کا ربّ بنا دیا جائے، تو اب روزی ایسی چیز نہیں ہے کہ دوسری چیزوں سے اُس کا کوئی تعلق نہ ہو ۔ کیونکہ اس کے لئے سورج ضروری ہے، سورج کے لئے آسمان ضروری ہے، اُس کے لئے اُس کی گردش ضروری ہے، اُس کے لئے اُس کی تپش ضروری ہے، اُس کے لئے چاند ضروری ہے، اُس کے لئے ہوائیں ضروری ہیں، اس کے لئے پانی ضروری ہے، اُس کے لئے زمین ضروری ہے، اُس کے لئے کھیتیاں ضروری ہیں، اُس کے لئے کاشت ضروری ہے، کاشت کے لئے کاشت کار ضروری ہے، پھر اُس کا نکالنا ضروری ہے، اُس کے لئے اُس کو داسنا اور کھلیان کرنا ضروری ہے، اور پھر ان ساری چیزوں کا ایک نظام ہے یہ چیزیں دوسری چیزوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ اور ان کے پیچھے ان کے کرنے والوں کا ہونا بھی ضروری ہے،

---

[1]: اس کی تفصیل حضرت کی ایک کتاب درسِ عقیدۃ الطحاوی عقیدۂ توحید کے ضمن میں مفصل مذکور ہے وہاں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ [2]: الانبیاء:۲۲۔

وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ کہ وہ ایک مستقل چیز نہیں ہے، اسے دوسری بہت ساری چیزوں کی ضرورت ہے، دوسرے امور کی وہ محتاج ہے، اور پھر ان دوسری چیزوں کا ایک بہت بڑا انظام ہے، تو ایک چیز گویا دوسری چیزوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، دوسرے امور اور نظاموں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے، جب اللہ پاک کو ایک چیز کا رب قرار دیا جائے تو وہ ساری چیزوں کا رب اور سارے نظاموں کا رب ہو جائے گا۔ اس لیے پوری کائنات میں سوائے اللہ کے اور کوئی ربّ نہیں ہے۔

ربوبیت کی ایک مثال سے وضاحت:

اگر ہم عالَم میں موجود ایک ایک چیز کو غور سے دیکھیں تو اُس کی ربوبیت کا نظام دیکھ کر عقلِ انسانی کی حیرت کی انتہا نہیں رہے گی۔ جیسے ہم صرف اپنے بارے میں غور کریں کہ ہم کیسے پیدا ہوئے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ کن حالات میں پیدا ہوئے؟ ماں کے پیٹ میں کتنے دن رہے؟ ہماری اس وقت کیا حالت تھی؟ پہلے ہم منی کا ایک قطرہ تھے، اس کے بعد ایک لوتھڑے کی شکل ہوئی، پھر گوشت بنا، ایک ایک عضو بنتا گیا، ان کے اندر باری تعالیٰ کی جانب سے صفات ودیعت ہوتی چلی گئیں، اس کے بعد ہماری پیدائش ہوئی، کتنی مرتبہ ہم بیمار ہوئے، کتنی مرتبہ موت کے منہ میں گئے اور نکل آئے، جب ہم پیدا ہوئے تو اتنے چھوٹے تھے کہ نہ کہیں جاسکتے تھے، نہ کھا سکتے تھے، نہ خود سے پی سکتے تھے، اور پینے میں بھی جو چاہے نہیں بلکہ ہماری حالت کے مناسب ایک خاص دودھ ہم پیتے تھے، اس حالت میں حق تعالیٰ شانہ نے ہمارے مناسب دودھ ماں کی چھاتی میں پیدا کیا، ابتداء میں ماں کا دودھ پتلا اور پھیکا ہوتا ہے، جو بچے کی حالت کے مناسب ہوتا ہے، وہ دودھ پیدا کیا گیا۔ پھر جب بچہ تھوڑا سا بڑا ہوتا ہے تو ماں کا دودھ گاڑھا اور میٹھا ہو جاتا ہے جو اس وقت کی حالت کے مناسب ہوتا ہے، جیسے جیسے ہم بڑھتے گئے ویسے ویسے

تبدیلی ہوتی گئی، اور پھر اس وقت دودھ پینا کوئی سکھاتا بھی نہیں اور نہ سکھا سکتا ہے، لیکن حق تعالیٰ کی جانب سے وہ طریقہ بھی ودیعت کر دیا جاتا ہے، اس کے بعد بچہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے، آہستہ آہستہ اُس کے دانت بھی نکل آتے ہیں اور وہ کھانے پینے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔ پھر اسے کھانے میں ہضم کی ضرورت ہوتی ہے، خون بنانے کی ضرورت ہے، فضلہ نکالنے کی ضرورت ہے، دیکھنے کی ضرورت ہے، سننے کی ضرورت ہے، بولنے کی ضرورت ہے، کھیلنے کودنے کی ضرورت ہے، سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہے، اس سارے نظام کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح ہمارے اس جسم کے اندر بنایا اور جس چیز کی جہاں جس نوعیت سے ضرورت ہے اس کو وہاں رکھا۔ سر پر بھی بال ہیں اور اَبرو کے بھی بال ہیں۔ اگر اَبرو کے بال سر کے بال کی طرح بڑھنے لگتے تو کیا ہوتا۔ عمر بھر اَبرو کے بال نہیں بڑھتے لیکن سر کے بال بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ پیر کی بھی ایک ہڈی ہوتی ہے اور انگلیوں کی بھی ایک ہڈی ہوتی ہے۔ اگر انگلیوں میں وہ ہڈی آجائے جو پیر میں ہوتی ہے تو پھر کس طرح لقمہ اُٹھایا جاتا؟ اور کس طرح اس کو پکڑا جاتا؟ پیر کی ہڈی میں جس ہڈی کی ضرورت ہے وہ الگ ہے، انگلیوں میں جس ہڈی کی ضرورت ہے وہ الگ ہے اور اس میں جہاں لچک رکھنی ہے وہ الگ ہے۔ کمر کی ہڈی میں جس طرح کی لچک کی ضرورت ہے وہ الگ ہے۔ دماغ کی ہڈی کی کیفیت بالکل الگ ہے۔ یہ حق تعالیٰ شانہ کی قدرتِ کاملہ ہے۔

اللہ کے نظامِ ربوبیت پر غور کریں:

ربوبیت کا مطلب یہی ہے کہ جہاں جس چیز کی جیسی ضرورت ہو وہاں اس کو اسی نوعیت سے پورا کیا جائے، حق تعالیٰ شانہ نے اپنی قدرت سے تمام مخلوقات کو پیدا کیا اور ان میں جس کو جو ضرورت تھی اور جیسی ضرورت تھی اس کو اپنی قدرت سے پورا

کیا۔ اسی وجہ سے اللہ پاک نے بارہا اپنے اس ربوبیت کے نظام کی طرف بندوں کو متوجہ کیا اور ارشاد فرمایا کہ تم اپنی خلقت پر غور کرو، اگر تم اپنی پیدائش پر غور کروگے تو ہماری معرفت کا دروازہ تم پر کھلے گا۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ یہ مضمون بیان کیا گیا ہے:

﴿فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾[۱]

"تو انسان کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے"

آدمی کو چاہیے کہ غور کرے کہ کس طرح اللہ نے اُس کو پیدا کیا اور کن کن مراحل سے گزار کر اُس کو بنایا۔

ابتدائی چالیس دن کیسے رہا، پھر نو مہینے تک اپنی ماں کے پیٹ میں کس طرح رہا اور جب باہر آیا تو ہم نے اُس کو چھوٹے سے بڑا کیا۔ پہلے کمزور تھا، پھر ہم نے اُس کو جوان کیا، جوانی کے بعد ہم نے اُس کو بوڑھا کیا، اُس کے ہم نے پھر اُس کو لوٹا دیا۔

﴿وَمَنْ نُعَمِّرْہُ نُنَكِّسْہُ فِي الْخَلْقِ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ۔﴾[۲]

"اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں تو اُس کو خلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں، کیا وہ سمجھتے نہیں۔"

ابتدا میں دانت نہیں تھے تو بڑھاپے میں دانت چلے گئے۔ پہلے چل نہیں سکتا تھا، بڑھاپے میں بھی چلنے کے قابل نہیں رہا۔ پہلے ہاضمہ کمزور تھا بڑھاپے میں بھی ہاضمہ کمزور ہو گیا۔ جیسے جیسے آدمی بڑا ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اُس کی خلقت پلٹ جاتی ہے۔

عالم میں جو دوسری چیزیں اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں اُن کو دیکھیں! انسان مادیت میں کوشش کر کے دوسری چیزیں بنا رہا ہے۔ جیسے طیارے ہیں، ان کو انسان نے بنایا، در حقیقت ان کو خدا نے انسان کو استعمال کر کے بنوایا۔ یہ بات ذہن میں رکھ لیجیے کہ اللہ پاک اپنی حکمت و مصلحت سے کسی چیز بنانے کے لیے دیگر چیزوں کو استعمال کرتے ہیں

۱: الطارق:۵۔ ۲: یس:۶۸۔

لیکن کوئی چیز خود نہیں بنتی۔ مثلاً ماں بچے کو نہیں بناتی، ماں سے بچہ بنتا ہے، اور بنانے والے خدا ہیں۔ زمین خود غلہ نہیں دیتی بلکہ زمین سے خود اللہ تعالیٰ غلّہ نکالتے ہیں۔ آدمی اپنی بساط اور استطاعت کے مطابق اسباب اختیار کر کے چھوڑ دیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے ابتدا سے انتہا تک تمام مراحل سے گزار کر وجود دیتے ہیں، اور پھر اس کو باقی رکھتے ہیں، پھر اس میں نفع اور نقصان کی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں۔ موجودہ دور میں انسان اپنی ترقی پر ناز کر رہا ہے، آج ایسی ایسی چیزیں وجود میں آرہی ہیں کہ پہلے کبھی اس کا تصور نہیں تھا، اور آج انسان اسے اپنی تخلیق سمجھ رہا ہے، حالانکہ اس کا خالق اور رب بھی اللہ ہی ہے:

اسی کو قرآن پاک میں یوں بیان کیا گیا:

﴿وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾[۱]

”اور اسی نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے تا کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہارے لئے رونق وزینت بھی ہیں، وہ اور بھی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کی تم کو خبر نہیں۔

قرآن کریم کا اعجازی اسلوب:

اس بات کو اللہ پاک نے ایک عجیب اسلوب سے بیان کیا اور اس انداز سے بیان کیا کہ وہ جامع بھی ہو اور سامنے والے سمجھ بھی جائیں، اللہ پاک نے اس میں اپنی مخلوقات کا ذکر فرمایا، اگر اُس وقت اللہ تعالیٰ طیارے، گاڑیاں، کاریں، جہاز، راکٹ اور آج کل کی ترقی یافتہ چیزوں کا تذکرہ کرتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم ان کو سمجھ نہ پاتے، اس کے بجائے اللہ پاک نے فصاحت و بلاغت اور جامعیت کے ساتھ پہلے اس زمانہ کی سواریوں کا تذکرہ کیا، پھر کہا: ﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾[۲] پیدا کرتے ہیں ان چیزوں کو جو تم نہیں جانتے۔ اب اس میں وہ سب چیزیں داخل ہو گئیں جو آج کی ہوں یا آئندہ کی ہوں یا گذشتہ کی ہوں۔ پس ساری مخلوق اللہ کی محتاج ہے ہر چیز میں، اور اللہ بے نیاز ہیں۔

---

[۱]: النحل:۸۔ [۲]: النحل:۸۔

﴿یَا أَیُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴾[۱]

"اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تبارک وتعالیٰ بے نیاز سزاوارِ حمد وثنا ہے۔

دنیوی زندگی سے دھوکہ نہ کھائیں:

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اوپر سب سے بھاری یہی ذمہ داری ڈالی اور اس کو اس کا مکلف بنایا کہ تو دنیا میں "ربّ" کو پہچان اور اسی کی عبادت کر! کیونکہ ربّ کو پہچاننے میں یہ دنیا دھوکہ دیتی ہے۔ اور یہاں کا نظام اسے دھوکہ میں ڈال دیتا ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیَاةُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾[۲]

"پس تم کو دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ فریب دینے والا (شیطان) تم کو کسی طرح کا فریب دے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دارالاسباب بنایا، یہاں اسے عمل کرنے کے لئے بھیجا گیا، انسان یہاں آکر اپنے رب کو بھول گیا، اور اپنے رب سے کئے ہوئے وعدہ کو بھول گیا۔ اسی وعدہ کو یاد دلاتے ہوئے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾[۳]

اور جب تمہارے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا تو ان سے اقرار کرایا ان کی جانوں پر، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو وہ کہنے لگے کہ کیوں نہیں؟ ہم سب گواہ ہیں (کہ آپ ہمارے رب ہیں)۔

اس یاد دہانی کے باوجود انسان اپنے رب سے غافل ہے، حالانکہ یہاں سے جانے کے بعد سب سے پہلے اس سے یہی سوال ہونے والا ہے۔

۱: فاطر: ۱۵۔ ۲: لقمان: ۳۳۔ ۳: الاعراف: ۱۷۲۔

قبر میں سب سے پہلے رب ہی کا سوال ہو گا

جب قبر میں جائے گا اور رب کے سامنے کھڑا ہو گا، سوال و جواب کیا جائے گا، اُس وقت اس کی آنکھ کھلے گی، وہاں سب سے پہلے یہی سوال کیا جائے گا۔ ''مَنۡ رَّبُکَ''، تیرا ربّ کون ہے ؟ دنیا میں رہتے ہوئے نبیوں نے جو تعلیم تجھے دی اس پر کتنا عمل کیا؟

اس وقت ہمارے پاس کیا جواب ہو گا؟ اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس کی ربوبیت کا یقین دل میں بٹھانا ہو گا، اس کے لئے ہمیں اپنے آپ کو اسباب سے کاٹنا پڑے گا۔ مجاہدہ کرنا پڑے گا۔ پہلے زمانے میں لوگ بزرگوں کی خدمت میں رہتے تھے اور اُن کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے، زانوئے ادب طے کرتے تھے، ہر قسم کے مجاہدے کو برداشت کرتے تھے اور اس یقین کو بناتے تھے۔

ربوبیت پر یقین کا امتحان:

آدمی اپنی زبان سے کہہ تو دیتا ہے میرا رب اللہ ہے، مجھے اللہ پر یقین ہے، لیکن یہ صرف اس کی زبان تک محدود ہوتا ہے، یہ چیز اس کے اعمال سے ظاہر نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اس کے تقاضوں پر عمل نہیں کرتا، یا کرتا ہے لیکن اس میں استقامت نہیں ہوتی، جیسے آپ جاب (Job) کر رہے ہیں، اسی دوران اذان شروع ہوئی، اب ساتھ میں بندہ کی آزمائش بھی شروع ہو گئی، اب دیکھا جائے گا کہ وہ مسجد جا رہا ہے یا اپنے جاب ہی میں لگا ہے، یہاں اس کی استقامت ظاہر ہوتی ہے، اللہ کی ربوبیت پر اس کا یقین معلوم ہوتا ہے، اسی طرح آپ کی دکان میں حلال مال ہے لیکن تھوڑا ہے، اس سے آپ کو نفع اور آمدنی کم ہوتی ہے، اور اگر حرام مال رکھتے ہیں تو نفع اور آمدنی زیادہ ہوتی ہے، اس وقت دیکھا جائے گا کہ وہ اپنے رب کو دیکھے گا یا اپنی کمائی کو دیکھے گا۔ اس وقت اس کے ایمان کی پختگی معلوم ہو گی، اور اس کا اللہ پاک کی ربوبیت پر یقین معلوم ہو گا، اگر وہ مکمل اللہ

پاک کی ربوبیت پر یقین رکھے گا تو وہ اللہ کو ناراض کرنے والا کوئی کام نہیں کرے گا۔ اگر ذہن اللہ تعالیٰ سے ہٹا ہوا ہو، بھلے اللہ تعالیٰ پہلے سے اس کے ذہن میں ہوں، لیکن چونکہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیال ہٹا ہوا ہے اس لئے وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ اس میں اللہ پاک راضی ہوں گے یا ناراض، میری یہ کمائی حلال ہے یا حرام، میرا یہ طریقہ جائز ہے یا ناجائز، بس اسے روزی کمانے کی فکر لگی ہو گی، پیسوں کی چاہت ہو گی، بس کسی طریقہ سے وہ مال حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، چاہے اس کے لئے ناجائز طریقہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے؟ حالانکہ رزق کا ذمہ تو اللہ نے لے رکھا ہے، اس کے اس طریقہ پر رزق کا مدار نہیں ہے، لیکن حصولِ رزق کے لئے وہ کرے گا، اگر اللہ پاک اسے رزق دینا چاہیں تو ایسے ایسے طریقوں سے دیں کہ جہاں تک اس کا گمان بھی نہ پہونچے۔ آدمی تو اسے اپنی محنت اور کمائی کا نتیجہ سمجھتا ہے لیکن اس کے پیچھے اس کا کچھ اور سبب ہوتا ہے۔

دینی مجلس بھی رزق کا سبب ہے:

ایک حدیث میں ہے کہ دو بھائی تھے۔ ایک تو آپ ﷺ کی مجلس میں آکر بیٹھتے تھے اور دوسرے محنت اور کمائی کرتے تھے۔ ایک دن اس بھائی نے آپ ﷺ سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ! "میں محنت اور مزدوری کرتا ہوں اور یہ آپ ہی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں، آپ ان سے فرمائیں کہ یہ بھی محنت کیا کریں، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! مجھے آپ کی باتیں بہت پسند ہیں اور میں آپ کی خدمت میں رہ کر استفادہ کرنا چاہتا ہوں، اس لئے میں آپ کے پاس آجاتا ہوں، آپ ﷺ مسکرائے اور محنت کرنے والے بھائی سے فرمایا: "لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهٖ"[1]

---

[1]: سنن ترمذی: کتاب الزھد عن رسول اللہ ﷺ / باب ماجاء فی التوکل علی اللہ۔

تم کو جو روزی مل رہی ہے وہ اسی کی وجہ سے مل رہی ہے۔ آدمی کو پتہ نہیں ہوتا کہ کیسے اس کو رزق مل رہا ہے؟ کس کی برکت سے مل رہا ہے؟ وہ تو اپنی کمائی کا سبب اپنی محنت کو سمجھ رہا ہے، لیکن اس کے پیچھے اس کا کچھ اور ہی سبب ہے۔

کمزور بھی رزق کا سبب ہوتے ہیں:

ایک حدیث میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

"اِبْغُوْنِی الضُّعَفَاءَ فَإِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ وَتُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَائِكُمْ"[۱]

تم ضعفاء کو تلاش کرو میرے لیے (مجھے خوش کرنے کے لیے یا ان کے حقوق ادا کرنے کے لیے) کیونکہ تم کو تمہارے کمزوروں کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری مدد کی جاتی ہے۔"

گھر میں کوئی اپاہج یا معذور ہونے کی وجہ سے کمائی پر قادر نہیں ہوتا، گھر والے اُس کو بوجھ سمجھتے ہیں، گھر کی عورتیں اُس کو بڑی مصیبت سمجھتی ہیں مگر ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ خدا کی طرف سے روزی کا یہ ایک سبب ہے۔ انہیں اس کی وجہ سے روزی مل رہی ہے ایسا اللہ پاک کا غیبی نظام ہوتا ہے کہ آدمی تصور نہیں کر سکتا، اور پھر یہ نظام صرف انسانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کے ساتھ ہوتا ہے۔

نومولود جانوروں کے ساتھ رزق کا قدرتی نظام:

جیسے کوّے کے بچے جب گھونسلے میں انڈوں سے نکلتے ہیں تو اس وقت اُن کے پَر نہیں ہوتے، پَر نہ ہونے کی وجہ سے انتہائی بدبو اُن سے آتی رہتی ہے اور خود کوّے بھی اُن سے دور رہتے ہیں، یہ نومولود ہیں، انہیں بھوک لگتی ہے، بھوک کی وجہ سے وہ چونچ کھول دیتے ہیں، چونکہ اُن کے جسم پر پَر نہیں ہوتے اس لئے بُو کی وجہ سے چھوٹے

---

[۱] سنن ابی داود: الجهاد/ باب فی الانتصار برذل الخيل والضعفة۔

چھوٹے پتنگے ان کے پاس آتے ہیں اور ان پر گر جاتے ہیں، جیسے ہی پتنگے اُن کے منہ میں داخل ہوتے ہیں تو وہ فوراً چونچ بند کر لیتے ہیں۔ پَر آنے تک انہیں اس طریقہ سے بھی غذا پہنچتی ہے، نہ ماں پالے نہ باپ پالے، لیکن ان کی پرورش ہو رہی ہے، کیسے؟ بس اللہ پاک کر رہے ہیں۔

جیسے رزق کا یہ نظام ہے ایسے ہی بندہ کی ہر ضرورت کے لئے اللہ پاک کا ایسا نظام ہوتا ہے، ایسے ہی ہماری حفاظت کا ایک نظام ہوتا ہے، ایسے طریقوں سے ہماری حفاظت ہوتی ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے، خود آدمی اپنے بچپن کے ایک ایک واقعہ کو سوچ کر محو حیرت ہو جاتا ہے۔ ہماری حفاظت کے لئے فرشتوں کا ایک نظام ہوتا ہے، ہماری حفاظت کے لئے اللہ پاک جانوروں کو مقرر کر دیتے ہیں۔

ایک شرابی کی حفاظت کا غیبی انتظام:

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات میں ایک واقعہ لکھا ہے: ایک مرتبہ وہ نہر کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اچانک جھاڑیوں میں سے ایک بچھو برآمد ہوا اور وہ تیز تیز پل کی طرف دوڑنے لگا۔ انہوں نے سوچا کہ یہ بچھو اتنا تیز دوڑ رہا ہے، جس کے پیچھے ضرور کوئی وجہ ہے، اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے لہٰذا حضرت اس بچھو کے پیچھے ہو لیے۔ وہ پل پار کرتے ہوئے آگے ایک درخت کی طرف بھاگا، وہاں پہنچ کر دیکھا کہ ایک آدمی درخت کے نیچے سو رہا ہے اور ایک بہت بڑا سانپ درخت کے اوپر سے اُتر رہا ہے۔ ابھی سانپ درخت سے اُترا بھی نہیں تھا کہ بچھو وہاں پر پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ سانپ آدمی کو ڈستا بچھو نے ڈنک مار کر سانپ کو مار دیا اور وہ آدمی سوتا رہا۔ حضرت کو بڑی حیرت ہوئی، سوچا کہ یہ کوئی خاص اللہ کا ولی معلوم ہوتا ہے جس کی حفاظت کے لیے خدا نے ایسا غیبی انتظام فرمایا، اس کی زیارت کرنی چاہیے، جب

حضرت اُس آدمی کے قریب پہنچے تو وہ بے ہوش پڑا تھا اور اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ اے اللہ! آپ کا بھی عجیب نظام ہے کہ ایک شرابی آدمی کی حفاظت کا آپ نے کیسے غیبی انتظام کیا؟ غیب سے آواز آئی کہ ذوالنون! اگر شرابی بندوں کی میں حفاظت نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟ میرا یہ نظام نہیں ہے کہ میں اپنے نیک بندوں کی تو حفاظت کروں اور بُرے بندوں کی حفاظت نہ کروں۔ میں ربّ ہوں، ربوبیت میرا کام ہے۔ سب میرے ربوبیت کے نظام کے تحت چلتے ہیں، جتنے شرابی، کبابی، جواری، کافر، مشرک، ملحد، ڈاکو، چور، بدتمیز ہیں اُن سب کو اللہ پاک پال رہے ہیں، اور وہ سب اللہ پاک کی حفاظت میں ہے۔

حفاظتِ خداوندی کا ایک واقعہ:

ایک برس پہلے کا واقعہ ہے کہ میں نے عرب کے جریدے میں دو قصے پڑھے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس طرح کے قصے اخبار میں آئیں تو اس میں کچھ تو صداقت ہوگی اور اگر صداقت نہ ہو تو کم از کم امکان موجود ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک سعودی جہاز میں سے دو بچے گر گئے، اس وقت جہاز پانی کے اوپر سے جا رہا تھا، سب لوگ اس پر پریشان ہیں کہ یہ سب کیسے ہوا؟ دونوں بچوں کا تعلق پاکستان سے تھا، اردو بولتے تھے، گرنے کے باوجود نہ بچوں کا کوئی نقصان ہوا اور نہ جہاز کا، دو سال کے بعد کچھ لوگ تلاش کرتے کرتے بچوں کو اُن کے ماں باپ کے پاس لے کر پہنچے۔ ماں باپ نے پوچھا کہ قصہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم لوگ مچھلی پکڑ رہے تھے کہ اچانک جہاز میں سے کوئی چیز گر گئی، ہم سمجھے کہ کوئی قیمتی چیز گری ہے، ہم فوراً لپکے۔ دیکھا کہ وہ گرنے والی چیز یہ دو بچے تھے، یہ ابھی بچے ڈوبنے نہ پائے تھے کہ ہم نے ان کو فوراً اُٹھالیا۔، ہم

اُن کی زبان نہیں جانتے تھے نہ وہ ہماری زبان جانتے تھے، اس لئے ہم انہیں ان کی زبان جاننے والوں کے پاس لے گئے، اُن کو ان بچوں نے اپنے ماں باپ اور جگہ کا پتہ بتایا تو ہم پوچھتے پوچھتے یہاں پہنچ گئے۔ دیکھئے! ربّ جب حفاظت کرنے پر آئیں تو ایسی حفاظت کریں۔

ربّ ذوالجلال کی خصوصی عنایت:

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ایک چھ منزلہ عمارت سے دو سالہ بچی نیچے گر پڑی۔ اگر ایک منزل دس فٹ کی بھی ہو تو ساٹھ فٹ کی بلندی سے کوئی بچی گرے تو اُس کا کیا حال ہو گا، ماں باپ روتے ہوئے نیچے آئے، دیکھا کہ بچی کھیل رہی ہے۔ کوئی بڑی چوٹ اس کو نہیں لگی، جب وہ نیچے گری تو سیدھا کار کے بمپر پر گری اور بمپر تھوڑا سا دب گیا جیسے کوئی کٹورا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے بچی کو زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔ اس کی حفاظت مقدر میں تھی اللہ پاک نے کر دی، ویسے بچوں پر اللہ پاک کی خصوصی عنایت ہوتی ہے۔

اسی لیے حضور پاک ﷺ دعا فرماتے تھے:

”اَللّٰھُمَّ وَاقِیَۃً کَوَاقِیَۃِ الْوَلِیْدِ“[1]

”یااللہ! میری ایسی حفاظت فرمائیے جیسے آپ نومولودوں کی حفاظت فرماتے ہیں۔“

یہ واقعات اس لئے بتائے جارہے ہیں بندہ اللہ پاک کے اس نظام کو سمجھے، اس کی ربوبیت کا یقین اپنے دل میں بٹھالے۔

عالم کا معنیٰ اور مفہوم:

عالَم، اس کی جمع ”عَوَالِمُ اور عَالَمُوْن“ آتی ہے، اس کے معنیٰ نشان اور علامت کے ہیں، وہ نشان جس سے کسی چیز کو جانا اور پہچانا جائے۔ پوری کائنات اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتوں کی، اُن کے علم کی، اُن کی قدرت کی، اُن کی کاریگری کی اور اُن کی صفات کی

---

[1]: مسند ابی یعلی: مسند عبد اللہ ابن مسعود، ۵۵۲۷۔

پہچان کرانے والی ہے، اس لیے ہر چیز کو عالَم کہا جاتا ہے۔ جیسے آپ ایک خاص قسم کا جوتا پہنتے ہوں تو وہ جوتا آپ کے لئے پہچان کا باعث ہوتا ہے مثلاً آپ کا ایک دوست ہے جو رات دن آپ کے ساتھ رہتا ہے، وہ آپ کو مسجد میں دیکھنے کے لیے آیا کہ آپ مسجد میں ہیں یا نہیں۔ اُس نے جوتوں کی جگہ آپ کا جوتا رکھا ہوا دیکھا۔ آپ کو مسجد میں دیکھے بغیر جوتوں کی وجہ سے وہ پہلے ہی سے حکم لگا دیتا ہے کہ میرا دوست مسجد میں موجود ہے، کیونکہ وہ مخصوص جوتا اُس آدمی کی علامت ہے۔ آدمی کے کپڑے اُس کی پہچان کی علامت ہوتے ہیں، اُس کی گاڑی اس کی پہچان کی علامت ہوتی ہے، جب کوئی گاڑی پارک کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں صاحب کی گاڑی کھڑی ہوئی ہے، وہ بھی آچکے ہیں، اُن کی گاڑی سے اُن کا علم ہو گیا۔ اسی طرح پوری کائنات بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی علامت ہے، زمین اللہ کی علامت ہے، چاند و سورج اللہ کی علامت ہے، دریا اور پہاڑ اللہ کی علامت ہے، یہ شجر و حجر اللہ تعالیٰ کی علامت ہے۔ یہ ساری چیزیں اللہ کے علم کا ذریعہ ہے، اب جو چیز جیسی بنی ہوئی ہے اسی اعتبار سے وہ اللہ کی علامت ہے۔ کوئی چیز بڑی بنی ہوئی ہے تو وہ اللہ کی بڑائی کی علامت ہے۔ کوئی چیز بہت ہی خوبصورت بنی ہوئی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے صفتِ حسن کی علامت ہے۔ کوئی انتہائی مضبوط بنی ہوئی ہے تو اللہ کی قوت کی علامت ہے۔ کسی کے اندر بے شمار خصوصیتیں ہیں تو وہ اللہ کے کمالات کی علامت ہے۔ کہیں پالنے کا نظام ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی علامت ہے ۔

عالَموں کی تعداد:

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کل عالم کتنے ہیں؟ اس کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، احادیثِ صحیحہ اور مرفوعہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، البتہ اس سلسلہ میں کچھ موقوف روایات اور تابعین اور مفسرین کے چند اقوال ہیں۔ جن میں سے ایک حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: إِنَّ لِلّٰهِ أَرْبَعِيْنَ أَلْفَ عَالَمٍ؛ اَلدُّنْيَا مِنْ شَرْقِهَا إِلٰى مَغْرِبِهَا عَالَمٌ وَاحِدٌ مِنْهَا"[۱]

"بے شک اللہ کے لئے چالیس ہزار عالم ہیں، ان میں سے دنیا مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے"۔

حضرت سعید ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت مروی ہے:

"لِلّٰهِ أَلْفُ عَالَمٍ؛ سِتُّ مِائَةٍ فِي الْبَحْرِ وَأَرْبَعُمِائَةٍ فِي الْبَرِّ" اللہ پاک کے لئے ہزار عالم ہیں چھ سو سمندر میں اور چار سو خشکی میں[۲] ایک ضعیف روایت سے یہی مفہوم ثابت ہوتا ہے۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: "اَلْعَوَالِمُ ثَمَانُوْنَ أَلْفًا" عالم اسی ہزار ہیں۔[۳]

اور وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: "لِلّٰهِ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ أَلْفَ عَالَمٍ، اَلدُّنْيَا مِنْهَا عَالَمٌ وَاحِدٌ" اللہ کے لئے اٹھارہ ہزار عالم ہیں دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔[۴]

عالموں کی اقسام:

عالَموں کی صحیح تعداد تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، البتہ علماء کرام نے اس کو سمجھنے کے لیے جو موٹی موٹی تقسیم کی ہے وہ اس طرح کی ہے: اولاً عالَم کی دو قسمیں ہے۔

عالَمِ مجرد اور عالَمِ مادی:

ایک عالَم' عالَمِ مجرد ہوتا ہے جس میں کوئی مادّہ نہیں ہوتا، جو کسی چیز سے بنا ہوا نظر نہیں آتا، جیسے عقل، روح وغیرہ۔

دوسرا عالَم' عالَمِ مادّی ہوتا ہے، اُس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسی چیز سے بنایا ہے کہ اُس کو چھوا جاسکتا ہے، اُس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

۱: تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳۳۔ ۲: حوالۂ سابق۔ ۳: حوالۂ سابق۔ ۴: حوالۂ سابق۔

عالمِ عُلوی اور عالمِ سفلی:

اس عالمِ مادّی کی بھی دو قسمیں ہیں ایک عالمِ علوی اور دوسرے عالمِ سفلی۔ عالمِ علوی کا مطلب اوپر کا عالم یعنی جو کچھ آسمانوں میں ہے چاند، سورج، ستارے وغیرہ وغیرہ۔ آسمانوں کے نیچے کے عالَم کو عالمِ سفلی کہتے ہیں۔

عالمِ سفلی کی اقسام:

عالمِ سفلی بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک لطیف اور دوسرا کثیف۔ عالمِ سفلی ''لطیف'' میں ارواح، جنات، شیاطین اور خدا کی ایسی مخلوق شامل ہے جو ہمارے حِس میں نہیں آسکتی۔ عالمِ کثیف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک عالمِ مفردات اور دوسرا عالمِ مرکبات۔

عالمِ مفردات اور عالمِ مرکبات:

آگ، پانی، مٹی، ہَوا، یہ سب مفردات کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرکبات ہیں۔ مرکبات میں بھی ایک کائنات الجو کے نام سے ہے یعنی فضا میں موجود بادل، اولے، دھواں اُس میں شامل ہیں۔

عالمِ مرکبات کی اقسام

عالمِ مرکبات میں زمین پر پائے جانے والی چیزیں بھی شامل ہیں، جن کو موالیدِ ثلاثہ بھی کہا جاتا ہے۔ موالیدِ ثلاثہ سے مراد عالمِ جمادات، عالمِ نباتات اور عالمِ حیوانات ہے۔

عالمِ جمادات

عالمِ جمادات سے مراد وہ چیزیں ہیں جو جامد ہیں یعنی اپنے ارادے سے حرکت نہیں کرسکتیں اور اُن کا بظاہر کوئی شعور نہیں ہے۔ جیسے مٹی، پتھر، سونا، چاندی، اسٹیل، تانبہ اور زمین میں پائے جانے والی مختلف قدرتی دھاتیں، یہ سب کے سب عالمِ جمادات سے تعلق رکھتی ہیں۔

عالمِ نباتات

اس کے بعد کا ایک عالَم، عالمِ نباتات ہے۔ نباتات یعنی اُگنے والا عالَم، اس عالَم میں (خاص) شعور تو نہیں ہوتا لیکن یہ بڑھتا ہے، نمو اس میں پایا جاتا ہے۔ اس عالَم نباتات میں درخت، بیلیں، چھوٹے پودے، دوائیں، غلّے وغیرہ شامل ہیں۔

عالمِ حیوانات اور اس کی اقسام:

اس کے بعد عالمِ حیوانات ہے۔ عالمِ حیوانات کی بھی دو قسمیں ہیں ایک عالمِ بحر اور دوسرے عالمِ بَر، سمندر میں پائے جانے والی مخلوقات اور خشکی میں پائے جانے والی مخلوقات۔ سمندر میں پائی جانے والی مخلوقات زمین پر پائی جانے والی مخلوقات سے زیادہ ہے۔ سمندر کے ایک کلومیٹر کے رقبے میں کروڑہا کروڑ مخلوقات پائی جاتی ہیں، وہ خشکی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں اور قسم کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ ہیں۔

میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ سمندر میں پائی جانے والی مخلوقات ساٹھ ہزار قسم کی ہے جبکہ خشکی پر پائے جانے والی مخلوق چالیس ہزار قسم کی ہے۔ اس عالمِ حیوانات میں چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ چیونٹی سے لے کر حضرت جبرئیل علیہ السلام تک، سب کے سب شامل ہیں کیونکہ وہ ذی فہم اور ذی حیات ہیں۔ اسی طرح ایک ظاہری عالم ہوتا ہے، اور ایک باطنی، ایک عالمِ شباب ہے، ایک عالمِ طفولیت ہے، ایک عالمِ مشیخیت ہے، ایک عالمِ مسرت ہے، ایک عالمِ غم ہے، شعوریت کا ایک عالَم ہے، بیٹے ہونے کا ایک عالَم ہے، باپ ہونے کا ایک عالَم ہے، آدمی پر عوالم اتنے طاری ہوتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں۔

ایک آدمی اپنی بیوی کے پاس ہے، عالَم زوج اس پر سوار ہے۔ عین اُس وقت میں اُس کی ماں ”بیٹا!“ کہہ کر آواز دے تو آپ دیکھیں گے کہ آدمی ایک سیکنڈ میں عالَم شعوریت

سے ''جی'' کہہ کر بیٹے کے عالَم میں آجاتا ہے۔ اسی موقع پر اگر بچی ''ابّا!'' کہتی ہوئی آجائے تو ایک لمحے میں بیٹے کے عالَم سے باپ کا عالَم اس پر طاری ہو جاتا ہے۔ کیا حق تعالیٰ شانہ کا ایک نظام ہے؟

آنکھوں کا ایک عالَم ہے۔ اللہ پاک نے کائنات بنائی ہے، اُس میں کتنے ہی انسان ہیں۔ ہر انسان کی دو دو آنکھیں ہیں۔ تصور میں ان تمام آنکھوں کا ایک جگہ ڈھیر جمع کر دیں۔ تمام مچھروں کی آنکھیں جمع کر دیں، چیونٹیوں کی آنکھیں جمع کر دیں، ہاتھیوں کی آنکھیں جمع کر دیں، بیلوں کی آنکھیں جمع کریں، تَری پر موجود تمام جانداروں کی آنکھوں کو جمع کریں، اب آپ دیکھیں گے کہ آنکھوں کا ایک عالَم ہے، روزانہ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آنکھیں وجود میں آتی ہیں اور ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آنکھیں فنا ہو جاتی ہیں۔ پھر ہزاروں لاکھوں کی بینائی میں آہستہ آہستہ کمی آتی ہے، اور ہزاروں لاکھوں کی بینائی میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے کسی کی بینائی بالکلیہ ہی چلی جاتی ہے تو کسی کو بالکلیہ شفا ہو جاتی ہے، یہ سب اللہ پاک اپنی قدرت سے کرتے ہیں اور نظام ربوبیت کے تحت ان کی تربیت فرماتے ہیں۔

میں نے تو صرف آنکھوں کی مثال دی ہے۔ یہی حال بالوں کا ہے، یہی حال کانوں کا ہے، یہی حال زندگی کا ہے، یہی حال موت کا ہے، یہی حال تندرستی کا ہے، یہی حال بیماری کا ہے، یہی حال جوانی کا ہے، یہی حال بڑھاپے کا ہے۔

رب العلمین سے متعلق ایک نکتہ:

آگے دیکھئے! لفظ اللہ کے بعد ''ربّ العالمین'' ہے، اگر یہاں ''ربّ'' کی جگہ ''خالق'' کا لفظ استعمال کیا جائے تو ترجمہ یوں ہو گا کہ ''سارے عالَموں کو جس نے پیدا کیا اُسی کیلئے

تعریف ہے''، وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو پیدا کرنے والا مانتے ہیں لیکن اُس کے بعد والے نظام کو نہیں مانتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ہمیں پیدا کر دیا، اب ہم اپنی مرضی سے جی رہے ہیں، تو ان کا ردنہ ہوتا کیونکہ جو بات ''ربوبیت'' کے لفظ میں ہے وہ ''خالق'' اور ''صانع'' کے لفظ میں نہیں ہے حالانکہ لفظ ''خالق'' قرآن پاک میں دوسری جگہوں پر استعمال ہوا ہے لیکن موقع و محل کے اعتبار سے یہاں پر ربّ ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ غفلتوں اور ظلمتوں میں سے ایک ظلمت یہ بھی ہے کہ انسانوں کا ایک طبقہ وہ ہے جو اللہ کو مانتا تو ہے لیکن یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا بنانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو گئے، جیسے کسی فیکٹری میں کوئی چیز پروڈکٹ (Product) کی جاتی ہے، اُس کے بعد بنانے والے کا اُس چیز سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسی طرح اللہ پاک کا معاملہ ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ! اگر ''خالق'' کہتے تو مطلب یہ ہوتا کہ اللہ پاک نے مخلوق کو پیدا کر دیا اور قصہ ختم ہو گیا، لیکن ''ربّ'' کا مفہوم یہ ہے کہ پیدا کرنے کے بعد اُس کو چھوڑا نہیں بلکہ اُس کی ربوبیت بھی اسی کے ذمہ ہے، ان کی ضرورتوں کی تکمیل بھی اسی کے ذمہ ہے، وہ مخلوق سے بے تعلق نہیں۔

''عالمین'' یعنی سارے عالَموں کا (رب ہے)۔ ''عالمین'' کی جگہ پر اگر صرف ''عالَم'' کا لفظ آتا تو مشرکین کہہ سکتے تھے کہ اللہ تو صرف ایک عالَم کا ربّ ہے، لات دوسرے عالَم کا، منات تیسرے عالَم کا، ہبل چوتھے عالَم کا اور یسوغ پانچویں عالَم کا رب ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے لئے اتنی بھی گنجائش نہیں چھوڑی، اور فرمایا کہ میں ہی سارے عالموں کا رب ہوں، کوئی چیز میرے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں ہے نہ آسمان کی، نہ زمین کی، نہ شجر کی، نہ حجر کی، نہ بَر کی نہ بحر کی۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تشریح

"بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے"۔

صفتِ رحمٰن اور رحیم سے متعلق کچھ اہم باتیں تسمیہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔ یہاں بھی چند اور باتیں آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہیں۔

آیات میں باہمی ربط:

اس آیت کی تفسیر سے قبل مذکورہ آیات میں باہمی ربط بھی ذہن میں رکھیں۔

سب سے پہلے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، سوال پیدا ہوا کہ تعریفیں اللہ کے لئے کیوں ہے؟ جواب اسی میں ہے کہ تعریفیں اللہ کے لئے اس لئے ہیں کہ وہ اللہ ہیں، اور اللہ کے بارے یہ بیان کیا گیا کہ اللہ وہ ہے جو تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ہو اور ہر عیب اور نقص سے پاک ہو، اور تعریف بھی اسی کی ہوتی ہے جس میں یہ صفات ہوں، اس لئے تعریف بھی اللہ پاک ہی کی ہوگی۔ اب اللہ پاک صفاتِ کمالیہ کے مالک ہیں یہ کیسے ظاہر ہوا؟ تو آگے باری تعالیٰ نے فرمایا "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" وہ سارے عالموں کے رب ہیں، اور رب سے متعلق بھی آپ نے سن لیا کہ رب اسے کہتے ہیں، جو حیّ ہو، قادر ہو، سمیع ہو، علیم ہو، بصیر ہو، ارادہ کرنے والا ہو، متکلم اور مکوِّن ہو، یہ صفات صفاتِ کمالیہ کہلاتی ہیں، اور یہ صفات بالذات باری تعالیٰ کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائی جاتیں، پس اللہ پاک کا رب ہونا ثابت ہوا، جب رب ہونا ثابت ہوگیا تو اللہ کا صفاتِ کمال کا جامع ہونا بھی ثابت ہوا، پس اللہ پاک کا اللہ اور اِلٰہ ہونا اور حمد کا حقیقی مستحق ہونا ثابت ہوا۔ پھر سوال ہوا کہ اللہ پاک سارے عالموں کو کیوں پالتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہیں یعنی محض رحمت کی وجہ سے وہ پالتے ہیں۔

کوئی جبر اُن پر نہیں، کوئی زبردستی اُن پر نہیں، کوئی تقاضہ ان پر نہیں، کوئی استحقاق ان پر نہیں، بس وہ اپنی رحمت اور مہربانی سے ہمیں پالتے ہیں۔

کوئی یہ سوچ سکتا تھا کہ دوسرے خدا جو ان کے خود ساختہ بیٹھے ہیں اُن لوگوں نے اللہ تعالیٰ پر دباؤ ڈالا تو اللہ تعالیٰ یہ نظام بنانے پر مجبور ہوگئے، ایسا کچھ بھی نہیں ہے بلکہ وہ رحمٰن ورحیم ہے اس وجہ سے انہوں نے ایسا کیا۔

اب حق تعالیٰ شانہ کا یہ مہربانی ورحمت فرمانا خاص بھی ہوتا ہے اور عام بھی ہوتا ہے، دنیا کا بھی ہوتا ہے اور آخرت کا بھی ہوتا ہے، اپنوں کے لیے بھی ہوتا ہے اور دوسروں کیلئے بھی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہاں پر دو رحمتوں کا تذکرہ فرمایا، آدمی دنیا میں خدا کی رحمت سے پوری طرح متمتع نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانوں کا کچھ بھی حصہ دنیا میں نہیں۔ حقیقی نعمتیں تو آخرت میں ہمارے لئے رکھی گئی ہیں اس لئے دو صفتوں کا ذکر فرمایا کہ صفتِ رحمن کے نتیجہ میں دنیا میں تم نعمتوں سے مستفید ہوں گے اور صفت رحیم کے نتیجہ میں آخرت میں نعمتوں سے مستفید ہوں گے۔

کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی ایک دعوت کریں تو دنیا میں اس کے اشیاء ضیافت آ ہی نہیں سکتے، بڑوں کا ایک اصول ہے کہ جب اُن کے گھر کوئی آتا ہے تو اُس کا اکرام کیا جاتا ہے، اُس کو کچھ کھلایا پلایا جاتا ہے، اسی طرح جو آدمی نماز پڑھنے کے لیے مسجد جاتا ہے تو بعض روایتوں میں ہے کہ وہ اللہ کا مہمان ہوتا ہے، جتنی مرتبہ یہ آئے گا اُتنی مرتبہ دعوت ہوگی، ایک دعوت میں ایک دستر خوان پر سینکڑوں کھانے ہوں گے، اور ایسے کئی دستر ہوں گے، اور ہر آدمی کی جنت کم از کم اس دنیا سے دس گناہ بڑی ہوگی تو اب آپ بتائیے کہ باری تعالیٰ کی ضیافت اس دنیا میں کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لئے یہ نعمتیں آخرت میں دی جائیں گی، "مالك یوم الدین" اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن تمہارے

لئے اس کا فیصلہ کیا جائے گا جو تم سے عمل کروایا جارہا ہے تم اُسے کرو اور ہماری طرف آؤ تو پھر جو ہماری رحمت کے لامتناہی خزانے ہیں اُن خزانوں سے تم مستفید ہو سکو گے۔

کائنات میں جتنی تبدیلی و ترقی ہو رہی ہے یہ سب انہی دونوں اسماء کی تجلیات کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

پوری کائنات پر اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام کا اثر ہے۔ یہ جو جدید سائنسی ترقیات ہو رہی ہیں، کھانے پینے کی جدید چیزیں اور رہنے سہنے کے جدید طریقے، لذتوں و آرام کی نئی نئی شکلیں اور نئی نئی چیزیں ایجاد ہوتی جارہی ہیں یہ سب چیزیں صفتِ رحمانیت کی تجلی ہیں۔

اخروی نجات صفتِ ”رحیمیت“ کا اثر ہے:

”رحیم“ اللہ تبارک و تعالیٰ کی خاص رحمت ہے جن کو انجام کے اعتبار سے کامیاب کرنا اور آرام پہنچانا ہے ان کے لیے ”رحیمیت“ کی تجلی ہوتی ہے۔ دنیا میں اگر کسی کو رحمت ملے لیکن وہ اپنی بے اصولی کی وجہ سے خدا کے بنائے ہوئے ضابطے اور قانون کو توڑ دینے کی وجہ سے آخرت سے محروم ہو جائے، دنیا کی نعمتوں سے غلط استفادہ کر کے آخرت کی نعمتوں سے اپنے آپ کو محروم کرلے تو اس کا اپنا ذاتی نقصان ہے اور جو انجام کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا کی نعمتوں سے ٹھیک ٹھیک فائدہ اُٹھائے تو وہ ”رحیمیت“ کا مستحق بھی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے دین کا اور روحانی اور انسانی تربیت کا جو نظام ہے وہ سب ”رحیمیت“ کا اثر ہے۔ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا تو وہ ”رحیمیت“ کے اثر سے بھیجا۔

دعوت و تبلیغ بھی صفتِ رحیمیت کا اثر ہے:

ایسے ہی اللہ پاک ہر زمانہ میں اپنے نیک بندوں کو گمراہ لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجتے ہیں تو وہ بھی صفتِ رحیمیت کا اثر ہوتا ہے۔

"اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِئَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا"[۱]

"اللہ تبارک وتعالیٰ ہر سو سال کے سرے پر ایسے اللہ والوں کو بھیجتا ہے جو دین کی تجدید کرتے ہیں۔"

اور لوگوں کے لئے قرآن و حدیث کے موافق تربیت پانے کی شکلیں سامنے لاتے ہیں اور اُن کی تربیت اُسی حساب سے کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی نبوت کے اعلان سے اب تک چودہ سو سال سے زائد ہو چکے ہیں، ہر سو سال میں بڑے بڑے انقلابات ہوتے رہے ہیں۔ جب آپ مسلمانوں کی تاریخ پڑھتے ہیں تو آپ کو دین سے غفلت، جہالت، اور دوری کا ایک سیلِ رواں نظر آتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کچھ بندوں کو منتخب کر کے اُن کے ذریعے کچھ ایسی محنتیں وجود میں لاتے ہیں جن کے ذریعے ہزاروں لاکھوں بندے راہ یاب ہو جاتے ہیں جیسے اللہ پاک نے اس زمانے میں بھی مختلف قسم کی محنتیں بالخصوص "دعوت و تبلیغ" کی محنت جاری فرمادی، ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کو اس راستے سے فائدہ پہنچایا جس کا لوگوں کو گمان تک نہ تھا۔ اسی وجہ سے بزرگوں نے فرمایا کہ الیاس نے "یاس" کو "آس" سے بدل دیا۔ ہم لوگ یاس میں تھے اور لوگوں کا سدھرنا بڑا مشکل معلوم ہو رہا تھا، لیکن جب یہ محنت چل گئی تو اب آس لگ گئی کہ سدھر جائیں گے، خلاصہ یہ کہ دین پر چلنے اور جمنے کی جتنی شکلیں وجود میں آتی رہتی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفت "رحیمیت" کی وجہ سے ہوتی رہتی ہیں۔

صفتِ رحمن اور رحیم کے بارے میں ایک تنبیہ:

الرحمن الرحیم کا یہ مفہوم نہیں ہے جیسے کچھ لوگ کہتے ہیں "کھانا وانا"، "پانی وانی"، "شربت وربت" بلکہ الرحمن اپنے ساتھ ایک مستقل معنی رکھتا ہے اور الرحیم اپنے ساتھ مستقل معنی رکھتا ہے۔

---

[۱]: سنن ابی داؤد: الملاحم / باب مایذکر فی قرن المائۃ۔

قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں، اور جہاں جہاں رحمن اور رحیم کا لفظ آیا ہے میں نے دیکھا کہ نعمتوں کے اعتبار سے ان دونوں اسماء سے بہت زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ جیسے مثال کے طور پر لفظ الرحیم کی بہت ساری آیتیں نظر سے گزریں۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ ساری آیتیں آپ کے سامنے سنائی جائیں۔ لفظ ''رحیم'' تقریباً ۱۲۸ یا ۱۳۰ آیتوں میں آیا ہے۔ اور لفظ ''الرحمن'' تقریباً ستاون (۵۷) جگہوں پر آیا۔ میں ان سب کا احاطہ نہیں کرتا لیکن چند آیتیں سنا کر اس کا خلاصہ و مختصر مفہوم سناؤں گا تاکہ آپ کو یہ بات سمجھنے میں سہولت ہو کہ رحمن کا کس طرح اللہ تعالیٰ کی عام یعنی دنیوی نعمتوں کے ساتھ جوڑ ہے اور رحیم کا کس طرح اللہ تعالیٰ کی خاص یعنی اخروی نعمتوں کے ساتھ جوڑ ہے۔

صفتِ ''رحمن'' کے دنیوی نعمتوں کے ساتھ جوڑ کی چند مثالیں:

ایک جگہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

﴿إِنۡ يُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّیۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يُنۡقِذُوۡنِ﴾ ١

اگر رحمٰن میرے حق میں نقصان کرنا چاہے تو ان کی سفارش مجھے کچھ بھی فائدہ نہ دے سکے گی اور نہ وہ مجھ کو چھڑا سکیں گے۔

دنیا میں جو نقصان اور تکلیف پہنچتی ہے اُس سے بچانے کے لیے حق تعالیٰ شانہ ''رحمن'' کا لفظ یہاں استعمال کر رہے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿قُلۡ مَنۡ يَّكۡلَؤُكُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحۡمٰنِ﴾ ٢

''کہو کہ رات اور دن میں خدا سے تمہاری کون حفاظت کر سکتا ہے؟''

١: یس: ۲۳۔ ٢: الانبیاء: ۴۲۔

نافرمانی کی وجہ سے اللہ کی جانب سے عذاب آئے تو حفاظت کون کر سکتا ہے، بلکہ اللہ پاک اپنی جانب سے فضل کا معاملہ فرمارہے ہیں اور دیگر نقصان کی چیزوں سے بھی حفاظت فرمارہے ہیں۔

دن میں دس فرشتوں کا انتظام انسان پر لگا ہوا ہے اور رات میں دس فرشتے انسان کے محافظ ہوتے ہیں۔ سب جگہ سے انسان محفوظ ہے ورنہ شیاطین اور جنات کسی انسان کو رہنے نہ دیں۔ ہمارے دُشمن شیاطین اور جنات ہیں، یہ عام ظاہری دُشمنوں سے زیادہ سخت دُشمن ہیں اور تعداد اور قوت میں بھی بہت زیادہ ہیں۔ وہ ہم لوگوں کو دیکھ رہے ہیں لیکن ہم لوگ انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھوڑی سی ڈھیل دے دی جائے تو یہ لوگ ہم لوگوں کو کچل دیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے حفاظت ہے۔ اسی طرح سانپوں سے، بچھوؤں سے، زہریلی چیزوں سے اور تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرماتے ہیں۔ جب اُن کی کوئی مصلحت ہوتی ہے نقصان پہنچنے کی، تو حفاظت کرنے والے فرشتوں کو ہٹالیا جاتا ہے اور پھر وہ چیز اُس تک پہنچ جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حفاظت کا یہ انتظام دنیا ہی میں ہوتا ہے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ رحمٰن یہاں دنیوی نعمتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

﴿ أَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ إِنِ الْكَافِرُوْنَ إِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ﴾[۱]

”بھلا ایسا کون ہے جو تمہاری فوج ہو کر خدا کے سوا تمہاری مدد کر سکے۔ کافر تو دھوکے میں ہیں“

۱: الملک: ۲۰۔

﴿وَلَوۡلَاۤ اَنۡ یَّكُوۡنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلۡنَا لِمَنۡ یَّكۡفُرُ بِالرَّحۡمٰنِ لِبُیُوۡتِهِمۡ سُقُفًا مِّنۡ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیۡهَا یَظۡهَرُوۡنَ﴾ ا؎

”اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی جماعت ہو جائیں گے تو جو لوگ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں (بھی) جن پر وہ چڑھتے ہیں“۔

اس آیت میں بھی دنیا میں مدد اور دنیوی نعمتوں کا تذکرہ ہے اور یہاں بھی رحمٰن ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

دنیا کافر کے لیے جنت ہے:

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمٰن کی تجلی کافروں پر بھی پڑی ہوئی ہے اور اُن لوگوں کو بھی دنیوی نعمتیں اسی صفتِ رحمٰن کے نتیجہ میں ملی ہیں۔ حق تعالیٰ کا یہ ضابطہ ہے کہ ان لوگوں کو آخرت میں کچھ دینا نہیں ہے کیونکہ وہ آخرت کی تیاری نہیں کر رہے ہیں، آخرت کو مانتے ہی نہیں ہیں، اس لئے دنیا میں ان کے لئے ڈھیل زیادہ ہے، اسی وجہ سے قرآنِ پاک میں حضور پاک ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا:

﴿ذَرۡهُمۡ یَاۡكُلُوۡا وَیَتَمَتَّعُوۡا وَیُلۡهِهِمُ الۡاَمَلُ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ﴾ ۲؎

(اے محمد) ان کو اُن کے حال پر رہنے دو کہ کھا لیں اور فائدے اُٹھا لیں اور (طول) امل ان کو دنیا میں مشغول کئے رہے عنقریب ان کو (اس کا انجام) معلوم ہو جائے گا۔

ایسا نہیں ہے کہ تم بھی اسی ترتیب پر چلو بلکہ جو ہمارے دین کو نہیں مانتا تو دنیا میں اُس کے لیے ڈھیل ہے۔ لیکن آخرت میں اس کی پکڑ سخت ہو گی، یہ بہت بڑا بنیادی فرق ہے جو مسلمانوں کو ذہن میں رکھنا ہے۔ ہم لوگ یہ نہیں چاہتے، بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں:

ا؎: الزخرف: ۳۳۔ ۲؎: الحجر: ۳۔

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ﴾ اے رب ہم دنیا میں بھی حسنہ آپ سے مانگتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ جو ایمان لا کر آخرت کا حسنہ اللہ تعالیٰ سے مانگ لے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحیمیت میں آنا چاہے تو پھر اُس کے لئے ﴿ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ﴾ کا اصول نہیں ہے کہ اسے آزاد چھوڑ دیا جائے، جو چاہے وہ کھائے، پیئے اور مزے اُڑائے، بلکہ اس خصوصی رحمت مین شامل ہونے کے لئے ان چیزوں کو کرنا پڑے گا، جن کا ذکر اُن آیات مبارکہ میں ہے جن میں صفتِ رحیم کو ذکر کیا گیا۔

صفتِ ''رحیم'' کے اخروی نعمتوں کے ساتھ جوڑ کی چند مثالیں:

﴿نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ [1]

(اے میرے پیغمبر) میرے بندوں کو بتادو کہ میں بڑا بخشنے والا (اور) مہربان ہوں۔

یہ معافی اور رحم دنیا سے تعلق نہیں رکھتی، آدمی کو آخرت میں معافی اور رحمت درکار ہے۔

﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ [2]

''ہاں جو لوگ توبہ کرلیں اور (اپنی حالت) سدھارلیں تو اللہ تعالیٰ بھی بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

یہاں پر لفظ ''رحمن'' استعمال نہیں کیا گیا۔ اگر چہ یہ یہاں استعمال کیا جاسکتا ہے، لیکن قرآن کریم کا عجیب اعجاز ہے، اس کا ایک خاص اسلوب ہے، یہاں اللہ پاک نے رحیم کا لفظ استعمال کر کے بتایا کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کرلیا اور اپنی حالت درست کرلی تو اب وہ خاص رحمت کا مستحق ہو گیا، جو خاص رحمت اس پر آخرت میں ہو گی، کیونکہ عام رحمت کافر، فاسق اور گنہگار سب پر ہے لیکن جس نے ان سے برأت کرلی اور فاسقوں اور فاجروں کے زمرہ سے نکل گیا تو وہ اب خاص رحمت کا مستحق ہو گیا، اس لئے رحیم کا لفظ استعمال فرمایا، ایک اور جگہ ارشاد ہے:

۱: الحجر: ۴۹۔ ۲: النور: ۵۔

﴿ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جَاهَدُوْا وَصَبَرُوْا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾[1]

"پھر جن لوگوں نے ایذائیں اٹھانے کے بعد ترک وطن کیا۔ پھر جہاد کئے اور ثابت قدم رہے تمہارا پروردگار ان کو بے شک ان (آزمائشوں) کے بعد بخشنے والا (اور ان پر) رحمت کرنے والا ہے"۔

ظاہر ہے کہ جنہوں نے دین کے لئے مشقتیں برداشت کیں، اللہ کے راستہ میں پہونچائی جانے والی ایذاؤں پر صبر کیا، حتی کہ اپنے وطن کو، جان کو، مال کو اور اولاد کو چھوڑ دیا تو وہ خصوصی رحمت کے مستحق ہوں گے، کیونکہ عمومی رحمت میں سب شامل ہیں، اس لئے خصوصی رحمت ان کے لئے نہیں تو پھر کس کے لئے ہو گی، اس لئے یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے رحیم کا لفظ استعمال کر کے بتایا کہ یہ لوگ بھی خصوصی رحمت کے مستحق ہیں۔

خصوصی رحمت کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں جہنم سے نجات عطا فرمائیں گے، اور ایسی نعمتیں انہیں دیں گے کہ کبھی نہ ان کی آنکھوں نے دیکھا ہو گا، نہ کانوں نے سنا ہو گا، نہ دل میں اس کا خیال آیا ہو گا، سب سے بڑی نعمت رضاءِ الٰہی اور دیدارِ الٰہی ہو گا، ایسی عزت ملے گی جس کے بعد کبھی ذلت نہیں ہو گی۔ ایسا غنا ملے گا جس کے بعد کبھی فقر نہیں آئے گا۔ ایسی تندرستی ملے گی جس کے بعد کوئی بیماری نہیں آئے گی۔ ایسی جوانی ملے گی جس کے بعد کوئی بڑھاپا نہیں آئے گا۔ ایسی زندگی ملے گی جس کے بعد کوئی موت نہیں آئے گی۔ ایسی نعمتیں ملیں گی جو کبھی بھی ختم نہیں ہوں گی، کوئی اس کی لمٹ (Limit) نہیں ہو گی۔

---

[1]: النحل: ۱۱۰۔

خصوصی رحمت کے استحقاق کے لئے درکار امور:

لیکن اس کے لیے بندہ کو بھی کچھ کرنا ہوگا۔ حق تعالیٰ نے اس کے لیے ایک ضابطہ بنایا اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ، نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ، نُزُلًا مِنْ غَفُورٍ رَحِيمٍ﴾[۱]

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے ان پر فرشتے اُتریں گے (اور کہیں گے) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمناک ہو اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا خوشی مناؤ، ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (تمہارے رفیق ہیں)۔ اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو (ملے گی) اور جو چیز طلب کروگے تمہارے لئے (موجود ہوگی)۔ (یہ) بخشنے والے مہربان کی طرف سے مہمانی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾[۲]

"اور اگر معاف کردو اور درگزر کرو اور بخش دو تو خدا بھی بخشنے والا مہربان ہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کے خصوصی رحم کو لینے کے لیے یہ کام کرنے پڑیں گے۔

﴿وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَحِيمًا﴾[۳]

۱: فصلت: ۳۲،۳۱،۳۰ ۔ ۲: التغابن: ۱۴۔ ۳: النساء: ۱۰۰۔

’’اور جو شخص خدا اور رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے پھر اس کو موت آ پکڑے تو اس کا ثواب خدا کے ذمے ہو چکا اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے‘‘

﴿وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ یَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا﴾۱

اور جو شخص کوئی برا کام کر بیٹھے یا اپنے حق میں ظلم کر لے پھر خدا سے بخشش مانگے تو خدا کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا، ظاہر ہے کہ ہجرت، توبہ اور استغفار کے بعد بندہ خصوصی رحمت ہی کا مستحق ہو گا۔

نیز صفتِ رحیمیت کا یہ بھی ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ ضابطہ نہیں ہے کہ ایک وقت یا دو وقت معافی کے بعد تیسری مرتبہ بخشش نہیں ہو گی۔ توبہ کا دروازہ اُس وقت تک کھلا ہوا ہے جب تک سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نہ نکل جائے۔ یا پھر وہ موت کے بالکل قریب نہ ہو جائے، اور آخرت کے احوال اس پر کھلنا شروع نہ ہو جائیں۔

’’اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقۡبَلُ تَوۡبَةَ الۡعَبۡدِ مَالَمۡ یُغَرۡغِرۡ‘‘۲

’’بے شک اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتے ہیں جب تک کہ جان حلق میں آ کر غرغرہ نہ کرے‘‘۔

اگر ایک سو مرتبہ، یا ایک ہزار مرتبہ توبہ کرتا جائے لیکن توبہ ٹوٹتی جائے، پھر بھی سچے دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو رہا ہے کہ یا اللہ! میں کیا کروں، میں تو گناہ نہیں کرنا چاہتا لیکن پھر بھی وہ مجھ سے ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ ہزار مرتبہ کے بعد بھی فرمائیں گے آ جا۔

اللہ تعالیٰ تأثر سے پاک ہیں

اللہ تعالیٰ کے پاس انفعال نہیں ہے۔ انفعال کا مطلب ہے کہ کسی چیز کا اثر قبول کرنا اور اس سے متاثر ہونا، یہ اللہ تعالیٰ کے پاس نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غصہ میں

۱: النساء: ۱۱۰۔ ۲: سنن ترمذی: الدعوات / باب من باب فی فضل التوبۃ الخ۔

آکر آپے سے باہر ہو جاتا ہے، اور کسی پر رحم کرنے میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے، لیکن اللہ پاک نہ غصہ میں آپے سے باہر ہوتے ہیں، اور نہ رحم میں آپے سے باہر ہوتے ہیں۔ اُن کا رحم بھی اختیاری ہے اور اُن کا غصہ بھی اختیاری ہے، اللہ تعالیٰ کے پاس تاثر نہیں ہے۔ کیونکہ تاثر کمزوری ہے اور اللہ تعالیٰ کمزوری سے منزہ ہیں، سبحان ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جو ربوبیت اور رحم فرما رہے ہیں وہ بھی اختیار سے ہے اور جو پکڑتے ہیں، انتقام لیتے ہیں اور سزا دیتے ہیں، وہ بھی اختیار سے ہے، اس لیے حق تعالیٰ کے پاس یہ نظام ہے کہ اگر کسی کی توبہ سو مرتبہ ٹوٹ جائے اور اس کے بعد پھر وہ معافی مانگتا ہے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتے ہیں۔

ایں درگاہ مادرگاہِ نااُمیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

یہ ہماری بارگاہ ہے، نااُمیدی کی بارگاہ نہیں ہے۔ اگر تم سے سو مرتبہ توبہ ٹوٹ جائے تو اس سے باز آؤ۔ اور توبہ کرو، ہم اس کو قبول کرنے والے ہیں ۔

ننانوے قاتل کا واقعہ:

ایک آدمی نے ننانوے قتل کیے۔ اس کے بعد ایک عابد کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا کہ میں نے ننانوے قتل کیے ہیں، کیا میری توبہ قبول کی جائے گی؟ اُس عابد نے کہا کہ ایک کو قتل کرنے والے کا گناہ معاف نہیں ہوتا، تو نے تو ننانوے قتل کیے ہیں، اس لئے تیری توبہ قبول نہیں ہو گی! اُس نے کہا کہ جب میری توبہ قبول ہونے والی نہیں تو کیوں نہ سنچری (Century) پوری کر دوں۔ پھر اُس نے اُس عابد کا بھی کام تمام کر دیا۔ پھر دوبارہ ایک عالم سے پوچھا تو اُس نے اُس کو بتایا کہ تم فلاں جگہ پر جاؤ، وہاں پر اللہ والوں کی بستی ہے، وہاں جا کر تم اپنے گناہ کی معافی مانگ لو، اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہیں،

معاف فرمادیں گے۔ وہ بے چارہ اُس بستی کی طرف توبہ کرنے کے لیے جارہا تھا کہ راستے میں ملک الموت آگئے۔ اور اس کی جان لے لی، جب وہ مر گیا تو رحمت کے فرشتوں میں اور عذاب کے فرشتوں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ عذاب کے فرشتے کہنے لگے کہ یہ سو آدمیوں کا قاتل ہے، اس کی روح ہم نکالیں گے۔ رحمت کے فرشتے کہہ رہے تھے کہ یہ اللہ کی طرف متوجہ ہوکر توبہ کرنے کے لیے جارہا تھا ہم اِس کی روح نکالیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ آدمی کی صورت میں بھیجا، فرشتوں نے اسے حَکَم (فیصل) بنایا اس نے کہا کہ جس جگہ پر اس کی موت واقع ہوئی ہے اس جگہ کی پیمائش کی جائے۔ اگر یہ اس جگہ سے زیادہ قریب ہے جہاں سے یہ گناہ کرکے نکلا ہے تو عذاب کے فرشتے اس کی روح نکالیں گے اور اگر اُس جگہ سے زیادہ قریب ہے جہاں پر یہ توبہ کرنے کے لیے جارہا تھا تو رحمت کے فرشتے اس کی روح نکالیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب ان جگہوں کی پیمائش کی گئی تو حق تعالیٰ شانہ نے اپنی مہربانی اور قدرت سے اسے نیک لوگوں کی بستی کے زیادہ قریب کر دیا، کیونکہ اسے بخشنا تھا، بس اللہ پاک نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھا تو معاف کر دیا۔[۱]

اللہ پاک بندہ کی توبہ سے خوش ہوتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ بندہ کسی نہ کسی طرح میرے پاس آجائے، اور اس کی توبہ سے اتنا خوش ہوتے ہیں کہ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

توبہ سے رضاءِ الٰہی کی ایک تمثیل:

ایک حدیث میں نبی ﷺ نے بندہ کی توبہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشی کو ایک مثال سے سمجھایا۔ آپ نے فرمایا کہ یوں سمجھو کہ ایک آدمی اونٹ پر سوار صحراء سے سفر کرتا ہوا جارہا ہے اور اُس کے اونٹ پر اُس کا توشہ اور پانی ہے۔ اور اس کے سفر کا سارا

[۱]: صحیح مسلم: کتاب التوبۃ، باب قبول توبۃ القاتل وان کثر قتلہ۔

سامان اسی اونٹ پر لدا ہوا ہے، وہ راستے میں تھوڑی دیر سستانے کے لیے سو گیا، جب اُٹھا تو اُس کا اونٹ غائب ہو گیا۔ اب وہ اُس کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا، مگر اونٹ نہ ملا تو یہ تھک ہار کر زندگی سے مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ اور موت کا انتظار کرنے لگا، اسی اثناء میں پھر اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا، جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے سامنے اُس کا اونٹ کھڑا ہے اور اُس کا سامان، توشہ اور سب چیزیں موجود ہیں۔ اپنے اس اونٹ اور سامان کو دیکھ کر اسے جو خوشی ہوئی اُس خوشی میں اُس نے اللہ تعالیٰ کی تعریف اور شکر ادا کیا۔ اور یوں کہا کہ: "اَللّٰهُمَّ أَنْتَ عَبۡدِيۡ وَأَنَا رَبُّكَ أَخۡطَأَ مِنۡ شِدَّةِ الۡفَرَحِ "[1] اے اللہ آپ میرے بندے ہیں اور میں آپ کا خدا ہوں، اور اس نے فرطِ خوشی سے غلط کہہ دیا۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ اگر کوئی بندہ مارے خوشی کے فرطِ مسرت میں خود کو خدا کہے اور خدا کو اپنا بندہ کہہ دے تو اُسے کتنی خوشی ہوئی ہو گی۔ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی نافرمان بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کے لیے متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس بندہ سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔

اس لئے اگر کسی کو خصوصی رحمت حاصل کرنی ہے تو پھر ان چیزوں کو کرنا ضروری ہے، جن کا گزشتہ آیات میں تذکرہ کیا گیا، یہ چند آیتیں آپ کے سامنے صفتِ رحمن اور رحیم سے متعلق بیان کی گئیں، تاکہ رحمن اور رحیم کا دنیوی اور اخروی نعمتوں کے ساتھ جوڑ سمجھ میں آئے، اور اللہ پاک کی بندوں پر مہربانی اور رحم و کرم کا کچھ استحضار ہو جائے۔

---

[1]: صحیح مسلم: التوبۃ/ باب فی الحض علی التوبۃ والفرح بہا۔

”مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ“ کی تشریح

”روزِ جزا کا مالک ہے“

قرآن پاک کے تین بنیادی مضامین:

قرآن پاک میں بنیادی طور پر تین مضامین بیان کئے گئے ہیں:

(۱) ایک توحید: جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی الوہیت، معبودیت اور وحدانیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ (۲) دوسرا مضمون رسالت کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو راہِ راست پر لانے اور گمراہی اور ظلمت کے گہرے دلدل سے بچانے کے لئے رسولوں کو بھیجا۔ (۳) تیسرا مضمون آخرت کا ہے، یعنی مرنے کے بعد انسانوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ دوبارہ زندہ فرمائیں گے اور سارے انسانوں کے ساتھ اُن کے اعمال کے اعتبار سے برتاؤ کیا جائے گا۔

ابتدائی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت کا بیان تھا۔ ﴿مالك يوم الدين﴾ میں قیامت کا بیان ہے۔ آگے ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ، صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ میں رسالت کا بیان ہے۔ یہ تین بنیادی مضامین کو سمیٹ کر اس مبارک سورہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سورت دعا بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں مضامینِ قرآن کا اجمالی ذکر بھی ہے، تاکہ جب آدمی نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھے تو اُس کا دھیان اجمالی طور پر دین کے مقصود کی طرف آجائے اور اُس کا ذہن اللہ تعالیٰ کی طرف کامل متوجہ ہو جائے۔

اس لیے آج ﴿مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ﴾ سے متعلق آخرت کے کچھ مضامین آپ کے سامنے ذکر کئے جائیں گے۔

"مَالِكِ" میں ایک قرأت مَلِكِ بھی ہے، جو مُلْك سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ہیں: بادشاہت، مکمل غلبہ، اور کسی بھی چیز پر قدرتِ تامہ کا مالک ہونا۔[1]

کسی کو ملک الملوک یا شہنشاہ کہنے کا حکم:

پس اللہ تعالیٰ روزِ جزا کے مالک ہیں، ملکیتِ حقیقی تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ہے، وہی درحقیقت بادشاہ ہیں اور ایسے بادشاہ ہیں کہ اس جیسا کوئی دوسرا بادشاہ نہیں، وہ بادشاہوں کے بھی بادشاہ ہیں۔

اسی وجہ سے ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تم کسی کو "ملک الاملاک" یا "ملک الملوک" یا "شہنشاہ" مت کہو، کیونکہ اللہ پاک کے نزدیک قیامت کے روز سب سے زیادہ ذلیل وخوار اور زیادہ غضب کا باعث وہ شخص ہے جس کو اس نام سے پکارا جاتا ہے۔

"أَخْنَى الأَسْمَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ اللهِ رَجُلٌ تُسَمّٰى مَلِكَ الأَمْلَاكِ"[2]

دوسری روایت میں اس کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ حقیقی مالک اور بادشاہ تو اللہ ہے۔[3] لہٰذا دوسروں کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔

مستدرکِ حاکم کی روایت میں شہنشاہ کا اضافہ بھی مروی ہے:

"إِنَّ أَخْنَعَ الْأَسْمَاءِ عِنْدَ اللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ تُسَمّٰى مَلِكُ الْأَمْلَاكِ شاهان شاه"[4]

اس کے بعد یوم کا لفظ ہے، یوم سے مراد عرفاً سورج کے طلوع سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں، اور شرعاً صبح صادق سے غروب شمس تک کے وقت کو کہتے ہیں، لیکن یہاں مراد مطلق وقت ہے۔

---

[1]: تفسیر ابو السعود وروح المعانی: ۱۵۸و۵۹۔ [2]: صحیح بخاری: کتاب الادب، باب ابغض الاسماء الی اللہ تعالیٰ۔ [3]: صحیح مسلم: باب تحریم التسمی بملک الاملاک وبملک الملوک۔ [4]: المستدرک علی الصحیحین: کتاب الادب۔ (واضح رہے کہ "شہنشاہ" کا لفظ دوسری روایتوں میں نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے ملک الملوک کی تفسیر اس لفظ سے کی ہو۔)

اور دین سے مراد بدلہ ہے، خواہ اچھا ہو یا برا۔

اس بدلہ کے دن کے مالک اللہ تعالیٰ ہیں، اس دن کوئی کسی کا مالک نہیں ہوگا، ملکیت صرف اللہ کی ہوگی، بادشاہت صرف اللہ کی ہوگی، اس دن اللہ پاک فرمائیں گے۔

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾[۱]

آج کس کی بادشاہت ہے؟ خدا کی جو اکیلا اور غالب ہے۔

اسی بدلہ اور جزا کے دن کی تشریح اللہ پاک نے دوسری جگہوں پر بیان فرمائی۔

سورۂ انفطار میں ہے:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ، وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ، يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ﴾[۲]

بیشک نیک لوگ بہشت میں ہیں، اور بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں، (یعنی) جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے۔

﴿وَمَا أَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ ثُمَّ مَا أَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾[۳]

"اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟ پھر تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟ جس دن کہ بھلا نہ کر سکے کوئی جی کسی جی کا کچھ بھی۔ اور حکم اُس دن اللہ ہی کا ہے"

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾[۴]

"آج کے دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔"

نیک اعمال کا بدلہ اچھا ہوگا، برے اعمال کا بدلہ برا ہوگا، لیکن برائی کی وجہ سے اس کو جہنم میں ڈالنا اور اس کو عذاب دینا اللہ کے لئے لازم نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ اللہ پاک اپنی رحمت سے اسے معاف فرمائیں، یا پھر اللہ پاک اپنے نیک بندوں کو سفارش کی اجازت دیں گے، ان کے سفارش کرنے پر ان کی مغفرت فرمائیں گے۔

۱: غافر: ۱۶۔ ۲: الانفطار: ۱۳، ۱۴، ۱۵۔ ۳: الانفطار: ۱۰ او ۱۱ او ۱۲۔ ۴: غافر: ۱۷۔

قیامت میں سفارش کام آئے گی:

یہ شفاعت ہر ایک کے لئے نہیں ہو گی بلکہ اللہ جس کو اجازت دیں گے، وہی شفاعت کر سکیں گے، آیۃ الکرسی میں اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾[1]

"کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس سے (کسی کی) سفارش کر سکے"

شفاعت کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ:

مشرکین مکہ بتوں کو پوجتے تھے اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے، اور ہم کو اللہ سے قریب کریں گے:

﴿هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾[2]

"یہ تو ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس"

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾[3]

(وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں تا کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

اللہ پاک نے ان کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تمہارا عقیدہ غلط ہے، ہر کوئی اللہ کے پاس سفارش نہیں کر سکتا، اللہ پاک جس کو اجازت دیں گے وہی سفارش کر سکے گا۔

سفارش کے حق دار کون ہیں؟

اب کن کن کو سفارش کی اجازت ہو گی؟ اور کیسی سفارش کی اجازت ہو گی؟ تو احادیثِ مبارکہ میں نبی ﷺ نے ان کو بیان فرمایا، خود آپ ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ دیگر انبیاء شفاعت کریں گے، شہداء، علماء، حجاج، حفاظ اور اس اُمت مسلمہ کے فقراء شفاعت کریں گے۔

۱: البقرۃ:۲۵۵۔ ۲: یونس:۱۸۔ ۳: الزمر:۳۔

سب سے بڑی شفاعت:

شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شفاعت کی دس اقسام ذکر کی ہیں۔ سب سے بڑی شفاعت شفاعتِ کبریٰ ہے، یعنی جس وقت لوگ میدانِ محشر میں کھڑے ہوں گے، اور برس ہا برس گزرنے کے بعد بھی حساب وکتاب شروع نہیں ہوگا اور رب ذوالجلال اس وقت اس قدر غضبناک ہوں گے کہ اس سے پہلے نہ اتنا غصہ ہوئے ہوں گے اور نہ کبھی اس کے بعد اتنا غصہ ہوں گے۔ اللہ پاک کے جلال کو دیکھ کر تمام انبیاء کو تھر تھراہٹ ہوگی اور کسی نبی کو حوصلہ نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر یہ کہیں کہ اے اللہ! مخلوق کا حساب شروع فرمادیں۔ سب لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ کسی کو ہمت نہیں ہوگی، پھر سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے اور آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ اللہ پاک سے حساب شروع کرنے کی سفارش فرمایئے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمائیں گے کہ ہاں! میں اسی کے لیے ہوں، پھر آپ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوں گے اور اللہ کی ایسی ثنا بیان کریں گے کہ کسی نے آج تک اس جیسی ثنا نہ کی ہوگی اور نہ آئندہ کوئی کرے گا۔[۱] اس سفارش کا راز کیا ہے؟ قرآن مجید میں اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا: ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ کہ اللہ نے آپ کے اگلے اور پچھلے سب چیزوں کو بخش دیا، یہ ایک راز ہے۔ کسی نبی کے لیے پہلے سے یہ بات نہیں کہی گئی کہ تمہارا اگلا پچھلا معاف ہے، نبی تو معصوم ہوتے ہیں، اُن کا جنت میں جانا قطعی اور یقینی ہوتا ہے، مگر اللہ کی طرف سے کسی کے لیے صراحتاً یہ جملہ ارشاد نہیں فرمایا گیا ہے، صرف سرکارِ دو

۱: صحیح بخاری: کتاب التفسیر/باب قولہ تعالی وعلم آدم الاسماء کلہا۔

عالم ﷺ کیلئے یہ جملہ ارشاد فرمایا گیا، علماء نے لکھا ہے کہ کل میدانِ حشر میں اسی آیت کی بنیاد پر ہی حضور ﷺ حوصلہ فرمائیں گے۔

دنیا اور آخرت کی شفاعت میں فرق:

اب یہ جو سفارش ہو گی تو کیا دنیا کی سفارش کی طرح ہو گی یا کچھ الگ ہو گی؟ ظاہر ہے کہ قیامت کے دن جو شفاعت ہو گی اُس کی نوعیت الگ ہو گی اور دنیا میں جو سفارش اور شفاعت ہوتی ہے اُس کی نوعیت الگ ہوتی ہے، دنیا کی شفاعت کو آخرت کی شفاعت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

کیونکہ دنیا میں جس کے پاس کسی کی سفارش کی جاتی ہے تو اُس کے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے سفارش کی جاتی ہے۔ مثلاً سفارشی یہ کہتا ہے کہ میں اسے جانتا ہوں، یہ واقعی ضرورتمند ہے، مجبور ہے، قابلِ رحم ہے، اس سے غلطی ہو گئی، آپ اسے معاف کر دیجیے، یا آپ اسے نوکری دلا دیجیے وغیرہ وغیرہ، ان تفصیلات اور مجبوریوں کو سامنے والا نہیں جانتا، لیکن حق تعالیٰ شانہ، وہ تو علیم بذات الصدور ہیں، وہ تو علام الغیوب ہیں، اس لیے دنیا میں جس نوعیت کی سفارش اور شفاعت ہوتی ہے وہ آخرت میں نہیں ہو گی۔

شفاعت کی نفی کا مصداق:

اسی وجہ سے قرآن پاک میں کہیں شفاعت کی نفی ہے اور کہیں شفاعت کا اثبات ہے۔ اب جو لوگ صرف ترجمہ دیکھتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ کوئی کسی کی سفارش نہیں کرے گا جب کہ دیگر آیات اور احادیثِ مبارکہ سے حضور پاک ﷺ اور دوسرے لوگوں کے لئے سفارش کا ثبوت ہے، اس کا کیا جواب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دنیاوالی شفاعت وہاں پر نہیں چلے گی۔ کافروں کی سفارش وہاں نہیں چلے گی، یا آدمی اپنا اختیار اور اپنا حق سمجھ کر وہاں سفارش نہیں کر سکے گا، جن آیتوں میں سفارش کی نفی ہے وہاں یہی مراد ہے، البتہ اللہ پاک جس کو چاہیں گے جس کے حق میں چاہیں گے سفارش کی اجازت دیں گے، پھر شفاعت کی بنیاد پر اس کی معافی ہو گی۔

شفاعت کا مقصد:

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ پاک معاف کر رہے ہیں تو سفارش کیوں کروا رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سفارش کا مقصد صرف اللہ پاک کے مخصوص بندوں کا مقام اور ان کا قرب اور بزرگی بتانا ہو گا، حافظ کا مقام بتانے کے لیے، عالم کا مقام بتانے کے لیے، حاجی کا مقام بتانے کے لیے، صابرین کا مقام بتانے کے لیے، ولی کا مقام بتانے کے لیے، نبی کا مقام بتانے کے لیے، امام الانبیاء ﷺ کا مقام بتانے کے لیے شفاعت کی اجازت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کو حساب اور کتاب تو لینا ہی ہے۔ حساب ہی کے لیے یومِ حشر ہے مگر اللہ تعالیٰ حساب نہیں لیں گے جب تک حضور ﷺ نہیں فرمائیں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ مخلوق کو یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ایسی ذات ہے جو پوری مخلوق میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ کوئی ایسا حوصلہ نہیں کر سکتا جو مجھ سے درخواست کرے کہ آپ مخلوق کا حساب کتاب شروع کریں، صرف یہ ایک ذات ہے جو حوصلہ کر سکتی ہے۔ باقی دوسری ذواتِ مقدسہ انبیاء اور فرشتے سب کے سب اُس دن حوصلہ نہیں کر پائیں گے، جبرئیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام، حاملانِ عرش کو یہ حوصلہ نہیں ہو گا، نبیوں کو بھی نہیں ہو گا، صرف امام الانبیاء ﷺ کو ہو گا، تب مخلوق کو پتہ چلے گا کہ اللہ کے پاس آپ ﷺ کا کتنا اونچا مقام ہے، اُن کے مقامِ نبوت کو بتانے کے لیے یہ شفاعتِ کبریٰ کا نظام ہے۔

نظامِ شفاعت سے دھوکہ نہ کھائیں:

لیکن آدمی اس نظامِ شفاعت کی وجہ سے دھوکے میں آجاتا ہے، اور شفاعت کا سہارا لے کر اعمال سے غافل ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ شانہ نے اُس کا علاج بیان کیا کہ ایک بدلہ کا دن ہے، اس دن کا میں مالک ہوں میرے علاوہ کوئی اور مالک نہیں ہو گا، بادشاہت میری ہوگی، سلطنت میری ہوگی، اس دن ایک ایک عمل کا بدلہ سامنے ہو گا، برا کام کیا ہو تو برا نتیجہ بھی دیکھے گا، اس لئے دنیا میں ڈر کر میرے حکم کے تابع رہ، کسی کے سہارے کی امید نہ رکھ، کیا پتہ کہ تو نے کسی سے سفارش کی امید رکھی، لیکن اللہ پاک نے اسے سفارش کا موقع نہ دیا، یا موقع تو دیا لیکن تیرے لیے نہیں دیا تو اس وقت کیا ہو گا؟[۱] اس لئے اس بدلہ کی دن کی تیاری کرنی ہے، اور وہاں صحیح نتیجہ بر آمد ہونے کے لئے اعمال بھی اسی اعتبار سے کرنے ہوں گے۔

دنیا بدلہ کی جگہ نہیں، عمل کی جگہ ہے، یہاں دین پر عمل کرنا ہے، اس کا بدلہ ضرور تمہیں ملے گا۔ عام طور پر دین پر عمل کرنے کا بدلہ نظر نہیں آتا۔ جاب (Job) کا بدلہ نظر آتا ہے، پیسے کا بدلہ نظر آتا ہے، چیز کا بدلہ نظر آتا ہے مگر دین کا بدلہ نظر نہیں آتا، اسی لئے آدمی اس سے غفلت میں ہے، حالانکہ دین کے معنی خود "بدلہ" کے ہیں۔

﴿كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ﴾

عربی کا مشہور مقولہ ہے۔ حضرت ابو قلابہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[۲]

جیسا تم کرو گے ویسا ہی بدلہ پاؤ گے، لیکن اس بدلہ پر یقین کامل نہیں ہے۔

---

[۱]: شفاعت کی تفصیل حضرت کی دیگر کتب موضوعاتی درس قرآن آیۃ الکرسی اور درس عقیدۃ الطحاوی میں مذکور ہے، وہاں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ [۲]: مصنف عبد الرزاق: ۲۰۲۶۲ و کنز العمال: ۴۳۰۳۲۔

دنیا دار العمل ہے:

پوری دنیا یہ آفس ہے، جاب کی جگہ ہے، یہاں عمل کرنا ہے، عمل کے بعد تنخواہ ملے گی، لیکن تنخواہ یہاں نہیں ملے گی بلکہ تنخواہ اوپر جانے کے بعد ملنے والی ہے۔ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ یہیں ہم کو بدلہ مل جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کو یہاں مکمل بدلہ کیسے دیا جائے؟ کیونکہ ابھی بدلہ اور تنخواہ کا وقت آیا نہیں ہے، ویسے دنیا میں اعمال کا بدلہ دیا بھی نہیں جاسکتا، اس لئے مرنے تک آدمی کو عمل کرنا پڑے گا، اپنے کام کو مکمل کرنا پڑے گا، جیسے دنیا میں مقررہ وقت سے پہلے تنخواہ نہیں دی جاتی، یا کام کی تکمیل سے پہلے اس کا بدلہ نہیں دیا جاتا، ایسے ہی اخروی معاملہ بھی ہے، ویسے اللہ پاک کی جو نعمتیں ہم پر ہیں اس کے مقابلہ میں تو ہمارے اعمال کچھ بھی نہیں، اپنے اعمال سے ہم دنیا میں دی گئی ایک نعمت کا بھی حق ادا نہیں کرسکتے، تو بدلہ محض اللہ کے فضل کی وجہ سے ہوگا۔ جاب کے وقت آدمی اپنا پسینہ بہاتا ہے، محنت بھی کرتا ہے، مشقت بھی اُٹھاتا ہے، مصیبت بھی بھگتا ہے، جو جتنا زیادہ محنت کرتا ہے اُس کو اُتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں نے محنت کرکے یہ چیز کمائی ہے، حلال پیسے کمارہا ہوں۔ اگر کوئی آدمی اتنی محنت دیکھ کر رحم کھائے کہ یہ بڑی پریشانی اور مصیبت میں ہے، اس کی جاب ختم کروادو تو اس کو کون پسند کرے گا؟ حالانکہ مصیبت بھگت رہا ہے لیکن کوئی پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی شکایت کرکے یا کسی اور طرح سے سفارش کرواکر اس کی جاب ختم کروادے بلکہ وہ اس سے خوش ہوتا ہے، کیونکہ تیس دن کے بعد جو کچھ اُس کو ملنے والا ہے اُس کے لیے اس مصیبت اور پریشانی کو برداشت کرتا ہے۔ ایسے ہی ہمیں آخرت کی ابدی نعمتوں، اور ہمیشہ ہمیش کا آرام اور راحتوں کو دیکھ کر چند دن یہاں اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی ہے۔ اس کے بعد پھر جو ہمیں بدلہ ملے گا وہ ایسا ہوگا کہ نہ ہماری آنکھوں نے کبھی دیکھا ہوگا اور نہ ہمارے کانوں نے کبھی سنا ہوگا اور نہ کبھی ہمارے دل میں اس

کا خیال آیا ہو گا۔ جب حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور اولیائے اُمت کے دل پر یہ بات کھلی تو دنیا میں اللہ کے لیے محنت و مشقت اُٹھانا اُن کے لیے آسان ہو گیا اور جان و مال کو نچھاور کرنا اُن کے لیے آسان ہو گیا۔ آدمی جو اختیار سے محنت کرتا ہے وہ بھی اُن کے لیے آسان ہو گیا اور غیر اختیاری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مصیبتیں آتی ہیں اُن کو سہنا بھی اُن کے لیے آسان ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ضابطہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مشقت آئے گی، آدمی اپنے اختیار سے جو محنت کرے گا مثلاً تہجد پڑھے گا، نوافل پڑھے گا، اشراق پڑھے گا، چاشت پڑھے گا، مدارس بنائے گا، مساجد بنائے گا، غریبوں کی مدد کرے گا اُس کا اس کو بدل ملے گا، غیر اختیاری طور پر جو بیماری آگئی، مثلاً حادثہ ہو گیا، ایکسیڈنٹ ہو گیا، جان و مال پر کوئی آفت آگئی، اولاد پر کوئی مصیبت آگئی اُس پر بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے بدلہ دیا جائے گا۔

غیر اختیاری مصیبت پر بھی اَجر ہے:

ایک حدیث پاک میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آخرت میں کسی بندے کو مرتبہ دینا چاہتے ہیں اور دنیا میں وہ آدمی اپنے عمل سے وہ مرتبہ حاصل نہیں کر پا رہا ہے تو اللہ پاک اس کے جسم، اس کے مال اور اس کی اولاد کو مصیبت میں ڈال دیتے ہیں، اگر وہ صبر کرتا ہے تو اس کو اس مرتبے پر پہونچا دیا جاتا ہے جو مرتبہ اللہ تبارک و تعالیٰ اُس کو آخرت میں دینا چاہتے ہیں۔[1]

اس دنیا میں جو مصیبتیں مسلمانوں پر آرہی ہیں یہ صورتاً مصیبتیں ہیں، حقیقتاً مصیبتیں نہیں ہیں۔ غیر مسلم پر جو مصیبت ہے وہ مصیبت برائے مصیبت ہے اور مسلمان پر جو مصیبت ہے وہ در حقیقت مصیبت نہیں، بلکہ وہ اس کے لئے رحمت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اُس سے اُس کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔[2] یا اُس کو وہ درجہ ملتا ہے جو اللہ پاک اُسے آخرت میں دینا چاہتے ہیں۔

---

[1]: سنن ابی داوٗد: الجنائز/ باب الامراض المکفرۃ للذنوب۔ [2]: صحیح بخاری: کتاب المرضی / باب ماجاء فی کفارۃ المرضی، ۵۳۱۸

جتنا قرب اتنی مصیبت:

جو آدمی جتنا زیادہ نیک اور اللہ کے قریب ہوتا ہے اس پر اتنی زیادہ مصیبتیں آتی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! لوگوں میں سخت بلاؤں اور مصیبتوں میں کون مبتلا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: انبیاء، صحابہ نے پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون؟ آپ نے فرمایا: علماء، انہوں نے پھر پوچھا کہ پھر کون؟ آپ نے فرمایا: صالحین اور نیک لوگ۔[1]

بخار بھی گناہوں کا کفارہ ہے:

ایک حدیث میں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اگر کوئی مصیبت آجائے تو اُسے بُرا مت کہو۔ ایک صحابیہ جاڑے کی وجہ سے کپکپاتی ہوئی جارہی تھیں۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اُدھر سے گزرے، آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ”مَالَكِ ؟يَا أُمَّ السَّائِبِ أَوْيَا أُمَّ الْمُسَيَّبِ تُزَفْزِفِيْنَ“

”اے ام سائب یا اے ام مسیب تمہیں کیا ہوا تم کپکپاتی ہو؟“

انہوں نے کہا: ”حُمّٰى لَا بَارَكَ اللّٰهُ فِيهَا“

”اے اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم! بخار ہے، اللہ اس میں برکت نہ دے۔“

فرمایا: ”لَا تَسُبِّى الْحُمّٰى فَإِنَّهَا تُذْهِبُ خَطَايَا بَنِيْ آدَمَ كَمَا يُذْهِبُ الْكِيْرُ خُبْثَ الْحَدِيْدِ“[2]

”بخار کو بُرا مت کہو، کیونکہ یہ بنی آدم کے گناہوں کو اس طرح ختم کردیتا ہے جیسے دھونکنی لوہے کے خبث (زنگ، میل) کو دور کردیتی ہے۔“

آدمی کے ذہن پر جو پریشانیاں اور اُلجھنیں سوار ہوتی ہیں ان سب کے ذریعے آدمی اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ مرتبے تک پہنچتا رہتا ہے۔ جب اصحابِ معرفت پر یہ چیز کھل

---

[1]: مستدرک حاکم: کتاب الایمان۔ [2]: صحیح مسلم: البر والصلۃ والآداب/باب ثواب المومن فیمایصیبہ من مرض...۔

گئی تو دنیا میں جو مصیبتیں اُن پر آئیں اُن پر اُنہیں مزہ آنے لگا۔ کچھ اہل اللہ ایسے گزرے ہیں جو نعمتوں کے مقابلے میں مصیبتوں کو پسند کرتے تھے۔ دنیا میں کچھ انبیاء اور اولیاء ایسے ملیں گے جنہوں نے مصیبت کو ترجیح دی کیونکہ اُن کو معلوم ہے کہ یہ دنیا کی دو روزہ اور چند روزہ بہار ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے اُس کا بدلہ ہمیں آخرت میں مل جائے گا۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شاعر کہتا ہے:

"ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف   بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد"

کہ جب جنگل کے ہرن کسی سے محبت کرتے ہیں تو وہ اپنا سر اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنے محب کی طرف آتے ہیں، اس امید پر کہ کس روز وہ شکار کیلئے آئے گا۔

اونٹوں کی جاں نثاری:

حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سو اونٹوں کی قربانی کی۔ تریسٹھ اونٹوں کو آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے ذبح فرمایا۔ حضور ﷺ کی طاقت کا اندازہ کیجیے، جب آپ ﷺ نے تریسٹھ اونٹوں کو ذبح کیا تو روایتوں میں یہ مضمون آتا ہے کہ اونٹ حضور ﷺ کے سامنے اپنی گردن بچھانے کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ "كُلُّهُنَّ يَزْدَلِفْنَ اِلَيْهِ بِاَيَّتِهِنَّ يُبْدَاُ"[1] تمام کے تمام آپ سے قریب ہوتے تھے کہ ان میں سے کسی سے ابتداء کی جائے۔

ایسے ہی اہل اللہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے حالات کا اسی طرح استقبال کرتے تھے اور جب وہ غیر اختیاری حالات کا اس طرح استقبال کرتے تھے تو کیا نماز اُن کے لیے بھاری تھی؟ روزہ اُن کے لیے بھاری تھا؟ صدقہ و خیرات اُن کے لیے بھاری تھے؟ عبادت اُن کے لیے بھاری تھی؟ یہ چیزیں اُن کے لیے انتہائی آسان تھیں۔

---

[1]: سنن ابی داوٗد: کتاب المناسک / باب فی الھدی اذا عطب قبل اَن یبلغ۔

بہرحال حق تعالیٰ شانہ کا یہ نظام ہے کہ یہاں دنیا میں ہم بیٹھنے کے لیے نہیں آئے، بلکہ ہم کو کام کرنا ہے، یہاں ہم کو محنت کرنی ہے، وہاں جاکر بدلہ پانا ہے۔

لفظ مالک سے متعلق ایک نکتہ:

مالک اور حاکم دونوں کے معنی تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اگر یہاں پر ''حاکم'' کا لفظ استعمال کریں تو وہ بات نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ''حاکم'' جزوی تصرف کرتا ہے کلّی تصرف نہیں کرتا۔ اور مالک ہر اعتبار سے تصرف کر سکتا ہے۔ ہماری حکومت کرنے والے بھی حاکم ہیں، مگر وہ ہماری ذات میں کلّی تصرف کے مجاز نہیں ہیں۔ اس لفظ کا ستعمال کر کے اللہ پاک نے بتادیا کہ ہر طرح کا تصرف صرف میں ہی کر سکتا ہوں، یہ صرف میرے اختیار میں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حاکم خود قانون کا پابند ہوتا ہے، لیکن مالک کسی قانون کا پابند نہیں ہوتا، اس میں اشارہ کر دیا کہ میرے پاس آؤ تو مالک سمجھ کر آؤ، حاکم سمجھ کر نہیں، کل تم آؤ گے، قانون کہے گا کہ اس کو اس کے گناہوں کی وجہ سے عذاب دینا چاہئے لیکن میں قانون کا پابند نہیں ہوں، میں اپنی رحمت کے دروازے کھول دوں گا اور اس کو معاف کر دوں گا۔

دیکھئے یہ قرآن پاک کا اعجاز ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے ایک ایک جملے میں کیا کیا چھپا رکھا ہے؟ اگر اُن کی جگہ کوئی متبادل لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے وہ مفہوم نہ نکلتا جو اس لفظ سے نکلتا ہے۔ اسی وجہ سے عربی کتابوں میں قرآن پاک کی عبارت اور جملوں کے لئے لفظ کا استعمال نہیں کیا جاتا، بلکہ ''نظم'' کا استعمال ہوتا ہے، کیونکہ نظم کہتے ہیں موتی کے پرونے کو۔ قرآن پاک کا ایک ایک کلمہ ایسا ہے جیسے دھاگے میں موتی کو پرویا گیا ہو۔ اور لفظ کے معنی آتے ہیں پھینکنے کے، ظاہر ہے کہ اس لفظ کو استعمال کرنے میں

ایک طرح کا سوءِ ادب ہے، اگرچہ کہ لوگ لفظ کا بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اصولِ فقہ، اور اصولِ تفسیر کی کتابوں میں ”نظم القرآن“ کا لفظ ہی عموماً استعمال کیا گیا ہے۔

ملکیت کی صرف یوم قیامت کی طرف نسبت کیوں؟

یہاں کسی کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز کے مالک ہیں، ہر وقت کے مالک ہیں، ہر دن کے مالک ہیں تو یہاں ملکیت کو قیامت کے دن کے ساتھ خاص کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں کچھ چیزوں کا مالک بنایا ہے اور مجازاً ہم اسے اپنی ملکیت میں سمجھتے ہیں۔ جیسے میرا کپڑا، میرا سوئیٹر، میری ٹوپی، میری عینک، میری چپل، میرا مکان، میرا پلاٹ، میری کار وغیرہ وغیرہ، لیکن در حقیقت اس کے مالک بھی اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہیں۔ لیکن قیامت کا دن ایسا عجیب و غریب دن ہے جس میں اس طرح کسی کی کوئی ملکیت نہیں ہو گی۔ اسی کو بتانے کے لئے قیامت کے دن کی طرف ملکیت کی نسبت کی کہ اس دن کوئی بھی کسی بھی چیز کا کسی بھی طرح کا مالک نہیں ہو گا۔ حتیٰ کہ خدا کے دربار میں آدمی اس طرح آئے گا کہ وہ اپنے بدن پر لپٹے کفن سے بھی عاری ہو گا۔

جیسا کہ ایک روایت میں آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اس دن لوگوں کو بالکل برہنہ جمع کیا جائے گا تو اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ! ایک دوسرے کو سب کچھ نظر آجائے گا۔“ مرد اور عورت ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟

فرمایا: ”معاملہ اتنا اہم ہو گا کہ کسی کو ایک دوسرے کے جسم دیکھنے کا حوصلہ اور موقع نہیں ہو گا۔“[۱]

---

[۱]: صحیح بخاری: کتاب الرقاق/باب کیف الحشر۔

پچاس ہزار سال گزر جائیں گے کیونکہ قرآن پاک میں قیامت کے دن کو پچاس ہزار سال کا بتلایا گیا ہے۔[1] لیکن ایک دوسرے کا جسم نہیں دیکھ پائیں گے۔

آپ اندازہ کیجئے کہ وہ دن کیسا ہو گا،

قیامت میں اعضاء آدمی کے خلاف گواہی دیں گے:

اُس دن کوئی آدمی اپنی کسی چیز کا مالک نہیں ہو گا نہ مال کا نہ جائداد کا حتیٰ کہ اپنے اعضائے جسم کا بھی مالک نہیں ہو گا۔ یہاں تو آدمی کہہ دیتا ہے کہ میرا ہاتھ ہے، میری آنکھ ہے، میرا پیر ہے کل میدانِ حشر میں یہ ملکیت بھی نہیں رہے گی خود آدمی کے اعضاء اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾[2]

”وہ دن ایسا ہو گا کہ آدمی کی زبان، آدمی کے ہاتھ اور آدمی کے پیر اُس کے خلاف گواہی دیں گے کہ اُن کو اپنے اوپر بھی ملکیت نہیں ہو گی، آدمی کا اپنے ہاتھوں اور پیروں پر بھی کوئی تصرف اور کنٹرول نہیں ہو گا۔“

﴿أَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾[3]

آج اُس ذات نے ہمیں گویائی دے دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی۔ اس لئے سارے اعضاء اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾[4]

۱: المعارج:۴۔ ۲: النور:۲۴۔ ۳: فصلت:۲۱۔ ۴: النور:۲۴۔

”(یعنی قیامت کے روز) جس دن ان کی زبانیں ہاتھ اور پاؤں (سب) ان کے کاموں کی گواہی دیں گے “

﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللّٰهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ، حَتّٰى إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ ۱

”اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے ان کی جماعتیں بنائی جائیں گی، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور چمڑے (یعنی دوسرے اعضاء) ان کے خلاف ان کے اعمال کی شہادت دیں گے “

سب سے پہلے بائیں ران گواہی دے گی:

حضور ﷺ نے فرمایا: ”سب سے پہلے انسان کے جسم کا جو حصہ گواہی دے گا وہ اُس کی بائیں ران ہوگی۔“ بائیں ران سب سے پہلے کہنا شروع کرے گی کہ یا اللہ! یہاں سے یہ کام سرزد ہوئے۔ پھر اُس کے بعد تمام اعضاء گواہی دے دیں گے اور جتنے کام اُس نے مرنے تک کیے ہیں ان سب کی گواہی دیں گے۔ ۲

جو آنکھ نے دیکھا ہے، کل سب کے سامنے اس کی گواہی دے گی، آنکھ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کیمرہ کا کام کرتی ہے اور فوٹو لے لیتی ہے۔ جس کسی کو بھی آپ نے دیکھا اُس کا فوٹو سامنے کر دے گی۔ جسم میں یہ خصوصیت ہے کہ جسم جو کام کرتا ہے وہ شعاعوں کی صورت میں اُس حصے پر چھپ جاتا ہے، اب وہ اندر محفوظ ہو جاتا ہے۔ کل قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کو سامنے لانے والے ہیں۔

۱: فصلت: ۱۹و۲۰۔ ۲: صحیح مسلم: کتاب الزہد والرقاق۔

بے سینگ بکری کو سینگ لگوا کر بدلہ دیا جائے گا:

اس دن حق تعالیٰ شانہ، دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیں گے۔ حتیٰ کہ دنیا میں ایک سینگ والی بکری نے بے سینگ والی بکری کو سینگ مارا ہو گا تو کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بے سینگ والی بکری کو سینگ دے کر اُس کا بدلہ دلوادیں گے۔ ۱؎ اُس دن جس سے آسان حساب لیا جائے گا وہ کامیاب ہو گیا اور جس سے سوال وجواب کیا جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا:

"وَمَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ هَلَكَ" ۲؎

"جس کو کھریدا گیا وہ تباہ ہو گیا۔"

پوچھا گیا کہ "آسان حساب" کیا ہے؟ فرمایا "آسان حساب" عرض ہے۔ "عرض" کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا کہ یہ تمہارا اعمال نامہ ہے، تم اس کو دیکھ لو۔ جس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ نجات پا جائے گا اور جس سے یہ کہا جائے گا کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ تو ایسا آدمی پھنس جائے گا۔ ایک ایک منٹ، ایک ایک سیکنڈ کا حساب لیا جائے گا، ہر ہر چیز کا حساب لیا جائے گا، مال کہاں سے کمایا اُس کا حساب بھی ہو گا، کہاں خرچ کیا؟ اُس کا حساب بھی ہو گا، علم حاصل کیا یا نہیں؟ اُس کا حساب ہو گا، جو علم حاصل کیا اُس پر کتنا عمل کیا؟ اُس کا بھی حساب ہو گا جسم کہاں کھپایا اس کا حساب ہو گا، عمر کہاں فنا کر دی اس کا بھی حساب ہو گا۔ ۳؎

۱؎: صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ والآداب / باب تحریم الظلم۔ ۲؎: صحیح بخاری: کتاب التفسیر / باب فسوف یحاسب حسابا یسیرا۔ ۳؎: سنن ترمذی: ابواب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع / باب فی القیامۃ۔

یومِ قیامت سے متعلق آیاتِ قرآنیہ:

قرآن پاک میں کئی جگہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کا بیان فرمایا ہے۔ اولاً اللہ تعالیٰ ہی کسی بات کو ارشاد فرمادیں وہ بات باوزن بافضیلت اور بااہمیت ہونے کے لیے کافی ہے۔ لیکن آپ اس بات کی اہمیت کا اندازہ لگائیے جس کو حق تعالیٰ شانہ نے ایک جگہ نہیں بلکہ کم و بیش چار سو سے زیادہ مقامات پر ذکر کیا ہو۔

قرآن کریم میں ”تکرار“ کمال ہے

قرآن کریم کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس میں تربیت کا ایک انداز ہے۔ آپ کو اس میں ایک بات پچاس مرتبہ ملے گی اور آدمی اس میں بور نہیں ہوگا۔ جیسے نماز کا حکم جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ فرمادیا کہ نماز پڑھو، بس اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا، ختم! آپ اگر امریکا، انڈیا، پاکستان کے لاء یعنی قانون کو پڑھیں گے تو ایک دفعہ کسی قانون کو ذکر کرنے کے بعد اُس کی تکرار نہیں آتی، اگر اس کی تکرار ہو تو تین سو ساٹھ دفعات کی تین ہزار دفعات بن جائیں۔ لوگ کہیں گے کہ جب آپ نے ایک دفعہ قانون لکھ دیا، بس کافی ہے، اتنی جگہ دہرانے کی کیا ضرورت ہے۔ قرآن کریم کا یہ اصول نہیں ہے۔ قرآن کریم عمل کی اہمیت کو سامنے لاکر بندے کو اللہ تعالیٰ کی بندگی پر لاتا ہے۔ اس لیے نماز کا بہت زیادہ حکم ملے گا۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ، نے ”یوم الدین“ کو مختلف پیراؤں میں بہت سی جگہوں پر بیان کیا۔

ذرا یہ سوچیں کہ واقعتاً وہ دن کتنا اہم ہوگا جس کو حق تعالیٰ شانہ، اتنی کثرت سے بیان فرمارہے ہیں۔ جو باتیں مشرکین کو ہضم نہیں ہوتی تھیں اُن میں سے ایک بات یہی تھی کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ کیے جائیں گے۔ اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ . قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ﴾ ا

کہتا ہے کہ ہڈیوں کو جب کہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں کون زندہ کرے گا، آپ جواب دیجئے کہ ان کو وہی زندہ کریگا جس نے پہلی مرتبہ ان کو پیدا کیا اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

قیامت سے متعلق دو باتیں بطورِ خاص اللہ پاک نے بیان فرمائی ہیں۔(۱) ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس دن لوگوں کو زندہ کرکے جمع فرمائیں گے، اس کا مقصد کیا ہو گا؟ اور کیسے اللہ پاک زندہ فرمائیں گے؟ (۲) دوسرا یہ کہ وہ دن کس طرح ہو گا؟ کن حالات سے لوگ اُس دن گزریں گے، ان دونوں چیزوں کا کچھ تذکرہ آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

نظامِ قیامت حق تعالیٰ کی صفتِ عدل کا تقاضہ ہے:

حق تعالیٰ شانہ، عادل ہیں، اُن کے عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اچھے اور بُرے میں امتیاز کو ظاہر فرمائیں اور نیکی اور بدی کو ظاہر فرمائیں۔ اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک بُرا آدمی مرنے تک آرام کرلیتا ہے اور ایک بھلا آدمی مرنے تک مصیبت میں رہ جاتا ہے۔ اگر ایسی بات ہو کہ کل کوئی بدلہ کا دن قائم نہ ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ عدل و انصاف کا مظاہرہ نہ فرمائیں تو پھر یہ اچھے اور بُرے کا امتیاز بالکل لغو ہو جائے گا اور انسانی زندگی کا نظام بے کار ہو جائے گا۔ اس زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہے گا، جیسا چاہے جانوروں کی طرح زندگی گزاری جائے گی، حالانکہ قرآن پاک میں یہ مضمون متعدد جگہوں پر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے انسان کو بے کار پیدا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا ایک تقاضہ یہ ہے کہ کل ایک دن آئے جہاں سارے انسانوں کو اللہ تعالیٰ جمع کریں اور جمع کرنے کے بعد اچھے وبُرے، نیک وبد، خیر وشر، حق وباطل، ظالم و

ا: یس: ۷۸و۷۹۔

مظلوم سب کے درمیان امتیاز کر دیں اور جو اچھا تھا اُس کی اچھائی سامنے لائیں اور جو بُرا تھا اُس کی بُرائی سامنے لائیں۔ ایک تو اس اسلوب کو زیادہ تر اختیار کیا گیا ہے۔ اور واقعات اور حقائق سے اس بات کو سمجھایا گیا ہے کہ دیکھو! ہم یہ کام کرنے والے ہیں، ہمارا یہ منصوبہ ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ:

چنانچہ حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ سے ہمیں سمجھایا کہ کیسے مردوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ یہ اللہ پر کتنا آسان ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک بستی پر سے گزر رہے تھے، بستی بالکل ویران اور تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ اُن کی زبان سے نکل گیا:

﴿أَنَّى يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾

”اللہ پاک اس کو اس کی موت کے بعد کیسے زندہ فرمائیں گے؟۔“

اللہ تعالیٰ نے اُن کو فوراً موت عطا فرمادی۔

﴿فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ﴾

”سو سال تک اللہ پاک نے انہیں موت عطا فرمائی، سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ کیا۔ اُس کے بعد پوچھا:

﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ ”تم یہاں کتنی مدت سے ہو؟“

کہنے لگے کہ میں ایک دن یا ایک دن کے کچھ حصے سے یہاں پر ہوں۔ بس ابھی سویا اور اُٹھ گیا۔ حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ ایسی بات نہیں ہے۔

﴿بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾

”بلکہ تم یہاں سو سال تک رہے ہو۔“ اب ہماری قدرت دیکھو۔

﴿فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾

"اب دیکھو اپنے کھانے اور اپنے مشروب کی جانب کہ وہ سڑا نہیں" لیکن تمہاری سواری (گدھا) مر گیا، اُس کی ہڈیاں بھی الگ الگ ہو گئیں۔ ایک دن میں تو ایسا ہو نہیں سکتا۔ پھر اُس کے بعد فرمایا کہ ہم نے تمہارا کھانا خراب نہیں کیا اور تمہارا گدھا مرا ہوا ہے۔ اب ہماری قدرت دیکھو، ہم نے جو چاہا کیا۔ کھانے کو سو سال تک خراب ہونے نہیں دیا حالانکہ وہاں کوئی فریج (Fridge) کا سسٹم بھی نہیں تھا۔ اِدھر گدھے کا یہ حال ہو گیا۔ پھر فرمایا:

﴿وَانْظُرْ إِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾

"اور دیکھ اپنے گدھے کو اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کے واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم ان کو کس طرح ابھار کر جوڑ دیتے ہیں پھر ان پر پہناتے ہیں گوشت، پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾[1]

"جب یہ بات سامنے آگئی تو کہا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، وہ یقینا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" حیات کے بعد موت، اور موت کے بعد حیات اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ:

حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ کے بعد حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا، جو اسی مضمون سے متعلق ہے، ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ اے اللہ! آپ مُردوں کو زندہ کیسے کریں گے؟ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا تم کو ہم پر ایمان نہیں ہے، کیا تم ایمان والے نہیں ہو؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ایمان تو ہے لیکن چاہتا ہوں کہ دل کو اطمینان ہو جائے۔

﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾

---

[1] البقرة:۲۵۹۔

ابراہیم علیہ السلام صاحبِ تعلق، خلیل اللہ تھے، ایک معنی میں اللہ تعالیٰ پر ناز کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ بھی اُن کے ساتھ محبت کا اظہار فرمارہے ہیں، ناز ہی میں اتنی بڑی بات اللہ تعالیٰ سے پوچھ بیٹھے کہ مجھے دکھلا دیجیے کہ آپ کیسے زندہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ٹھیک ہے ہم آپ کو دکھلا دیتے ہیں۔

﴿فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾

”فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے پھر ان کو بلا لے اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بلا چلے آوینگے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار پرندوں کو ذبح کیا، اُن کے ٹکڑے کئے اور چار پہاڑوں پر رکھ دیے اور ایک جگہ کھڑے ہو کر جب اپنی طرف بلایا تو تمام پرندوں کے اجزا الگ الگ ہو کر اپنے اپنے گوشت کے ساتھ جڑ گئے، پھر اُن پر پَر آگئے اور وہ اُڑ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔

اصحابِ کہف کا واقعہ:

اللہ پاک نے اسی مضمون کو سمجھانے کے لئے اصحاب کہف کا واقعہ بھی بیان فرمایا۔ وہ پانچ، چھ یا سات نوجوان تھے۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے کیونکہ انہیں کا زمانہ تھا۔ اُس وقت کا بادشاہ اور اُس کے حواری کافر تھے۔ اور وہ لوگ جو بھی مسلمان ہوتا اس کو قتل کر دیتے اور سخت سے سخت سزائیں دیتے، یہ نوجوان وزراء کی اولاد تھے۔ ان لوگوں کو اپنے ایمان کو بچانا تھا لہٰذا یہ لوگ وہاں سے چل کر ایک پہاڑ کی غار میں چلے گئے۔ ان لوگوں نے سوچا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، ہماری جان بھی چلی

جائے لیکن ہم اپنا ایمان نہیں چھوڑیں گے۔ ان نوجوانوں نے اپنے ساتھ توشہ اور کچھ پیسے ساتھ لیے اور ایک غار میں چھپ گئے۔ وہاں پر کھاپی کر سوگئے، جب سوئے تو سوتے ہی رہ گئے۔ پھر ایک وقت کے بعد سب اُٹھے، اُٹھنے کے بعد ایک دوسرے سے پوچھا کہ ہمیں سوتے ہوئے کتنی دیر ہوگئی۔ بعض نے کہا کہ ایک دن ہوا ہے، لیکن حق تعالیٰ نے فرمایا ایک دن نہیں بلکہ تین سو نو سال وہ اس غار میں رہے:

﴿وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا﴾[1]

وازدادوا تِسعاسے متعلق ایک نکتہ

علماء نے لکھا ہے کہ عربی میں تین سو نو سال کے لئے یہ تعبیر استعمال نہیں کی جاتی جو اللہ پاک نے استعمال فرمائی ہے، اس میں حکمت کیا ہے؟ اس کی حکمت یہ ہے کہ جو سورج کے مطابق حساب کریں گے اُن کے لیے تین سو سال ہوں گے اور جو چاند کے مطابق حساب کریں گے اُن کے لیے تین سو نو سال ہوں گے۔ اس لئے "تین سو" علاحدہ استعمال فرمایا، اور مزید نو سال کا علاحدہ ذکر فرمایا۔

غرض یہ کہ اٹھنے کے بعد انہیں بھوک محسوس ہوئی، ایک نوجوان کو بازار سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لینے کے لئے بھیجا۔ وہ پیسے لے کر گیا اور ساتھیوں نے تاکید کی کہ دکان والوں سے نرمی سے پیش آنا، ایسا نہ ہو کہ تم اُن سے جھگڑا کر بیٹھو تو ہمارے لیے مسئلہ ہو جائے، اس نے بازار جاکر دکان والے کو جو سکہ دیا تو دوکان دار نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور پوچھا کہ یہ کہاں سے لائے ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ یہ میرے پیسے ہیں۔ دکاندار نے کہا کہ یہ تمہارے پیسے ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ یہ دقیانوسی زمانے کے پیسے ہیں۔ اُس زمانے کے بادشاہ کا نام دقیانوس تھا (یہ لفظ "دقیانوسی" وہیں سے چلا ہے) دکاندار نے پھر کہا کہ

---

[1] الکہف:۲۵۔

یہ اس زمانے کے پیسے نہیں ہیں، بلکہ اس زمانے میں یہ سکہ چل رہا ہے۔ دکاندار نے سکہ دکھایا۔ اب وہ نوجوان پریشان ہوگیا کہ قصہ کیا ہے؟ پھر اُن کا راز فاش ہوا.........۔

حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ ہم نے اُن کو تین سو سال کے بعد اس لیے زندہ کیا تاکہ تم لوگوں کو یقین ہو جائے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا ہمارا وعدہ حق ہے اور ہم اُس پر قادر ہیں، ہم کو کوئی روک نہیں سکتا، ہمارے لئے کوئی مانع نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کے مقتول کے زندہ کرنے کا واقعہ:

ایسے ہی بنی اسرائیل میں جب ایک آدمی نے دوسرے کو قتل کیا، لیکن قاتل کا پتہ نہ چلا، اللہ پاک سے انہوں نے دخواست کی کہ کسی طرح اس کا پتہ بتا دیا جائے تو اللہ پاک نے گائے ذبح کر کے اس کا حصہ مقتول کے جسم کو لگانے کا حکم دیا، جس کے نتیجہ میں مقتول زندہ ہو کر قاتل کا پتہ بتا دیا اور فوراً مر گیا۔ اللہ پاک نے اس واقعہ کے بعد فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾[۱]

”اللہ تعالیٰ مُردوں کو اسی طرح زندہ کرے گا۔“

احوالِ قیامت سے متعلق چند آیاتِ مبارکہ:

یہ واقعات اللہ پاک لوگوں کو سمجھانے کے لئے بیان فرمائے ہیں، تاکہ لوگوں کو اس بات میں تردد نہ ہو کہ ہمیں مرنے اور ہمارے جسم کے گلنے اور سڑنے اور ہماری ہڈیوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد دوبارہ ہمیں زندہ کیا جائے گا، لیکن دوبارہ زندہ کرنے کے بعد کیا ہوگا؟ وہاں کے احوال کیسے ہوں گے؟ اس دن کی ہولناکی اور ہیبت کیسی ہوگی؟ نیک مسلمانوں کی حالت کیا ہوگی؟ کافر اور گنہگاروں کا حال کیا ہوگا؟ حساب و کتاب کیسے لیا جائے گا؟ اور کیسے کیسے عذاب اور سزائیں دی جائیں گی؟ ان کا بھی اللہ پاک

۱: البقرۃ:۷۳۔

نے قرآن مجید میں کئی جگہ ذکر فرمایا، چنانچہ اس دن کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ پاک فرماتے ہیں:

عزت وذلت کا دن:

﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾[1]

”وہ دن ہے ہار جیت کا“ یعنی عزت والوں کے عزت پانے اور ذلت والوں کے ذلیل ہونے کا دن ہے۔ دنیا کی نہ عزت کا اعتماد ہے اور نہ ذلت کا، یہاں عزت کا محل دماغ ہے، اپنا دماغ بھی نہیں بلکہ لوگوں کا دماغ ہے۔ اگر لوگوں کے دماغ میں میری بڑائی رہی تو میں عزت والا ہوں اور اگر لوگوں کے دماغ سے میری بڑائی نکل گئی تو میں ذلیل ہوں، مگر قیامت کے دن یہ ہے:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾

”جس دن تم کو اکٹھا کرے گا جمع ہونے کے دن وہ دن ہے ہار جیت کا“

اُس دن کسی کو عزت ملی تو واقعی وہ عزت والا اور اُس دن کسی کو ذلت ملی تو واقعی وہ ذلیل ہو جائے گا۔

سب کی حاضری کا دن:

﴿ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ﴾[2]

”وہ ایک دن ہے جس میں جمع ہوں گے سب لوگ اور وہ دن ہے سب کے پیش ہونے کا“

﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا﴾[3]

”جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم لوگ غٹ کے غٹ آموجود ہوگے“

---

[1]: التغابن:۹۔ [2]: ہود:۱۰۳۔ [3]: النبأ:۱۸۔

فیصلہ کا دن:

﴿وَقَالُوْا يَا وَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ،هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾[۱]

اور (کفار)''کہیں گے کہ ہائے خرابی ہماری یہ آگیا دن جزا کا، یہ ہے دن فیصلہ کا جس کو تم جھٹلاتے تھے''

مومنین کی مہمانی کا دن:

﴿هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ﴾[۲]

''یہ مہمانی ہے ان کی انصاف کے دن''

قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ساتھ اکرام کریں گے تو فرمائیں گے یہ تمہاری میزبانی ہے اور یہ یوم الدین ہے یعنی بدلے کا دن ہے۔ ایمان والوں کی عزت کی جائے گی اور بے ایمانوں کو اُس دن ذلیل کیا جائے گا۔

﴿وَإِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ﴾[۳]

'' اور بے شک انصاف (کا دن) ضرور واقع ہو گا ''

کفار سے پوچھا جائے گا کہ تم کیوں تباہ ہوئے؟ وہ کہیں گے:

﴿وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ﴾[۴]

''اور ہم جھٹلاتے تھے انصاف کے دن کو''اُس کی اہمیت ہمارے ذہنوں میں نہیں تھی، اس کی وجہ سے ہماری زندگی تباہ و برباد ہو گئی۔

فجار کا انجام:

﴿وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِی جَحِيْمٍ،يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ، وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ، ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾[۵]

۱: الصافات: ۲۰۔ ۲: الواقعۃ: ۵۶۔ ۳: الذاریات: ۶۔ ۴: المدثر: ۴۶۔ ۵: الانفطار: ۱۷،۱۵،۱۴، ۱۸۔

”اور بیشک گناہ گار دوزخ میں ہیں، ڈالے جائیں گے اس میں انصاف کے دن، اور تجھ کو کیا خبر ہے انصاف کے دن کی، پھر بھی تجھ کو کیا خبر کیا ہے انصاف کے دن کی۔

﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ﴾[1]

”یہ وہ دن ہے جس دن کوئی نفس کسی نفس کا بالکل مالک نہیں ہوگا اور پورا اختیار ایک اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔“

پورے پورے بدلہ کا دن:

﴿يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللّٰهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ﴾[2]

”اس دن خدا ان کو (ان کے اعمال کا) پورا پورا (اور) ٹھیک بدلہ دے گا اور ان کو معلوم ہوجائے گا کہ خدا برحق (اور حق کو) ظاہر کرنے والا ہے“۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾[3]

”ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔“

﴿يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفّٰى﴾[4]
﴿كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾

”جس دن ہر متنفس اپنی طرف سے جھگڑا کرنے آئے گا اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی کا نقصان نہیں کیا جائے گا“۔

انسان کی اپنی ذات پر غصّہ کی حالت:

اس دن دوسرے سے لڑنے کی بات نہیں ہوگی۔ بلکہ آدمی خود اپنے آپ سے کہے گا اے نفس! تجھے کیا ہوگیا تھا کہ تو نے اس دن کی حقیقت کو نہیں پہچانا اور تو غفلت میں

---

[1]: الانفطار: ۱۹۔ [2]: النور: ۲۵۔ [3]: آل عمران: ۱۸۵۔ [4]: النحل: ۱۱۱۔

زندگی گزارتا رہا۔ کیوں تو نے اپنے آپ کو تباہ کیا؟ اُس دن انسان کو اپنی ذات پر جتنا غصہ آئے گا اتنا کسی پر نہیں آئے گا، ﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾ ۱؎

اور جس دن (ناعاقبت اندیش) ظالم اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھائے گا (اور کہے گا) کہ اے کاش میں نے پیغمبر کے ساتھ رشتہ اختیار کیا ہوتا“۔ حدیث پاک میں ہے کہ آدمی اپنا ہاتھ چبا ڈالے گا اور ہاتھ کندھے تک چبا ڈالے گا اور اُس کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ میں نے اپنا ہاتھ کہاں تک چبا ڈالا۔ ۲؎

قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے دنیا کے دن کا تخمینہ

﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ﴾ ۳؎

”اور جس دن خدا ان کو جمع کرے گا (تو وہ دنیا کی نسبت ایسا خیال کریں گے کہ) گویا (وہاں) گھڑی بھر دن سے زیادہ رہے ہی نہ تھے “

کل میدانِ حشر میں لوگوں سے پوچھا جائے گا:

﴿قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ﴾ ۴؎

”تم زمین پر کتنے سال رہے؟“

﴿قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْأَلِ الْعَادِّيْنَ﴾ ۵؎

”وہ کہیں گے کہ ہم ایک یا ایک روز سے بھی کم رہے تھے، شمار کرنے والوں سے پوچھئے۔“

حق تعالیٰ فرمائیں گے: ﴿قٰلَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيْلًا﴾ ۶؎

(خدا) فرمائے گا کہ (وہاں) تم (بہت ہی) کم رہے کاش تم جانتے ہوتے “

۱؎: الفرقان:۲۷۔ ۲؎: الدرالمنثور:۶/۲۵۲۔ ۳؎: یونس:۴۵۔ ۴؎: المومنون:۱۱۲۔
۵؎: المومنون:۱۱۳۔ ۶؎: المومنون:۱۱۴۔

حسرت کا دن:

﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ ۱

”اور ان کو حسرت وافسوس کے دن سے ڈراؤ جب بات فیصل کر دی جائے گی اور وہ غفلت میں (پڑے ہوئے ہیں) اور ایمان نہیں لاتے“

دنیا میں کسی انسان سے کتنی ہی قیمتی چیز گم ہو جائے اُس کو اتنی حسرت نہیں ہوتی جتنی حسرت اورافسوس کل ایک انسان کو ہونے والا ہے اگر اُس نے اس دنیا کی زندگی کو غفلت سے گذار دیا۔

جس طرح اُس دن کا نام ”یوم الدین“ ہے اسی طرح اُس کا نام ”یوم الحسرۃ“ ہے، لیکن وہاں حسرت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

﴿يَا وَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا﴾ ۲

”ہائے شامت کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا“

﴿لَقَدْ أَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِيْ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُوْلًا﴾ ۳

” اس نے مجھ کو (کتاب) نصیحت کے میرے پاس آنے کے بعد بہکا دیا اور شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے“

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗ أَمَدًا بَعِيْدًا﴾ ۴

” جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی نیکی کو موجود پالے گا اور ان کی برائی کو بھی (دیکھ لے گا) تو آرزو کرے گا کہ اے کاش اس میں اور اس برائی میں دور کی مسافت ہو جاتی“

﴿أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ﴾ ۵

۱: مریم: ۳۹۔ ۲: الفرقان: ۲۸۔ ۳: الفرقان: ۲۹۔ ۴: آلِ عمران: ۳۰۔ ۵: الاعراف: ۱۷۲۔

”یہ اقرار اس لیے کرایا تھا کہ قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔“ کل قیامت کے دن لوگ آکر حسرت کریں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے کہیں گے کہ یہ دن واقعی اتنا پریشان کن دن ہے، اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا، آپ ہمیں دنیا میں واپس پہنچا دیجیے، اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ کل (قیامت کے دن) آکر ہم سے یہ نہ کہنا کہ اس دن کی آپ نے ہمیں پہلے خبر نہیں دی، ہمیں کیا پتہ تھا؟

کوئی بات مخفی نہ ہوگی:

﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ﴾[۱]

”اس روز تم (سب لوگوں کے سامنے) پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہ رہے گی“۔

﴿يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾[۲]

”یہ وہ دن ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے لائے جائیں گے اور کوئی چیز لوگوں سے مخفی نہیں ہوگی اور اُس دن ملک اور ملکیت ایک واحد وقہار کے سوا کسی کی نہیں ہوگی۔“

﴿وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾[۳]

”اور (عملوں کی) کتاب (کھول کر) رکھی جائے گی تو تم گنہگاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہوگا اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے شامت یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی بات کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر

۱: الحاقۃ:۱۸۔ ۲: غافر:۱۶۔ ۳: الکہف:۴۹۔

اسے لکھ رکھا ہے اور جو عمل کئے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا"

﴿وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا﴾ ۱

" اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بصورتِ کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز (وہ) کتاب اسے نکال دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا"

﴿اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾ ۲

"کہا جائے گا کہ اپنی کتاب پڑھ لے آج تو اپنا ہی محاسب کافی ہے"

﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ﴾ ۳

" اس دن دلوں کے بھید جانچے جائیں گے"

﴿وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِن قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ﴾ ۴

"اور تم جس حال میں ہوتے ہو یا قرآن میں سے کچھ پڑھتے ہو یا تم لوگ کوئی (اور) کام کرتے ہو جب اس میں مصروف ہوتے ہو تو ہم تمہارے سامنے ہوتے ہیں۔ اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ اور نہ کوئی چھوٹی چیز اور نہ بڑی مگر یہ کہ وہ روشن کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے۔"

نیک مومنین پر انعاماتِ خداوندی:

اُس دن ایمان والوں کے ساتھ جو نرمی ہوگی اُس کا بھی بیان ہے۔ وہ دن ایسا ہوگا:

﴿إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ﴾ ۵

۱: الاسراء: ۱۳۔ ۲: الاسراء: ۱۴۔ ۳: الطارق: ۹۔ ۴: یونس: ۶۱۔ ۵: یس: ۵۵۔

”اہل جنت اس روز عیش ونشاط کے مشغلے میں ہوں گے“

ساری دنیا اور ساری مخلوق اپنی پریشانی میں ہوں گے اور یہ اپنے مزے میں مست رہیں گے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ جاب (Job) کے واسطے اِدھر اُدھر بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور پسینہ بہاتے ہیں، اور بعضوں کو دیکھا ہوگا کہ شاپ (Shop) پر بیٹھے عیش کررہے ہوتے ہیں۔

اسی طرح میدانِ حشر میں کچھ لوگ اپنی اپنی پریشانی میں ہوں گے اور جنت والے اپنے دوست اور احباب میں خوب مست ہوں گے۔ بعض سایہ میں ہوں گے، اور بعض کھاتے پیتے ہوں گے۔

مومنین کے ساتھ نور:

﴿يَوۡمَ تَرَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنَاتِ يَسۡعٰى نُوۡرُهُمۡ بَيۡنَ أَيۡدِيۡهِمۡ وَبِأَيۡمَانِهِمۡ﴾[1]

”جس دن تو دیکھے ایمان والے مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو دوڑتی ہوئی چلتی ہے ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے داہنے“

﴿نُوۡرُهُمۡ يَسۡعٰى بَيۡنَ أَيۡدِيۡهِمۡ وَبِأَيۡمَانِهِمۡ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا أَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ﴾[2]

”ان کا نور ایمان ان کے آگے اور داہنی طرف (روشنی کرتا ہوا) چل رہا ہوگا اور وہ خدا سے التجا کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارا نور ہمارے لئے پورا کر اور ہمیں معاف فرما بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔“

کفار و منافقین کے پاس وہ نور نہیں ہوگا۔ منافقین ایمان والوں سے کہیں گے کہ تھوڑا اپنا نور ہمیں دے دو۔ ایمان والے کہیں گے کہ یہاں پر اپنے اپنے نور میں چلنا ہے،

---

[1]: الحدید: ۱۲۔ [2]: التحریم: ۸۔

تمہارا نور پیچھے ہے۔ منافقین پلٹ کر پیچھے دیکھیں گے تو ایمان والوں اور منافقین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ دیوار بھی ایسی ہو گی کہ ایمان والوں کی طرف کا حصہ رحمت کا ہو گا اور منافقین کی طرف کا حصہ عذاب کا ہو گا۔

مومنین بہترین جگہ اور آرام میں ہوں گے:

﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا﴾[۱]

"بہشت کے لوگوں کا اس دن خوب ہے ٹھکانا اور خوب ہے جگہ دوپہر کے آرام کی" اُس دن اہل جنت کو کھانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔" حالانکہ وہ دن پچاس ہزار سال کا ہو گا۔ چنانچہ اُس دن کے بارے میں فرمایا:

﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾[۲]

"چڑھیں گے اس کی طرف فرشتے اور روح اس دن میں جس کی لانبائی پچاس ہزار برس ہے"

﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا، إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا، وَنَرَاهُ قَرِيبًا﴾[۳]

"تو تم کافروں کی باتوں کو حوصلے کے ساتھ برداشت کرتے رہو، وہ دیکھتے ہیں اس کو دور، اور ہم دیکھتے ہیں اس کو نزدیک"

اس پچاس ہزار برس کے دن میں اللہ تبارک وتعالیٰ پوری زمین کی روٹی بنائیں گے اور زمین میں رکھے گئے تمام ذائقے اُس میں آجائیں گے۔ حضور پاک ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے جامِ کوثر پلایا جائے گا جس کے پینے کے بعد پھر کبھی پیاس نہیں ہو گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے عرش کا سایہ دے دیا جائے گا، اُس وقت سائے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ انسان کو یہی تین بنیادی چیزیں چاہیے۔ رہنے کے لیے جگہ چاہیے، بھوک وپیاس کے لئے کھانا اور پانی اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا۔ ایمان والوں کو اپنے اپنے مرتبے کے حساب سے لباس پہنایا جائے گا۔

۱: الفرقان:۲۴۔ ۲: المعارج:۴۔ ۳: المعارج:۷،۶،۵۔

اب سمجھ لیجیے! دنیا میں ایمان کی دولت کتنی بڑی دولت ہے؟ اگر بے ایمانی کے ساتھ دنیا ملی تو اُس کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اُلٹا نقصان ہی ہے۔

دوستی اور رشتہ داری کچھ کام نہ آئے گی:

﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَاءَلُوْنَ﴾ ؀۱

”پھر جب صور پھونکا جائے گا تو نہ تو ان میں قرابتیں رہیں گی اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے“

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ﴾ ؀۲

” جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے “

یہاں باپ کے لیے اولاد ہے، اولاد کے لیے ماں باپ ہیں، بھائی کے لیے بھائی ہے، بیوی کے لیے شوہر ہے، شوہر کے لیے بیوی ہے لیکن وہاں سارے رشتے ناطے ختم ہو جائیں گے۔

﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ إِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِيْنَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ﴾ ؀۳

”اور ان کو قریب آنے والے دن سے ڈراؤ جب کہ دل غم سے بھر کر گلوں تک آ رہے ہوں گے (اور) ظالموں کا کوئی دوست نہیں ہو گا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات قبول کی جائے“ آپ لوگوں کو اُس دن سے ڈرا دیجیے جس دن دل آدمی کے حلق تک آ جائے گا۔“

﴿وَتَرٰى كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعٰى إِلٰى كِتَابِهَا الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ ؀۴

”اور تم ہر ایک فرقے کو دیکھو گے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہو گا اور ہر ایک جماعت اپنی کتاب اعمال کی طرف بلائی جائے گی جو کچھ تم کرتے رہے ہو آج تم کو اس کا بدلہ دیا جائے گا“

۱: المومنون: ۱۰۱۔ ۲: الشعراء: ۸۸۔ ۳: غافر: ۱۸۔ ۴: الجاثیہ: ۲۸۔

دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال والے کا انجام:

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ، إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ، فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ، فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ، قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ، كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾[1]

”تو جس کا (اعمال) نامہ اسکے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ (دوسروں) سے کہے گا کہ لیجئے میرا نامہ (اعمال) پڑھیے، میں نے خیال رکھا اس بات کا کہ مجھ کو ملے گا میرا حساب، پس وہ (شخص) من مانے عیش میں ہوگا، (یعنی) اونچے (اونچے محلوں کے) باغ میں، جن کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے، جو (عمل) تم ایام گزشتہ میں آگے بھیج چکے ہو اس کے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو“

بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال والے کا انجام:

﴿وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ، وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ، يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ، مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ۔ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ﴾[2]

”اور جس کا نامہ (اعمال) اسکے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا اے کاش مجھ کو میرا (اعمال) نامہ نہ دیا جاتا، مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے؟، اے کاش موت (ابد الآباد کیلئے میرا کام) تمام کر چکی ہوتی، کچھ کام نہ آیا مجھ کو میرا مال، برباد ہوئی مجھ سے حکومت میری“۔

﴿خُذُوهُ فَغُلُّوهُ، ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ، ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ﴾[3]

۱: الحاقۃ: ۱۹ تا ۲۴۔ ۲: الحاقۃ: ۲۵ تا ۲۹۔ ۳: الحاقۃ: ۳۰، تا، ۳۲۔

”(حکم ہو گا کہ) اسے پکڑ لو اور طوق پہنا دو۔ پھر اسے دوزخ کی آگ میں جھونک دو۔ پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر گز ہے اس کو جکڑ دو“

﴿وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ ، سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ﴾[۱]

”اور اس دن تم گنہگاروں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے اور انکے مہینوں کو آگ لپٹ رہی ہو گی۔“

قیامت کی ہولناکی سے حاملہ بچہ جن دے گی:

﴿يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا،وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾[۲]

”(اے مخاطب) جس دن تو اس کو دیکھے گا (اس دن یہ حال ہو گا کہ) تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی اور تمام حمل والیوں کے حمل گر پڑیں گے اور لوگ تجھ کو متوالے نظر آئیں گے مگر وہ متوالے نہیں ہوں گے بلکہ (عذاب دیکھ کر) مدہوش ہو رہے ہوں گے بیشک خدا کا عذاب بڑا سخت ہے“۔

بچے بوڑھے ہو جائیں گے:

﴿فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا﴾[۳]

”اگر تم بھی (ان پیغمبر کو) نہ مانو گے تو اس دن سے کیونکر بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا“

دنیا میں کبھی کسی کے اوپر اتنی آفت نہیں پڑی کہ بچے کے بال اچانک سفید ہو جائیں لیکن اُس دن بچے بھی بوڑھے ہو جائیں گے، اُن کے بال سفید ہو جائیں گے۔

۱: ابراہیم:۴۹، ۵۰۔ ۲: الحج:۲۔ ۳: المزمل:۱۷۔

نیکوں اور بدوں کی صفیں الگ الگ ہوں گی:

﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ ۱؎

”اور اے گنہگارو آج الگ ہو جاؤ“

ایمان والوں کو الگ کھڑ کیا جائے گا اور بے ایمانوں کو الگ کھڑا کیا جائے گا۔ ایمان والوں میں بھی گنہگاروں کو الگ کھڑا کیا جائے گا، فاسقوں کو الگ، زانیوں کو الگ، چوروں کو الگ، سود کھانے والوں کو الگ، رشوت کھانے والوں کو الگ، مکاروں اور دھوکہ دینے والوں کو الگ، اُس دن اللہ تبارک وتعالیٰ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں گے اور فرمائیں گے:

﴿أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِيْ آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ﴾ ۲؎

اے آدم کی اولاد ہم نے تم کو کہہ نہیں دیا تھا کہ شیطان کو نہ پوجنا وہ تمہارا کھلا دشمن ہے“

﴿فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا﴾ ۳؎

”تو آج تم میں سے کوئی کسی کو نفع اور نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتا۔“

﴿يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهٖ﴾ ۴؎

”جس روز وہ آجائے گا تو کوئی متنفس خدا کے حکم کے بغیر بول بھی نہیں سکے گا۔ پھر ان میں سے کچھ بد بخت ہونگے اور کچھ نیک بخت “

کافروں کے چہرے سیاہ ہوں گے:

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ ۵؎

” جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ تو جن لوگوں کے منہ سیاہ ہوں گے (ان سے خدا فرمائے گا) کیا تم ایمان لا کر کافر ہو گئے تھے؟ سو (اب) اس کفر کے بدلے عذاب (کے مزے) چکھو “

۱؎: یس:۵۹۔ ۲؎: یس:۶۰۔ ۳؎: سبا:۴۲۔ ۴؎: ہود:۱۰۵۔ ۵؎: آلِ عمران:۱۰۶۔

ہر آدمی اپنے اعمال کے بدلہ محسوب ہو گا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ، إِلَّآ أَصْحَابَ الْيَمِيْنِ﴾ ۱

”ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گروی ہے“، جیسے آدمی اپنا مکان گروی رکھتا ہے پھر اُس کے بعد قرضہ لیتا ہے، اپنا سونا (Gold) بطورِ گروی رکھتا ہے اور پھر قرضہ لیتا ہے۔ ایسے ہی ہر جان اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے۔

﴿فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ، عَلَى الْكَافِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ﴾ ۲

”وہ جو مشکل کا دن ہو گا یعنی کافروں پر آسان نہ ہو گا۔“

اس طرح کی آیتیں قرآن مجید میں چار سو جگہوں پر ہے، اس میں سے چند آیتیں آپ کے سامنے پیش کی گئیں۔ تاکہ ہم اس سے یہ نصیحت اور سبق حاصل کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس دن کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ خود اتنا سخت ہے کہ آدمی اُس سے گھبرا جائے۔ بچے بوڑھے ہو جائیں گے، سارے راز کھول دیئے جائیں گے، آدمی اپنے عمل کے بدلہ رہن ہو گا، ہر آدمی اچھے یا بُرے اعمال کا بدلہ اپنے سامنے پائے گا۔ سارے لوگ موجود ہوں گے، اس دن ہمارا انجام کیا ہو گا، ہم اللہ پاک کو کیا جواب دیں گے؟ یہ ہولناکیاں ور یہ کیفیتیں تو جہنم میں جانے سے پہلے ہو نگی، لیکن جس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس کو کیسی تکلیف ہو گی؟ کیا کیا عذب ہو گا؟ کس گناہ کی کیا سزا ہو گی؟ نبی ﷺ نے احادیثِ مبارکہ میں اس کو بھی بیان فرمایا ہے۔

زانی اور زانیہ کی سزا:

مثلاً زانی کی سزا بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ: زانی کے جسم پر اژدہا مسلط کر دیا جائے گا:

”مَنْ قَعَدَ عَلٰى فِرَاشِ مَغِيْبَةٍ قَيَّضَ اللّٰهُ لَهٗ ثُعْبَانًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ ۳

۱: المدثر: ۳۸۔ ۲: المدثر: ۹۔ ۳: کنز العمال: ۱۲۹۹۵۔

اور وہ اُس کو ڈستے رہے گا، اُس زہر کی تلخی سے اُس کو انتہائی پیاس لگے گی، جب وہ پانی مانگے گا تو عورتوں کے جسم سے نکلنے والا ناپاک خون اور پیپ اُس کو پلایا جائے گا۔

زناکاروں کے چہروں سے شعلے بھڑک رہے ہوں گے:

ایک حدیث میں ہے: ”إِنَّ الزُّنَاةَ يَأْتُوْنَ تَشْتَعِلُ وُجُوهُهُمْ نَاراً“[۱]

زانی عورتوں کے چہرے شعلوں سے بھڑک رہے ہوں گے۔

اور شعلوں سے بھڑکتے ہوئے تنور میں ڈال دیا جائے گا، جیسے جیسے شعلے بھڑکتے رہیں گے زانی اور زانیہ اوپر آتے رہیں گے اور آگ جیسے جیسے نیچے جاتی رہے گی وہ لوگ بھی نیچے جاتے رہیں گے۔[۲] جیسے کوئی اُن کو اوپر نیچے پمپ کر رہا ہو۔

شرابی کی سزا:

شرابی کی سزا کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شراب پیتا ہے تو اللہ پاک چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں فرماتے ہیں، اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ پاک اس کو معاف کر دیتے ہیں، اسی طرح دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اللہ پاک کا اس کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے، چوتھی مرتبہ اگر وہ شراب پیتا ہے تو اللہ پاک اس کی توبہ بھی قبول نہیں فرمائیں گے اور اس کو جہنمیوں کا پیپ بھی پلائیں گے۔[۳]

شرابی کو زانیہ کی شرمگاہ سے بہتا ہوا خون پلایا جائیگا:

دوسری حدیث میں اور بھی سخت آپ نے ارشاد فرمایا:

”وَمَنْ مَاتَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ سَقَاهُ اللهُ مِنْ نَهْرِ الْغَوْطَةِ قِيْلَ: وَمَا نَهْرُ الْغَوْطَةِ؟ قَالَ: نَهْرٌ يَخْرُجُ مِنْ فُرُوْجِ الْمُوْمِسَاتِ يُؤْذِيْ أَهْلَ النَّارِ رِيْحُ فُرُوْجِهِمْ“[۴]

۱: کنز العمال: ۱۳۰۰۴۔ ۲: صحیح البخاری: کتاب الجنائز/ باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔

۳: سنن ابی داؤد: الأشربۃ/ باب النہی عن المسکر۔ ۴: مستدرکِ حاکم: کتاب الاشربۃ۔

کہ شرابی کو ''غوطہ'' نام کی ایک نہر سے پلایا جائے گا۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ غوطہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ یہ نہر زانیہ عورتوں کی شرمگاہوں سے جاری ہو گی اور یہ اتنی بدبودار ہو گی کہ خود جہنمی، اس کی بدبو سے پریشان ہو جائیں گے۔

حالانکہ جہنم میں خود ایک سے ایک پریشانی ہو گی مگر اس ''غوطہ'' سے سارے جہنمی پریشان ہوں گے کہ یہ کیا مصیبت ہے۔

بیویوں میں انصاف نہ کرنے والے کی سزا:

ایک حدیث میں ہے:

''مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ فَمَالَ إِلَى إِحْدَاهُمَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ مَائِلٌ ''[۱]

اگر کسی کے پاس دو بیویاں ہیں اور وہ اُن کے درمیان عدل نہیں کرتا ہے تو میدانِ حشر میں وہ سب کے سامنے ایسا آئے گا کہ اُس کے ایک طرف کا حصہ فالج زدہ ہو گا، سب لوگ دیکھ کر سمجھ جائیں گے کہ یہ آدمی ایسا تھا جو بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کرتا تھا۔

غیبت کی سزا:

غیبت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے مسلمانوں کا ایسا تذکرہ کرنا کہ اگر اُس کے سامنے یہ ذکر کیا جائے تو اُسے وہ بُرا لگے۔ آپ ﷺ نے ایسے آدمی کے بارے میں فرمایا:

''مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ أَظْفَارٌ مِنْ نُحَاسٍ يَخْمُشُونَ وُجُوهَهُمْ وَصُدُورَهُمْ فَقُلْتُ مَنْ هَؤُلَاءِ يَا جِبْرِيلُ قَالَ هَؤُلَاءِ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ لُحُومَ النَّاسِ وَيَقَعُونَ فِي أَعْرَاضِهِمْ''[۲]

میں (معراج) کے موقع پر ایسی قوم کے پاس سے گزرا کہ جن کے پیتل کے ناخن تھے جس سے وہ اپنے چہروں اور اپنے سینوں کے نوچ رہے تھے تو میں نے کہا اے

۱: سنن ابی داوٗد: النکاح / باب فی القسم بین النساء۔ ۲: سنن ابی داود: الآدب / باب فی الغیبۃ۔

جبرئیل یہ کون ہیں؟تو جبرئیل نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے گوشت کھاتے تھے اور ان کی آبروریزی میں پڑے رہتے تھے۔(یعنی غیبت کیا کرتے تھے)

غصب کی سزا:

اگر کسی آدمی نے کسی کی زمین دبالی تو میدانِ حشر میں وہ ساری زمین اس کے گلے میں ڈال دی جائے گی اور وہ اس وزن کو اُٹھاتا پھرے گا۔

"مَنْ أَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا فَإِنَّهُ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِيْنَ"[۱]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے دو مفہوم بیان کئے ہیں:

(۱) اس ظالم کو میدان محشر میں غصب شدہ زمین کو لانے کا مکلف بنایا جائے گا۔اس معنیٰ کے اعتبار سے گویا وہ زمین اس کے گلے میں طوق بن کر رہے گی مجازاً، حقیقۃً نہیں۔

(۲) اس زمین کو غصب کرنے کی وجہ سے ساتوں زمینوں تک اسے دھنسا دیا جائے گا جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔اس معنیٰ کے اعتبار سے بھی زمین گویا اس کے گلے میں طوق بن کر رہے گی۔

اور ایک روایت میں ہے کہ اس کو ساتوں زمینوں کے کھودنے کا مکلف بنایا جائے گا۔[۲]

متکبرین کی سزا:

اگر کوئی آدمی متکبر اور بڑا پن کرنے والا ہو گا تو اُسے یہ سزا دی جائے گی کہ چیونٹی کی طرح اُس کا جسم کر دیا جائے گا۔

"يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْثَالُ الذَّرِّ فِيْ صُوَرِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ"[۳]

۱: صحیح بخاری: کتاب المظالم/ باب ما جاء فی سبع ارضین۔ ۲: فتح الباری: باب اثم من ظلم شیئا من الارض۔ ۳: سنن ترمذی: صفۃ القیامۃ/ باب ۱۱۲۔

متکبرین کو قیامت کے دن آدمیوں کی شکل میں چیونٹیوں کی طرح کر دیا جائے گا، ہر طرف سے ان پر ذلت چھائی ہو گی۔ اور ان کو جہنم میں کھینچ کر لے جایا جائے گا۔

سب لوگ تو بڑے ہوں گے اور یہ چیونٹی کی طرح ہو گا، لوگ اسے اپنے پیروں سے روندتے اور ٹھوکریں مارتے ہوئے ہوں گے تاکہ وہ لوگوں کے سامنے ذلیل ہو جائے، چاہے وہ اپنی جگہ پر بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔

خطیبِ بے عمل کی سزا:

اگر کوئی آدمی واعظ ہے لیکن بے عمل ہے تو اُس کے ہونٹوں کو آگ کی قینچیوں سے کاٹا جائے گا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

”مَرَرْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِيْ عَلٰى قَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِمَقَارِيْضَ مِنْ نَّارٍ قَالَ قُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ؟ قَالُوْا خُطَبَاءُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا كَانُوْا يَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَيَنْسَوْنَ أَنْفُسَهُمْ“ [۱]

آپ ﷺ نے فرمایا میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرا جن کے ہونٹوں کو آگ کی قینچیوں سے کاٹا جا رہا تھا تو میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ دنیا کے خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔

ظلماً یتیموں کا مال کھانے والوں کی سزا:

اگر کوئی آدمی یتیم کا مال کھا گیا، دنیا میں یتیم کا کون پُرسانِ حال ہوتا ہے؟ اُس کے ساتھ تھوڑی سی ہمدردی کی اور دیکھا کہ اس کا کوئی نہیں ہے تو پھر اس کا مال کھا گیا، ایسے آدمی کے بارے میں ہے:

”وَآخَرُوْنَ يَجِيْئُوْنَ بِالصَّخْرِ مِنَ النَّارِ يَقْذِفُوْنَهَا فِيْ أَفْوَاهِهِمْ فَتَخْرُجُ مِنْ أَدْبَارِهِمْ قُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا“ [۲]

۱: معجم طبرانی: ۸۴۵۷ و مسند احمد ابن حنبل: مسند انس بن مالک، ۱۲۲۳۲۔
۲: مسندِ فردوس الدیلمی: ۱۹۹۳ و تھذیب الآثار: ۲۶۶۷ و موسوعۃ التخریج: ۹۵۱۶۷۔

جو یتیم کا مال کھا جائے گا کل قیامت میں ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح ہوں گے اور ان کے پیٹ میں بڑے بڑے انگارے بھرے جائیں گے اور وہ اُس کے پاخانے کے راستے سے نکل جائیں گے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو یتیم کا مال کھاتے تھے ظلماً۔

غدار کی سزا:

اگر کوئی آدمی غداری کرے گا تو اُس کے سرین میں جھنڈا گاڑ دیا جائے گا اور وہ اس سے پہچانا جائے گا کہ یہ بڑا غدار تھا۔

”لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ عِنْدَ اِسْتِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“[۱]

ہر خیانت اور دھوکہ کرنے والے کے لئے اس کی سرین میں قیامت کے دن جھنڈا ہوگا۔

زکوۃ ادا نہ کرنے والوں کی سزا:

اگر کسی آدمی نے زکوۃ نہ دی ہو تو کل قیامت میں اس مال ہی سے اس کی پیشانی، پہلو اور پشتوں کو داغا جائے گا۔

﴿فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ﴾[۲]

اور داغنے کے بعد کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال جس کو تم جمع کرکے رکھتے تھے اور جب خرچ کرنے کا تقاضہ آتا تھا تو خرچ نہیں کرتے تھے۔

ایک روایت میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص فرض ہو جانے کے باوجود زکوٰۃ ادا نہیں کرتا ہے تو وہ مال سانپ بن کر اُس کو لپٹ جائے گا اور وہ اُس کو ڈستا رہے گا۔

ہر نیک و بد عمل اپنا اثر رکھتا ہے:

دنیا میں کیے جانے والے اعمال میں اللہ تعالیٰ نے تاثیر رکھی ہے، میدانِ حشر میں انہی تمام اعمال کا ری ایکشن (Reaction) ہوگا۔ یہی وہ اعمال ہیں جن کا بدلہ دیا جائے

۱: صحیح بخاری: الجزیۃ: باب اثم الغادر للبر والفاجر۔ ۲: التوبۃ: ۳۵۔

گا۔ اسی وجہ سے ہمارے مذہب اسلام کو بھی "دین" کہتے ہیں کیونکہ اسلام قبول کرنے پر بدلہ ہے۔ جس طرح زہر اور دوا میں اثر ہے بالکل اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اعمال میں بھی اثر رکھ دیا ہے۔ زہر کھاتے ہی آدمی کو نقصان پہنچتا ہے، چاہے کوئی اخلاص سے کھائے، چاہے کوئی دوا سمجھ کر کھائے۔ اسی طرح ہمارے اعمال کا اثر بھی وہاں سامنے آنے والا ہے۔ وہاں پیغمبر ہوں گے، اوّلین و آخرین ہوں گے، اپنے اور پرائے ہوں گے، دوست و دُشمن ہوں گے، اللہ کے ولی ہوں گے، اپنے خاندان کے چھوٹے بڑے ہوں گے، سب لوگوں کی نگاہ اُس پر ہو گی، سب کے سامنے اس کے ایک ایک عمل کو کھولا جائے گا اور بتایا جائیگا، چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے گناہ سب کے سامنے پیش کئے جائیں گے، اگر ہمارے اعمال برے ہیں تو ہمارے لئے کتنی ذلت ہو گی؟

اس دن کی رسوائی سے پناہ مانگیں:

اسی ذلت سے بچنے کے لئے نبی ﷺ نے ہمیں اس دعا کو تشہد میں پڑھنے کا حکم دیا "لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ" [۱]

اور قرآن مجید میں بھی یہ دعا مذکور ہے، حضور پاک ﷺ بھی بطورِ خاص یہ دعا فرماتے تھے:

﴿وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ [۲]

یا اللہ! قیامت کے دن ہمیں رُسوا نہ فرمایئے، بیشک آپ وعدے کی خلاف ورزی نہیں فرماتے۔ اللہ پاک نے جواب میں فرمایا:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ﴾ [۳]

"یہ وہ دن ہو گا جس دن اللہ تعالیٰ نبی کو ذلیل نہیں کرے گا اور ایمان والوں کو بھی ذلیل نہیں کرے گا۔" یہ مالک یوم الدین کے ذیل میں قیامت کے کچھ احوال آپ کے سامنے ذکر کیے گئے اور اچھے لوگوں کی جزا اور برے لوگوں کی سزا کا کچھ تذکرہ کیا گیا، اللہ پاک ہم سب کو اس دن کی ذلت، رسوائی اور عذاب سے بچائے۔ (آمین)

۱: معجم طبرانی:۹۷۹۸۔ ۲: آل عمران:۱۹۴۔ ۳: التحریم:۸۔

”اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ“ کی تشریح

”تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں“

ماقبل سے ربط:

ابتدائی آیات میں یہ بات آپ کو بتائی گئی کہ اللہ تعالیٰ ہی سارے عالَموں اور ساری چیزوں کو وجود بخشتا ہے، ان کو باقی رکھتا ہے، ان سب کا رب ہے، اور ہم سب اس کے محتاج ہیں، جب اللہ ہمارا رب ہے اور ہم سب اس کے محتاج ہیں تو ہم کو اسی کے سامنے جھکنا چاہیے، اسی سے مدد مانگنی چاہیے، عبادت اور اطاعت اسی کی کرنی چاہیے، کیونکہ ربوبیت اطاعت اور عبادت کا تقاضہ کرتی ہے، اس لیے اگلی آیت میں ارشاد فرمایا: ﴿إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾۔

عبادت اور استعانت باری تعالیٰ کا حق ہے:

عبادت اور استعانت اللہ تبارک وتعالیٰ کے حقوقِ خاصہ میں سے ہیں۔ یعنی یہ حق اللہ تعالیٰ کا ذاتی ہے، کسی اور کو نہیں دیا گیا، اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ خالق اللہ ہیں، مالک اللہ ہیں، رب اللہ ہیں، حاکم اللہ ہیں لہٰذا عبادت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہو گی اور اللہ ہی سے مدد مانگی جائے گی، کسی اور سے نہیں۔

سورۂ فاتحہ کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک تو اس میں دعا کی ترغیب ہے۔(۲)عبادت اور استعانت کا حکم ہے۔(۳)اس عبادت اور استعانت میں حق تعالیٰ نے اپنا استحقاق ثابت کیا ہے۔

یہاں اللہ پاک عبادت اور استعانت کو اس انداز سے بھی ذکر کر سکتے تھے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو شریک مت کرنا، صرف اللہ کی عبادت کرنا، غیر اللہ کی پوجا مت کرنا، صرف اللہ ہی سے مدد مانگنا، لیکن حق تعالیٰ نے یہاں ایسا طرز اختیار کیا کہ عقل کے

لئے انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے، کیوں اللہ پاک نے پہلے اپنا خالق ہونا ثابت کیا، اس کے بعد اپنا رب ہونا ثابت کیا، اور ان دونوں صفات کے بارے میں فرمایا کہ یہ صرف میری صفت رحمت کی وجہ سے ہے کسی کے دباؤ کی وجہ سے نہیں، پھر اس کے بعد کہا کہ جب میں ہی تمہارا خالق ہوں اور تم سب کا رب ہوں اور تم سب میرے محتاج اور میرے رحم وکرم پر ہو تو بتاؤ کہ تم کس کی عبادت کروگے؟ کس سے مدد چاہوگے؟ ظاہر ہے کہ بندہ کے لئے یہاں اللہ پاک ہی کی طرف جھکنے، اللہ ہی کی عبادت کرنے اور اللہ ہی سے مدد چاہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

''ایاک نعبد'' سے متعلق پانچ نکات:

پہلا نکتہ:

اس جملہ میں اللہ پاک نے نعبد اور نستعین سے پہلے ''ایاک'' کا لفظ ذکر کیا جس سے معنیٰ میں حصر اور تخصیص پیدا ہوتی ہے،، اب مطلب یہ ہوگا کہ ''آپ ہی کی عبادت کریں گے، اورآپ ہی سے مدد مانگیں گے'' آپ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کسی اور سے مدد نہیں چاہیں گے، اس کو ایک مثال سے سمجھیں کہ کسی نے آپ کو دوائی لانے کے لئے کہا اور ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ آپ کو یہ دوا فلاں دکان پر مل جائے گی، لیکن اس نے کسی اور جگہ کی نفی نہیں کی، اب آپ فلاں دکان پر نہ جاسکے، کسی اور دکان پر گئے، وہاں وہ آپ کو مل جائے تو مل سکتی ہے، کیونکہ اس نے دوسری دکانوں کی تو نفی نہیں کی ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس نے دوائی لاتے وقت کہا کہ آپ کو یہ دوا پورے شکاگو میں صرف فلاں دکان ہی پر ملے گی، اس طرح کہنے سے اس میں تخصیص پیدا ہوگئی، وہ کسی اور دکان پر آپ کو نہیں ملے گی، یہاں پر بھی باری تعالیٰ نے یہی طرز اختیار کیا ہے، اور لفظِ ''ایاک'' کو پہلے استعمال کیا ہے، جس سے حصر اور تخصیص پیدا ہوگئی ہے، اگر ایاک

کو پہلے ذکر نہ کرتے تو یہ مفہوم پیدا نہ ہوتا، اس وقت مطلب یہ نکلتا کہ ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں، لیکن دوسرے کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں، اس سے متعلق کوئی اشارہ اس میں نہیں ہوتا، لیکن یہاں ایاک کو پہلے ذکر کیا گیا ہے، جس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اے اللہ! ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں، اور آپ کے غیر کی نہ عبادت کرتے ہیں اور نہ اس سے مدد چاہتے ہیں۔

دوسرا نکتہ:

اللہ پاک نے لفظ "نعبد" اور لفظ "نستعین" صیغۂ مضارع بیان کیا ہے، اور عربی میں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حال اور مستقبل دونوں کے لیے ہی بولا جاتا ہے۔ حال کے اعتبار سے ترجمہ یوں ہوگا: ہم عبادت کرتے ہیں اور مدد چاہتے ہیں، اور مستقبل کے اعتبار سے ترجمہ یوں ہوگا: ہم عبادت کریں گے اور مدد چاہیں گے، یہاں اللہ پاک نے مضارع کا صیغہ استعمال کرکے بتایا کہ فی الحال تمہیں میری ہی عبادت کرنی ہے اور آئندہ بھی، ایسے ہی فی الحال تمہیں مجھ ہی سے مدد چاہنی ہے اور آئندہ بھی، اس لیے یہاں مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ ہم اب آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے، اور ہم اب آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور آئندہ بھی چاہتے رہیں گے۔

تیسرا نکتہ:

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں اللہ پاک نے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں، متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا، اس کا ترجمہ یہ ہے: "یا اللہ! میں آپ کی عبادت کرتا ہوں۔" ظاہر ہے کہ متکلم کے صیغہ میں تکبر اور بڑائی جھلکتی ہے، اور اللہ پاک کو بندوں کی بڑائی پسند نہیں ہے، اس لئے جمع کا صیغہ لائے تاکہ تکبر اور بڑائی کا اظہار نہ ہو۔

چوتھا نکتہ:

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ عبادت کے لیے جس خلوصِ نیت اور استحضار کی ضرورت ہوتی ہے، وہ لوگوں میں بہت کم ہوتا ہے اور نماز کو اس کے ارکان، شرائط، سنن اور مستحبات کے ساتھ ادا کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں، اسی لیے جمع کا صیغہ لایا گیا کہ تاکہ جو بندہ اتنی رعایت اور استحضار کے ساتھ نماز ادا کر رہا ہے اس کی برکت سے سب کی نماز قبول ہو جائے۔

پانچواں نکتہ:

پانچواں نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پورے عالَم کی ربوبیت کر رہے ہیں لہٰذا پورے عالَم کے تصور کے ساتھ آدمی کہے کہ ”یا اللہ! ہم سب آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں“۔

کیونکہ علماء نے فرمایا ہے کہ ”نَعۡبُدُ“ (عبادت) میں فرشتوں کی عبادت بھی داخل ہے، کیونکہ فرشتے بھی عبادت میں مشغول ہیں، کچھ سجدہ کر رہے ہیں، کچھ رکوع کر رہے ہیں اور کچھ قیام میں ہیں، حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ آسمان کے اوپر چار انچ کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ قیام، رکوع اور سجدے میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان نہ کر رہا ہو۔ ان تمام فرشتوں کے بوجھ سے آسمان چرچرا رہا ہے اور اس کے لیے سزاوار ہے کہ آسمان چرچرائے۔ تمام درخت اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہے ہیں، تمام پہاڑ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہے ہیں، پانی کا قطرہ قطرہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے، ریت کا ذرّہ ذرّہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول ہے۔ ﴿وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ﴾، ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ انسان وجنات کے علاوہ ان تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے کلام کی دولت سے سرفراز نہیں فرمایا، کلامِ الٰہی صرف انسان پڑھتا ہے اور دوسری مخلوق کو ایک دوسری تسبیح دے دی گئی، وہ لوگ اس تسبیح کو پڑھتے رہتے ہیں۔

جانور بھی ذکرِ الٰہی کی برکت سے رزق پاتے ہیں:

جیسے آج ہم ''فضائلِ اعمال'' میں پڑھ رہے تھے کہ ''سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمۡدِہٖ'' تمام مخلوق کی تسبیح اور عبادت ہے اور اسی سے مخلوق کو روزی دی جاتی ہے۔[۱] چڑیوں کو جو روزی ملتی ہے وہ اسی تسبیح کی وجہ سے ملتی ہے۔ بعض روایتوں میں ''سُبۡحَانَ الۡمَلِكِ الۡقُدُّوۡس'' ہے۔ پرندے اپنی چہچہاہٹ میں یہی تسبیح کہتے ہیں اور اسی سے ان کو روزی دی جاتی ہے۔ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہے۔ آدمی ﴿اِیَّاكَ نَعۡبُدُ﴾ اس فہم سے کہے کہ یا اللہ! میں بلکہ عرش، کرسی، ساتوں آسمان، ساتوں زمین، پانی، سمندر، دریا، پہاڑ، ہوائیں، تمام درخت، تمام جنات، تمام انسان سب آپ ہی کی عبادت کر رہے ہیں، اس تصور کے ساتھ کہنے میں اللہ پاک کی بڑائی بیان ہوتی ہے، اور اپنی بڑائی اللہ کو بہت پسند ہے۔ اس لئے اس تصور کے ساتھ کہنا چاہئے۔

عبادت کا مفہوم:

خلاصہ یہ کہ اس آیتِ مبارکہ میں اللہ پاک کی عبادت کا ذکر ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ عبادت کسے کہتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انتہائی تعظیم اور محبت اور انتہائی ذلت اور عاجزی ظاہر کرنے کا نام عبادت ہے۔ عَبَدَ یَعۡبُدُ کے معنی ہیں: کسی کی آخری حد تک تعظیم اور محبت کرنا، ایسے ہی کسی کے سامنے آخری حد تک ذلت اور عاجزی کا اظہار کرنا، اور یہ کام سوائے حق تعالیٰ شانہ کے کسی اور کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ حد سے زیادہ تعظیم اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے، بلکہ اُن کی کوئی حد ہی نہیں۔ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ ہی سے ہو سکتی ہے جتنی بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرے کم ہے۔ جتنا زیادہ عاجزی اور ذلت کا اظہار کرے کم ہے، بندہ کا سر بندے کے قبضے میں ہے، جو بہت

---

[۱] مسند احمد: ۲:۱۰۷۔

معزز ہے، وہ کسی کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتا ہے، کسی کے سامنے اپنی ناک نہیں رگڑتا ہے اور کسی کے سامنے میں اپنا ماتھا نہیں ٹیکتا ہے۔ لیکن اللہ کے سامنے کہتا ہے کہ اے اللہ! میں آپ ہی کے لیے اپنی ناک زمین پر رگڑتا ہوں اور اپنا ماتھا ٹیکتا ہوں۔ یہ تو میرے بس میں ہے اگر زمین کے اندر گھس جانا میرے اختیار میں ہوتا تو وہ بھی کرلیتا لیکن وہ میرے قابو میں نہیں ہے۔

سجدہ کی حقیقت:

یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی ہوگی کہ اصل سجدہ زمین پر عاجزی اور ذلت کے ساتھ ناک رگڑنے کا نام ہے، قالینوں پر اصل سجدہ نہیں ہے۔ اگر قالین پر نماز پڑھی جائے تو وہ ہو جاتی ہے۔ مگر اصل ذلت کا اظہار زمین پر ہے۔ حضور اکرم ﷺ ہمیشہ زمین پر نماز پڑھتے رہے۔ مسجد نبوی چھپر کی تھی اور اس کی زمین پر کوئی فرش نہیں تھا حتیٰ کہ جب بارش ہوتی تھی تو زمین پر کیچڑ جمع ہو جاتا تھا۔[۱]

نماز میں چہرے سے مٹی صاف کرنے کی ممانعت:

اسی وجہ سے ایک روایت میں آیا ہے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ہمارے ایک غلام کو آپ ﷺ نے دیکھا کہ جب وہ سجدہ کرنا چاہا تو اس نے اس جگہ پھونک ماری، آپ ﷺ نے فرمایا: ”یَا أَفْلَحُ، تَرِّبْ وَجْهَكَ“[۲] اے افلح! چہرے پر مٹی لگنے دے اور اپنے چہرے کو خاک آلود ہونے دے، اللہ کے سامنے اپنی ذلت کے اظہار کے واسطے اپنے چہرے پر مٹی رہنے دے۔ اسی طرح آپ نے کپڑوں کو سمیٹنے سے بھی منع فرمایا ہے۔[۳] تاکہ اللہ کے سامنے عاجزی اور ذلت ظاہر ہو، کیونکہ عبادت کا اخلاص یہی ہے۔

---

[۱]: صحیح البخاری: کتاب الاذان، باب السجود علی الانف والسجود علی الطین۔ [۲]: سنن ترمذی: الصلاۃ، باب ماجاء فی کراھیۃ النفخ فی الصلاۃ۔ [۳]: سنن ابن ماجہ: کتاب اقامۃ الصلاۃ، والسنۃ فیھا، باب کف الشعر والثوب فی الصلاۃ۔

عبادت کی اقسام:

حق تعالیٰ شانہ نے عبادت کی مختلف صورتیں بنائی ہیں۔ چنانچہ کچھ عبادتیں جانی ہیں، اور کچھ مالی، پھر جانی عبادت کی دو قسمیں ہیں، ایک وجودی اور دوسری عدمی۔ وجودی کا مطلب کی جانے والی عبادتیں چاہے وہ زبان سے ہو یا دوسرے اعضاء سے، جیسے: نماز، سجدہ، رکوع، تلاوت، اذکار بیت اللہ کا طواف، صفامروہ کی سعی وغیرہ، یہ سب ''وجودی عبادتیں'' ہیں جو بدن یا جان سے متعلق ہیں۔

کچھ عبادتیں عدمی ہیں وہ بھی اظہارِ عظمت ہی کے لیے ہیں جیسے روزہ میں کھانا ترک کیا جائے پانی نہ پیا جائے، بیوی کے پاس نہ جایا جائے، حج کے موقع پر درخت نہ کاٹے جائیں، کھٹمل نہ مارا جائے، جوں نہ ماری جائے، کسی جانور کا شکار نہ کیا جائے وغیرہ، یہ عبادتیں عدمی ہیں یعنی یہ نہ کرنے والے کام ہیں۔ یہ سب محض اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت ظاہر کرنے کیلئے ہیں۔

مالی عبادات کی بھی مختلف صورتیں ہیں جیسے زکوٰۃ، صدقۂ فطر، قربانی، غلام کا آزاد کرنا وغیرہ۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت ظاہر کرنے کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ کسی اور کیلئے نہیں کیا جاسکتا، سجدہ، رکوع، نماز، روزہ، نذر، اعتکاف، طواف، سعی، قربانی یہ تمام عبادتیں سوائے اللہ کے کسی اور کے لئے نہیں کی جاسکتیں، کیونکہ ''ایاک نعبد'' میں حق تعالیٰ سے عبادت کا معاہدہ ہوا ہے، اور عبادت کا مستحق بھی وہی ہے اس لئے کسی اور کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہے، حق تعالیٰ شانہ نے عبادت کی جو صورتیں اپنے لیے خاص فرمائی ہیں، بندے کے لیے لازمی ہے کہ وہ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔ عبادت میں شریک کرنا تو دور کی بات ہے اس امت میں کسی اور کے لئے عبادت کی مشابہت بھی جائز نہیں ہے۔ عبادت تو دور کی بات ہے بلکہ ان کے

طور طریقوں کی مشابہت کی بھی اس امت میں اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس میں ان کی تعظیم اور توقیر ہوتی ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے ان کی عبادت اور طور طریقوں میں مشابہت اور ان کے خاص شعائر کا استعمال سب کو ناجائز قرار دیا ہے۔

صلیب پہننے کی ممانعت:

اسی وجہ سے ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عدی ابن حاتم اسلام قبول کرنے کے بعد حضور پاک ﷺ کے پاس حاضر ہوئے۔ اور آپ کی مجلس میں بیٹھ گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: "يَا عَدِيُّ اِطْرَحْ عَنْكَ هٰذَا الْوَثَنَ"[1] اے عدی! اپنے گلے سے یہ بُت نکال دو۔" وہ گلے میں صلیب کا نشان پہنے ہوئے تھے۔ عیسائیوں کے اس صلیبی نشان کو حضور ﷺ نے صراحتاً بت فرمایا اور فرمایا کہ: "اس بُت کو اپنے گلے سے نکال دو۔"

غیر مسلموں کے شعائر کا استعمال بھی حرام ہے:

کیونکہ یہ کافروں کی خاص نشانی ہے، اور اس کے پہننے سے اس کی عظمت اور بڑائی ظاہر ہوتی ہے، اس لئے جیسے آدمی کے لئے کلمۂ کفر کہنا جائز نہیں ہے، کفر کا کام بھی جائز نہیں ہے، ایسے ہی کفر کی علامتوں کو اختیار کرنا اور اس کو پہننا بھی جائز نہیں ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ ایک آدمی زُنّار پہنے ہوئے ہے، یہ زُنّار غیر مسلم عام طور پر گلے میں ڈالتے ہیں جو ایک قسم کی لال ڈوری ہوتی ہے اور نصرانی وغیرہ کمر میں باندھتے ہیں، اس آدمی کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہے کہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم، ایسی حالت میں شریعت اُس پر کافر ہونے کا حکم لگائے گی۔ اگر وہ اسی حالت میں مر گیا تو اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا اور نہ اُس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، کیونکہ یہ کافروں کی خاص علامت پہنے ہوئے ہے، کیونکہ حق تعالیٰ شانہ نے شرک

---

[1] سنن ترمذی: تفسیر القرآن/ باب: ومن سورة التوبة۔

اور شواہدِ شرک یعنی شرک کی علامات سے بھی بچنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے اگر کسی کی عبادت میں ذرا بھی شرک کا شائبہ ہو گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے مجھے ایسی عبادت کی ضرورت نہیں ہے، جس کے لیے تم نے یہ عبادت کی ہے، اُسی سے بدلہ لے لو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ"[1]

"میں سب سے زیادہ غنی اور سب سے زیادہ بے نیاز ہوں شرک سے۔"

غیر اللہ کے لئے عبادت کی مشابہت بھی جائز نہیں ہے:

اللہ پاک نے فرمایا کہ نہیں، کسی بھی مقصد سے ان کی عبادت نہیں کی جاسکتی، عبادت صرف اور صرف میرا حق ہے۔ عاجزی اور ذلت ظاہر کرنے کے سب طریقے میرے ساتھ خاص ہیں۔ عبادت تو دور کی بات ہے حتی کہ اگر صورتاً کہیں عبادت کا شائبہ پیدا ہو رہا ہو تو یہ بھی اس شریعت میں جائز نہیں ہے۔ حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ مقام حِیرہ گئے تو دیکھا کہ لوگ مرزبان کو سجدہ کر رہے ہیں، انہوں نے کہا کہ اس سے زیادہ تو رسول اللہ ﷺ سجدہ کئے جانے کے حقدار ہیں، دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ میں حیرہ گیا تھا میں نے دیکھا کہ وہ لوگ اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے ہیں اور وہ ایک چھوٹی زمین کے مالک ہیں اور کافر ہیں، آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے، جب وہ اُن کے لیے اتنی تعظیم کا مستحق ہے کہ اُس کو سجدہ کیا جاتا ہے تو آپ تو دونوں جہانوں کے سردار ہیں اور آپ اللہ کے حبیب ہیں، اللہ کے رسول ہیں، امام الانبیاء ہیں، آپ ﷺ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔ یعنی صحابہ اس واقعے کو سنا کر آپ ﷺ سے اس کی اجازت چاہتے تھے، جب حضور پاک ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا: "اچھا! کیا تم میرے بعد میری قبر کو سجدہ کروگے؟" انہوں نے کہا نہیں! پھر آپ

---

[1]: صحیح مسلم: الزهد والرقائق / باب من اشرک فی عملہ غیر اللہ۔

نے فرمایا اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ تعالی نے ان کا حق عورتوں پر اس قدر رکھا ہے، معلوم ہوا کہ نبی نے محض سجدہ کرنے سے بھی روک دیا، کیونکہ تعظیمی سجدہ میں بھی عبادت کا شبہ ہے۔[۱]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جب ملک شام گئے تو دیکھا کہ نصاریٰ اپنے مذہبی پیشواؤں، پادریوں اور رہنماؤں کو سجدہ کرتے ہیں اور یہودیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے علماء، رہبان اور پیشواؤں کو سجدہ کرتے ہیں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ اس طرح کیوں کرتے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ یہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا تحیہ ہے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم اس سے زیادہ حق رکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ معاملہ کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انہوں نے انبیاء کی طرف جھوٹ منسوب کیا ہے، جیسا کہ وہ اپنی کتابوں کو بدل چکے ہیں۔[۲]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین وانصار کی جماعت میں موجود تھے کہ ایک اونٹ نے آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا، صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ کو جانور اور درخت سجدہ کرتے ہیں، ہم تو ان سے زیادہ حقدار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اُعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ وَاَکۡرِمُوۡا اَخَاکُمۡ"[۳] اپنے رب کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کا اکرام کرو۔

یہود ونصاریٰ پر لعنت کی ایک وجہ:

ایک روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَعَنَ اللّٰهُ الۡیَهُوۡدَ وَالنَّصَارٰی، اِتَّخَذُوۡا قُبُوۡرَ اَنۡۢبِیَائِهِمۡ مَسۡجِدًا"[۴]

۱: سنن ابی داود: النکاح/ باب فی حق الزوج علی المرأۃ۔ ۲: مستدرک حاکم: ۷۳۲۵۔ ۳: مسند احمد: ۲۴۴۷۱۔ ۴: صحیح بخاری: الجنائز/ باب مایکرہ من اتخاذ المساجد علی القبور۔

"اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کیونکہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔" نبیوں کی تعظیم ظاہر کرنے کے لیے اُن کی قبروں کو سجدہ کرنے لگے۔

ان احادیث میں نبی ﷺ نے تعظیماً سجدہ کرنے سے بھی منع فرمادیا، کیونکہ تعظیماً سجدہ کرنے میں عبادت کا شائبہ ہوتا ہے، اوراس امت میں یہ بھی جائز نہیں ہے، دوسری امتوں میں اگرچہ تعظیما سجدہ کی گنجائش تھی جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے، لیکن اس امت میں اس کی اجازت نہیں ہے۔

آداب اور تعظیم کے بھی حدود ہیں:

ایک اہم بات یہاں عرض کردوں۔ ایک ہے کسی چیز کی عظمت و محبت اور ایک ہے اس کے ساتھ عظمت و محبت کی شرعی حد۔ بیت اللہ مقدس جگہ ہے۔ بیت المقدس بھی مقدس جگہ ہے، مسلمانوں کا قبلۂ اوّل رہاہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اب بھی اُس میں تقدیس کی شان رکھی ہے، قُدس بہر حال قدس ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿اَلَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا﴾[1]

"ہم نے اُس کے اطراف میں (بھی) برکتیں رکھ دی ہیں"۔

بہر حال بیت اللہ بھی مقدس ہے اور بیت المقدس بھی مقدس ہے۔ دونوں کی تعظیم کی جائے گی، مگر دونوں کا حکم الگ الگ ہے۔ اگر کوئی بیت المقدس کا طواف کرے گا تو وہ طواف معتبر نہیں ہے۔ کوئی بیت المقدس جاکر مناسکِ حج ادا کرے گا توحج ادا نہیں ہوگا ، کیونکہ ہر ایک کی تعظیم کے آداب بھی من جانب اللہ مقرر ہیں، ہم اپنی طرف سے جیساچاہے ادب و احترام اس کے ساتھ نہیں کرسکتے حالانکہ بیت المقدس کی بھی بے ادبی اور بے حرمتی بھی جائز نہیں ہے۔ اس لئے کسی کے ادب و احترام میں بھی

---

[1]: بنی اسرائیل:۱۔

شریعت کو دیکھنا چاہئے کہ شریعت کس کے ساتھ کیسا ادب واحترام کا حکم دیتی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے محبت و عظمت کی بہت سی صورتیں رکھی ہیں۔ جیسے آپ ﷺ کی تعظیم کی جائے گی، آپ سے محبت کی جائے گی، آپ کی اطاعت کی جائے گی یہ آپ کے حقوق میں سے ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے سامنے عاجزی اختیار کرنے کے جو طریقے مقرر کردیے ہیں وہ محبت اور عقیدت میں آپ ﷺ کے لئے نہیں کئے جاسکتے، جب آپ ﷺ پر اس کی حد لگادی گئی تو پھر دوسروں کے بارے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر مخلوق کسی کیلئے احترام میں آگے سے آگے جاسکتی ہے تو وہ سرکار دوعالم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے، وہاں پر یہ حد بندی قائم کردی گئی تو دوسروں کا کیا سوال؟

توحیدِ الوہیت اور توحیدِ عبودیت دونوں ضروری ہیں:

توحید الوہیت اور توحید عبودیت یعنی معبود ہونے میں بھی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا ضروری ہے اور عبادت کرنے میں بھی صرف تنہا اللہ کی عبادت کرنا ضروری ہے۔ مشرکینِ مکہ توحیدِ الوہیت کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آسمان وزمین کا خالق ومالک اللہ ہی ہے اور ربّ اللہ ہے، ہم کو پیدا کرنے والا اللہ ہے، ہماری موت وحیات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باوجود حق تعالیٰ شانہ نے انہیں مشرک بتایا۔ وہ کون سی بات تھی جس پر انہیں مشرک بتایا گیا، وہ بات یہ تھی کہ وہ شرکِ عبودیت میں مبتلا تھے۔ وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے اور ان کے بارے میں انہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ یہ اللہ کے مقرب ہیں۔ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے:

﴿مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى﴾[۱]

”ہم لوگ ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ ہمیں اللہ سے قریب کردیں گے۔“

۱: زمر: ۳۔

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ﴾[۱]

”جتنے بتوں کو ہم پوجتے ہیں ہم انہیں خدا نہیں سمجھتے، یہ ہمیں اللہ کے قریب کردیں گے۔“

عبادت کا مفہوم سمجھانے کیلئے قرآنی انداز:

عبادت کا مفہوم سمجھانے کے لئے قرآن پاک میں شرک کو زیادہ سمجھایا گیا، کیونکہ ایک مقولہ ہے: ”اَلۡاَشۡیَاءُ تُعۡرَفُ بِاَضۡدَادِهَا“، چیز اپنی ضد کے ذریعہ پہچانی جاتی ہے۔ جب تک اسلام نہیں آیا تھا اور غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے اُس وقت تک عمومی طور پر کچھ علوی اجسام کے بارے میں، کچھ سفلی اجسام کے بارے میں، کچھ جسمانی اجسام کے بارے میں، کچھ روحانی اجسام کے بارے میں مختلف قوموں کا اور مختلف جماعتوں کا ایک ذہن بنا ہوا تھا کہ اس میں نفع و نقصان ہے، لہٰذا اُن کے سامنے اپنی عاجزی اور ذلت کا اظہار کرنا چاہیے۔ چنانچہ آپ ہندوؤں کو، وید کے ماننے والوں کو، مجوسیوں کو، پارسیوں کو، آتش پرستوں کو، عیسائیوں کو، دیکھیں گے کہ وہ کسی نہ کسی کی عبادت میں مبتلا ہیں اور اللہ کے ساتھ کسی نہ کسی کو شریک کرتے ہیں۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں بعض ایسے ہیں کہ جب تک سورج کی پوجا نہیں کرلیتے وہ پانی کے قریب نہیں جاتے۔ انہوں نے چاند و سورج اور اس قسم کی مخلوقات کے بارے میں سوچ لیا کہ ان میں نفع و نقصان کی صلاحیت ہے، لہٰذا انہیں پوجنا چاہئے، کچھ ایسے ہیں جو عناصر اربعہ (آگ، پانی، مٹی، ہوا) کو پوجتے ہیں۔ پارسی تو خاص کر آگ کی پوجا کرتے ہیں اور اس کی پوجا یہ ہے کہ اس کے سامنے دم دو کرنا اور اُس کو جلاتے رہنا۔ یعنی یہ ایسا خدا ہے کہ اگر ہم باقی رکھیں تو وہ بھی باقی رہے گا اور اگر باقی نہ رکھیں تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ آگ کو

---

[۱]: یونس:۱۸۔

جلاتے رہیں گے تو وہ خدا رہے گا اور اُس کو آگ دینا بند کر دیں گے تو وہ ختم ہو جائے گا۔ آگ ہم کو وجود نہیں دے سکتی ہم خود اُس کو وجود دیتے ہیں۔ بھلا! یہ کوئی خدائی ہوئی؟

ایک صحابی کا واقعہ:

حضرت عامر بن طفیل دوسی رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے آخری صحابی یہی تھے۔ وہ اپنے زمانۂ جاہلیت کی ایک بات سنا رہے تھے، کہنے لگے کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں کر پاتا تو وہ کن کن توہمات میں پڑتا ہے اور کن کن طریقے سے شرک کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک مرتبہ سفر میں جا رہا تھا، راستے میں مجھے عبادت کرنے کا خیال آیا، میں سوچنے لگا کہ کس کی عبادت کروں؟ میرے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اپنے اونٹ سے اُترا اور اپنے توشے دان میں دیکھا تو اُس میں تھوڑا سا دودھ تھا، وہ دودھ میں نے لیا اور وہیں ریگستان میں ریت کا ایک ٹیلا بنایا، اُس میں گڑھا کیا۔ پھر اُس گڑھے میں وہ دودھ ڈالا، پھر اُس کے سات چکر لگایا اور سلام کر کے وہاں سے چل پڑا۔

بعض لوگ وہ ہیں جو خیر کا خالق الگ مانتے ہیں اور شر کا خالق الگ مانتے ہیں، خیر کے خدا کا نام انہوں نے ”یزداں“ رکھا، شر کے خدا کا نام ”اہرمن“ رکھا۔

یہود و نصاریٰ کے افتراء کا اثر:

کچھ فرقے وہ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں اور ان کو خدا سمجھتے ہیں، اللہ پاک ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۖ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ﴾

”اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کہا کرتے تھے۔ یہ بھی انہیں کی ریس کرنے لگے ہیں۔ خدا ان کو ہلاک کرے، کہ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں؟“

عیسائیوں پر عتاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا، أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا﴾[۱]

”قریب ہے کہ اس (افترا) سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں، اس لئے کہ انہوں نے خدا کے لئے بیٹا تجویز کیا، حق تعالیٰ شانہ فرمارہے ہیں کہ آسمان وزمین کے درمیان اتنا بڑا جرم وجود میں آگیا اور آسمان سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ پر اتنا بڑا بہتان لگ جائے اور آسمان باقی رہے میں باقی رہوں۔

﴿وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا﴾[۲]

”اور رحمن کے لیے یہ بات شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔“

قیامت میں رب ذو لجلال کا حضرت عیسی علیہ السلام پر اثر:

یہ لوگ اپنی جگہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت مقدس کام کر رہے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے پاس یہ اتنا ہی بڑا جرم ہے۔ کل میدانِ حشر میں اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے سامنے کھڑا کریں گے، جب کہ عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی قصور نہیں ہے، بلکہ ان کے ماننے والوں کا قصور ہے، لیکن اللہ تعالیٰ میدانِ حشر میں ان عیسائیوں سے ناراضگی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے۔ جیسے زندہ در گور کی جانے والی بچی سے اللہ پاک سوال کریں گے:

---

[۱]: مریم: ۹۰-۹۱۔ [۲]: مریم: ۹۲۔

﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ، بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ ۱

”میدانِ حشر وہ دن ہے جس دن زندہ درگور بچی سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس جرم میں دفن کیا گیا۔“ اب اس میں بچی کا کیا قصور ہے؟ جرم کرنے والے تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے دفن کیا مگر اللہ تعالیٰ اتنے ناراض ہوں گے کہ اُس معصوم اور بے گناہ بچی کو اُٹھا کر پوچھیں گے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے کتنا ناراض ہوں گے۔ بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کھڑا کریں گے اور اُن سے فرمائیں گے:

﴿أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ﴾ ۲

”عیسیٰ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ تم خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو معبود بناؤ۔“

روایتوں میں آتا ہے کہ اُس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھر تھرا جائیں گے اور اُن کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کی وجہ سے اُن کے رونگٹوں میں سے خون ٹپک رہا ہو گا۔ ۳ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے سامنے کھڑا کر کے یہ بات پوچھیں گے تو اُن پر اللہ تعالیٰ کی بے حد ہیبت طاری ہو گی اور ان کو بے انتہاء شرمندگی ہو گی اس وجہ سے کہ لوگوں نے میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ایسا معاملہ کر دیا۔

﴿قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ﴾ ۴

”فرمائیں گے اے پروردگار! آپ کی ذات پاک ہے، مجھے اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں ان سے وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں“۔

﴿إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ﴾

”اے پروردگار! اگر میں نے کہا تو آپ جانتے ہیں۔“

﴿تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾ ۵

۱: التکویر:۸۔ ۲: المائدہ:۱۱۶۔ ۳: تفسیر خازن:۲/۹۴۔ ۴: المائدہ:۱۱۶۔ ۵: المائدہ:۱۱۶۔

’’جو کچھ میرے جی میں ہے آپ جانتے ہیں اور جو کچھ آپ کے جی میں ہے میں نہیں جانتا، آپ غیب کے جاننے والے ہیں۔‘‘

میں نے یہ آیتیں اس لیے بیان کی ہیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ حق تعالیٰ شانہ عبادت کے معاملے میں کتنے سخت ہیں؟ کیونکہ عبادت صرف اور صرف اللہ پاک کا حق ہے، اس میں کسی اور کی طرف متوجہ ہونے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

استعانت کیا ہے؟:

اسی طریقے سے استعانت کا بھی معاملہ ہے۔ استعانت مدد کو کہتے ہیں۔ اس میں چار مراحل ہوتے ہیں۔ (۱) ایک تو یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو چاہ رہا ہے اُس کو جانے اور اس کی طلب و خواہش دل میں آئے اور اس کا ارادہ کرے۔ (۲) دوسری بات یہ ہے کہ اس کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے اُن کو مہیا کیا جائے۔ (۳) تیسری بات یہ ہے کہ اس میں جو رکاوٹیں آرہی ہیں اُن کو دور کیا جائے۔ (۴) چوتھی بات یہ ہے کہ مدد کی غرض پوری ہو جائے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ سارے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں لیکن غرض مرتب نہیں ہو پاتی۔ جیسے ہم نے کبھی کھانا کھایا لیکن بھوک ختم نہیں ہوئی، ہم نے پانی پیا لیکن پیاس نہیں بجھی، ہم نے دوا کھائی لیکن شفا حاصل نہیں ہوئی۔ ان سب چیزوں میں اسباب مہیا ہو گئے تھے لیکن کام پھر بھی نہیں بنا۔ ان چاروں کاموں کے لیے بندہ کی مصلحتوں کا جو علم چاہیے وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے، نیز مخلوق کی ضروریات سننا، جاننا، دیکھنا، اس کا ارادہ کرنا اور اس کو پورا کرنا سوائے اللہ کے کسی کے بس میں نہیں۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہ عبادت اور استعانت دونوں کے مستحق ہیں۔

عبادت میں بھی استعانت مطلوب ہے:

جیسے دوسری چیزوں میں اللہ ہی سے مدد طلب کی جاتی ہے ایسے ہی عبادت میں بھی اللہ ہی سے مدد مانگنی چاہیے، کیونکہ اللہ کی مدد اور توفیق کے بغیر ہم عبادت بھی نہیں

کرسکتے، تو ﴿نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ کا مطلب یہ ہوا کہ ہم عبادت تو آپ ہی کی کریں گے لیکن آپ کی عبادت بھی اسی وقت ہو سکتی ہے جب آپ کی مدد ہو، اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر آدمی نہ عبادت کر سکتا ہے اور نہ کوئی کام کر سکتا ہے۔

استعانت بھی عبادت ہے:

اللہ پاک سے مدد مانگنا بھی خاص عبادت ہے، کیونکہ مدد مانگنے میں آدمی ہاتھ پھیلا کر دعا کرتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا عاجزی چاہیے کہ ایک اچھا خاصا، تندرست، مالدار باعزت آدمی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر مانگے۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا:

"اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃْ" [۱]

"دعا عبادت کا مغز ہے۔"

استعانت کی تین صورتیں:

غیر اللہ سے مدد چاہنے کی تین صورتیں ہیں۔

پہلی صورت:

ایک یہ ہے کہ مادّی اسباب میں ایک آدمی دوسرے سے مدد چاہے۔ مثلاً چاول کے لیے چاول والے سے مدد چاہے، کپڑا بنانے والے سے مدد لے کر کپڑے بنوائے جائیں، فیکٹری اور کمپنی والے لوگوں کی خدمات حاصل کر کے اُن کے ذریعے اپنا کام چلائیں، حکومت، رعایا سے مدد لے کر حکومت کے کام چلائے تو اس کی شریعت میں اجازت ہے، کیونکہ اس میں کسی کی تعظیم نہیں پائی جاتی۔ اور نہ کسی کو قادر مطلق اور مختار سمجھا جاتا ہے، اور آدمی اس طرح مدد چاہنے پر مجبور بھی ہے، کیونکہ ایک آدمی اپنی ساری حاجتیں اور ضرورتیں خود سے پوری نہیں کر سکتا، انسان مدنی الطبع ہے، اپنی طبیعت کے اعتبار

---

[۱] سنن ترمذی: الدعوات / باب من باب من جاء فی فضل الدعاء۔

سے اُس میں مدنیت ہے۔ اس کو بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اور خود اپنے طور پر ساری چیزیں فراہم نہیں کر سکتا۔ اسی لیے دوسرے سے مدد لینا اور مدد کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں، اس لئے یہ نہ صرف جائز بلکہ شریعت میں ایسا کرنا ضروری ہے، اس کا باقاعدہ حکم دیا گیا۔ اگر کوئی آدمی ایسا نہ کرے اور دوسرے کو کوئی ضرر اور نقصان لاحق ہو گیا تو مدد نہ کرنے والا گنہگار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں ایک بات یہ ضروری ہے کہ اس میں فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً حفاظت کرنے والے تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں لیکن فوج سے کام لیا جائے۔ رب تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں لیکن مختلف ادارے اپنے طور پر غرباء اور محتاجوں کی ضرورتوں کا انتظام کرتے ہیں۔ رب تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں لیکن ماں باپ اپنے بچے کو پالتے ہیں۔ شوہر بیوی کو پالتا ہے، کیونکہ ان کو پالنا حقوقِ شرع میں سے ہے۔ لیکن اس پالنے میں، مدد کرنے اور مدد دینے میں فاعلِ حقیقی رب اللہ تعالیٰ کو مانے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

دوسری صورت:

استعانت کی دوسری قسم یہ ہے کہ غیر اللہ سے مدد مانگی جائے، لیکن ان کو قادرِ مطلق سمجھ کر مدد طلب کی جائے، اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اُن کے پاس اختیارات ہیں تو یہ شرکِ صریح اور کفرِ صریح ہے۔ اب چاہے وہ جبرئیل ہو، میکائیل ہو، اسرافیل ہو، انبیاء ہو، اولیاء ہو، کوئی بھی ہو۔ مشرکین مکہ اس درجہ کا شرک نہیں کرتے تھے، وہ لوگ اس سے کم درجے کا شرک کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قادرِ مطلق تو صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ۔ حضور اکرم ﷺ نے کئی دفعہ مشرکین مکہ سے پوچھا: ”بتاؤ! زمین والے خدا قادر ہیں یا آسمان والا خدا؟“ کہنے لگے کہ آسمان والا ہی قادر ہے۔ لیکن یہ زمین والے ایسے ہیں کہ اللہ نے ان لوگوں کو کام بانٹ دیے

ہیں، کسی کے ذمے اولاد دینا ہے، کسی کے ذمے، رزق دینا ہے، کسی کے ذمے، مصیبتوں کو دور کرنا ہے، فلاں سفر کا رب ہے، فلاں حضر کا رب ہے، فلاں کاروبار کا رب ہے، اس طرح انہوں نے تین سو ساٹھ خدا بنائے اور بیت اللہ کے اندر اُن کو داخل بھی کر دیا۔ جب حضور پاک ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اس کی تطہیر فرمائی۔ اور اس کو سابقہ حالت کی طرح صاف کر دیا۔

جب ہمارے ملک انڈیا میں بابری مسجد کا مسئلہ چلا تو اس موقع پر مخالفین کی طرف سے تقریریں کی گئیں۔ ان میں سے ایک تقریر بڑی زور و شور سے یہ کی گئی کہ تم لوگ بابری مسجد کا سوال کرتے ہو، یہ تو دور کی بات ہے اصلاً بیت اللہ بھی تو ہمارا تھا، اُس میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے اور اس بات کو تم لوگ بھی مانتے ہو، اصلاً وہ بھی مندر تھا، لیکن تم نے اس پر قبضہ کرلیا، ہمارے علماء نے جواب دیا کہ جیسے تم نے اب بابری مسجد کو شہید کر کے اس میں رام کے پتلے رکھے ہیں، ایسے ہی ابتداء میں بیت اللہ خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی کے لیے بنایا گیا تھا، لیکن تم نے اس میں تین سو ساٹھ بت رکھ دیے تھے، پھر اُس کو صاف کیا گیا۔ جیسے بیت اللہ سے بتوں کی صفائی کی گئی ایسے ہی انشاء اللہ! ایسے ہی ایک وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ اس کو بھی صاف کروا دیں گے۔

تیسری صورت:

استعانت کی تیسری قسم یہ ہے کہ مدد چاہنے میں غیر اللہ کو قادرِ مطلق تو نہ سمجھا جائے، لیکن ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے طور پر کچھ اختیارات ان کو دے دیے ہیں۔ جیسا کہ مشرکین مکہ کا عقیدہ تھا تو یہ بھی اعتقادی شرک ہوا اور ایسا سمجھ کر اُن کے ساتھ عظمت کو ظاہر کرنا یہ عملی شرک ہوا۔ اس کی بھی شریعت میں اجازت نہیں ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں۔

غیر اللہ کے قادر ہونے پر اشکالات اور اس کے جوابات:

یہاں کچھ باتیں اچھی طرح سمجھنے کی ہیں کیونکہ ہمیشہ آدمی اسی پوائنٹ (Point) پر کنفیوژ (Confuse) ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ حدیث پاک سے خود یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے فرشتوں کو مختلف خدمتوں پر لگایا ہے۔ اسرافیل علیہ السلام کو صور پھونکنے کے کام پر لگایا ہے،[۱] میکائیل علیہ السلام کو پانی برسانے پر لگایا ہے،[۲] عزرائیل علیہ السلام کو جان نکالنے پر لگایا ہے،[۳] پہاڑوں کے فرشتے الگ ہیں، ہواؤں کے فرشتے الگ ہیں، سمندروں کے فرشتے الگ ہیں، انسانوں کی حفاظت کے فرشتے الگ ہیں، اور فرشتے بھی غیر اللہ ہیں۔ لہٰذا غیر اللہ کا قادر ہونا ثابت ہوا۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بہت سے اہل اللہ اور بزرگانِ دین کے ذریعے ایسے ایسے اعمال صادر کرواتے ہیں جو عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ جن کو کرامت کہا جاتا ہے، یہ حق ہیں اور یہ اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد میں سے ہے۔ اگر کسی نے اس کو نہیں مانا تو اُس کے دائرۂ ایمان سے خارج ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے کراموں کا ثبوت ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی بے شمار کرامتیں ثابت ہیں۔ حضرت مولانا یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "حیاۃ الصحابہ" کی تیسری جلد میں حضراتِ صحابہ سے ظاہر ہونے والی کرامتوں کو تفصیل سے لکھا ہے۔ تقریباً دو سو سے زائد کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت:

جیسے ایک مشہور کرامت یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جب مصر فتح کیا تو اہل مصر آکر کہنے لگے کہ اے امیر دریائے نیل میں پانی باقی رہنے کے لیے ہم لوگ

---

[۱]: معجم الاوسط: ۹۲۸۳۔ [۲]: معجم الکبیر للطبرانی: ۱۲۰۶۱۔ [۳]: العظمۃ لابی الشیخ، وقد ورد ھذا عن اشعث ووھب بن منبہ: ۴۳۹، ۴۴۳۔

اس مہینہ کی بارہویں رات کو ایک کنواری اور ماں باپ کی اکلوتی لڑکی کو منتخب کرتے ہیں اور اس کے ماں باپ کو راضی کر کے اسے زیور اور لباس سے سجا کر اس دریا میں ڈال دیتے ہیں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسلام میں اس کی بالکل گنجائش نہیں ہے اسلام تو ایسی رسموں کی بیخ کنی کرتا ہے، جب اہل مصر نے یہ سنا تو جن مہینوں میں یہ لوگ بھینٹ چڑھاتے تھے ان مہینوں میں اس عمل سے رکے رہے، جب دریائے نیل جاری نہ ہوا تو مصر چھوڑ کر چلے جانے کا ارادہ کرلیا، حضرت عمرو بن العاص کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ یہاں کے رہنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ ہر سال دریائے نیل جاری کرنے کے لئے اس میں ایک لڑکی کی بھینٹ چڑھانی پڑتی ہے تب یہ دریا جاری ہوتا ہے اور میں نے ان کو اس عمل سے باز رکھا ہے، اب کیا کیا جائے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصر کے دریائے نیل کے نام پرچہ لکھا اور فرمایا کہ یہ خط پہنچتے ہی اس پرچہ کو دریا میں ڈال دینا خط پہنچنے پر حضرت ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اس پرچہ کو پڑھا، اس میں لکھا تھا کہ اللہ کے بندے عمر امیر المومنین کی جانب سے اہل مصر کے دریائے نیل کے نام، امابعد اگر تو اپنی طرف سے جاری ہوتا تھا تو مت جاری ہو اور اگر اللہ واحد قہار نے تجھے جاری کیا ہے تو ہم اللہ واحد قہار کی ذات سے سوال کرتے ہیں کہ تجھے جاری کر دے۔ حضرت ابن عاص رضی اللہ عنہ نے وہ خط دریا میں ڈال دیا اور لوگوں نے صبح میں دیکھا کہ اللہ تعالی نے دریا کو جاری کر دیا ہے اور ایک ہی رات میں اس کا پانی سولہ ہاتھ اوپر تک آچکا ہے۔[1]

کرامت میں فاعل حقیقی اللہ ہی ہوتے ہیں

ان کرامات کے واقعات سے غلط فہمی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی قدرت اور اختیار دے دیا ہے، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کرامتوں میں فاعل

---

[1] کرامات الاولیاء للالکائی: سیاق ماروی من کرامات امیر المونین ابی حفص عمر بن الخطاب ۶۲/، البدایہ والنہایہ: ۷/ ۱۱۵۔

حقیقی ہوتے ہیں، بظاہر ان سے کرامت کا ظہور ہوتا ہے لیکن پسِ پردہ اللہ کی قدرت ہی کارفرما ہوتی ہے، یہ لوگ اپنے ذمے کئے گئے کاموں کو کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کے محتاج ہوتے ہیں، اس لیے ان لوگوں سے مطلوبہ کام کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

ایک مثال سے وضاحت:

ایک بزرگ نے اس کی بڑی اچھی مثال دی کہ ایک ٹیوب لائٹ ہے۔ یہ ٹیوب روشنی دینے میں بالکل محتاج محض ہے، اس میں بذاتِ خود کچھ نہیں ہے۔ اصل بجلی ہے جو سوئچ آن(Switch on) کرنے پر فراہم ہوتی ہے۔ جیسے ہی سوئچ آن(Switch on) ہوتا ہے ٹیوب روشن ہو جاتی ہے۔ اگر سوئچ آن کیے بغیر اس ٹیوب سے کوئی کہے کہ تم مسجد میں لگی ہوئی ہو اور مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، لہذا تم روشن ہو جاؤ تو یہ سوئچ آن کیے بغیر روشن ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی کیفیت اُس مخلوق کی بھی ہے، جس پر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کو ظاہر کرتے ہیں، وہ کرامتوں کو ظاہر کرنے میں خود مختار نہیں ہوتے، بلکہ اللہ پاک کے محتاج ہی ہوتے ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے دوسرے عام لوگوں کی طرح بے حیثیت ہیں۔ بلکہ ان کی بھی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ اس لئے غیر اللہ سے استعانت کی چاہے وہ وہ باحیات ہوں یا بے حیات، کسی بھی حال میں اجازت نہیں ہے۔ نہ ان کے سامنے وہ آدابِ تعظیم بجالاسکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور نہ اُن سے مدد مانگی جاسکتی ہے، کیونکہ مدد مانگنا عبادت کا ایک حصہ ہے، البتہ ان کا ادب واحترام کریں گے، کیونکہ اللہ پاک سے تعلق کی وجہ سے اللہ کے ہاں ان کا ایک مقام اور ایک حیثیت ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہ، نے دونوں باتیں یہاں سکھادیں: ﴿إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ﴾ کہ ”ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔“

حضرت صوفی غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ:

ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی بڑی باتوں کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں سمجھاتے تھے۔ فرمایا: ﴿إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ﴾ میں اللہ پاک نے فرمایا کہ جس نے سر دیا اُس کے سامنے سر رکھو اور جس نے ہاتھ دیے اُس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت:

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے ابن عباس! میں تم کو ایک بات بتلاتا ہوں، تم اُس کو اچھی طرح یاد رکھنا۔“ پھر فرمایا: ”تم اللہ کو یاد رکھو، اللہ تم کو یاد رکھے گا اور جب تم اللہ کو یاد رکھو گے تو اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے اور جب مانگو تو اللہ تعالیٰ سے مانگو اور جب مدد چاہو تو اللہ سے مدد چاہو۔ اس بات کو یاد رکھ لو کہ پوری اُمت مل کر تمہیں نفع پہنچانا چاہے تو نفع نہیں پہنچا سکتی مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طے فرمادیا۔ اور پوری اُمت مل کر تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طے فرمادیا۔“[۱]

حالات کے اعتبار سے استعانت کی صورتیں:

دوسرا موضوع استعانت میں بہت ہی اہم ہے۔ مدد مانگنے کے مختلف مراحل اور مختلف صورتیں ہیں۔ انسان مختلف حالتوں میں ہوتا ہے۔ کبھی نعمتوں والے حال میں ہوتا ہے اور کبھی مصیبتوں والے حال میں ہوتا ہے۔ ہر انسان کو آزمانے کے لیے اللہ تعالیٰ دنیا میں خوشیاں بھی دیتے ہیں اور غم بھی دیتے ہیں۔ کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر ایک کی آزمائش کی صورت الگ الگ ہوتی ہے۔ ان دونوں حالتوں سے ہٹ کر کچھ

۱: باب صفۃ القیامۃ: باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا حنظلہ ساعۃ ساعۃ۔

عوارضات کے لحاظ سے احوال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آدمی کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ حاجتوں کا حال ہوتا ہے۔ مثلاً شادی کی ضرورت ہے، نوکری کی ضرورت ہے، دوا یا پیسوں کی ضرورت ہے تو یہ حاجتوں والا حال ہے۔

گناہ کی خصوصیت نقصان ہے:

ایک معصیت والا حال ہوتا ہے کہ بندہ گناہ کر بیٹھتا ہے۔ گناہ ایسے ہی نقصان دہ ہے جیسے زہر نقصان دہ ہے۔ زہر نقصان بھی پہنچا سکتا ہے اور نہیں بھی پہنچا سکتا۔ مگر گناہ میں یہ دو چیزیں نہیں ہیں، گناہ ہمیشہ نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ بعض دفعہ زہر نافع ہو جاتا ہے۔ ایک آدمی خودکشی کرنے کے لیے سنکھیا کھا گیا، ابھی یہ زہر معدے میں پہنچ کر اپنا اثر دکھانے ہی والا تھا کہ اُدھر سے ناگ کا گزر ہوا، اُس ناگ نے اس کو ڈس لیا۔ ناگ کے ڈسنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی گرمی نے سنکھیا کی ٹھنڈک کو مار دیا۔ اور وہ آدمی صحت یاب ہو گیا، تو یہاں زہر نقصان کے بجائے نفع بخش ثابت ہوا۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ گناہ بجائے نقصان کے نفع پہنچا دے۔ زہر سے زیادہ نقصان دہ گناہ ہے۔ اسی لیے بُرے عمل کے بعد آدمی کا نقصان اس کے قابو میں نہیں ہوتا۔ یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ اگر اس کی حقیقت ہم پر کھل جائے تو گناہ کرتے وقت آدمی پر لرزہ طاری ہو جائے اور گناہ کرنے کی ہمت معدوم پڑ جائے، کیونکہ اگر کسی سے گناہ ہو جائے تو پھر کسی مخلوق کے قابو میں نہیں کہ وہ اس کے نقصان سے اس کو بچا لے، اس لئے سب سے زیادہ ضرورت آدمی کو معافی کی ہوتی ہے، صرف ایک اللہ کی ذات ہے جو اس نقصان کو دور کر سکتی ہے۔ جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میرے بندے کا یقین دیکھو، بندہ یوں کہتا ہے کہ ایک ذات ہے جو میرے گناہوں کو معاف کر سکتی ہے، کوئی اُس کو معاف نہیں کر سکتا، اس لیے وہ مجھ سے معافی مانگ رہا ہے، میں اُس کو معاف کرتا ہوں۔

”فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ“[۱]

”گناہوں کو کوئی بھی معاف نہیں کر سکتا سوائے آپ کے“

نعمتوں میں استعانت کی صورت:

بہر حال بندہ کا ایک حال معافی کا ہوتا ہے، ایک حال حاجتوں کا ہوتا ہے، ایک حال مصیبتوں و پریشانیوں کا ہوتا ہے، ایک حال نعمتوں کا ہوتا ہے، ہر حالت میں استعانت الگ الگ ہوتی ہے۔ سب حالتوں میں بندہ اللہ تعالیٰ کا محتاج ہوتا ہے۔ نعمتوں میں استعانت یہ ہے کہ اس کا شکر کیا جائے، اگر آدمی شکر ادا نہیں کر رہا ہے بلکہ نعمتوں کی ناشکری کر رہا ہے تو ایک وقت یہ نعمت اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

مصیبتوں میں استعانت کی صورت:

آج دنیا میں مسلمان ہر جگہ پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہیں، ہر آدمی الگ الگ پریشانی میں مبتلا ہے، کوئی جانی، کوئی مالی، کوئی بیماری کوئی کسی قسم کی پریشانی میں گھرا ہوا ہے۔ اس مصیبت کے وقت استعانت کا طریقہ صبر ہے۔

﴿اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ ، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾[۲]

”تم مدد چاہو صبر سے، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔“

اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ سے ایک غلط استدلال:

ایک صاحب تقریر کر رہے تھے کہ اللہ کے غیر سے مدد مانگی جا سکتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں: ”اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ“ مدد مانگو صبر اور نماز سے۔ جب صبر اور نماز جاندار نہیں ہیں اور اُن سے مدد لے سکتے ہیں تو پھر جاندار سے کیوں نہیں مدد لے سکتے؟ بندۂ خدا کو یہی سمجھ میں نہیں آیا کہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد لینے کا مفہوم کیا ہے۔

۱: صحیح بخاری: باب فضل الاستغفار۔ ۲: البقرۃ: ۱۵۳۔

صبر اور صلوٰۃ سے مدد لینے کا مطلب یہ ہے کہ تم مصیبت میں صبر کرو، شکوہ و شکایات مت کرو، اور اللہ کے حکم پر جمے رہو، مصیبتوں کی وجہ سے اللہ کے در کو نہ چھوڑو۔ لیکن انہوں نے کچھ کا کچھ سمجھ لیا۔

مصیبت میں اظہارِ تکلیف ممنوع نہیں:

بہر حال مصیبت اور پریشانی میں صبر کا حکم ہے، اس سے تکلیف تو پہونچے گی؟ اس تکلیف کا اظہار ممنوع نہیں ہے، بلکہ اس تکلیف اور مصیبت میں واویلا کرنا اور شکوہ شکایات کرنا ممنوع ہے، حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے لڑکے کا وصال ہو رہا تھا، آپ ﷺ اُن کو گود میں لیے ہوئے تھے اور آپ کی آنکھ مبارک سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ روتے ہیں؟ فرمایا کہ: ”هٰذِهٖ رَحۡمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ فِيۡ قُلُوۡبِ عِبَادِهٖ“[1] یہ رقت اور رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل کے اندر رکھی ہے۔ اور اس سے وہی محروم رہتا ہے جو اللہ کے خیر سے محروم ہو جائے۔

آپ پر تکلیف اور مصیبت آئی ہوئی ہے، اس کا اظہار آپ سے ہو رہا ہے، اسی وجہ سے صحابی نے اعتراض بھی کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ یہ صبر کے خلاف نہیں ہے، یہ ممنوع نہیں ہے، یہ تو رحمت اور محبت کی وجہ سے ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ تکلیف کا اظہار ممنوع نہیں ہے، لیکن تکلیف میں جزع و فزع، شکوہ شکایات ممنوع ہے۔ بہر حال مصیبت میں صبر کا مطلب ہے اللہ کے حکم پر جمے رہنا۔ مصیبت آئی نماز چھوڑ دی، مصیبت آئی، اُس کو دور کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی فکر کیے بغیر کام بنالیا تو یہ صبر نہیں ہے، ایسے وقت میں جمنے کا اور اپنے آپ کو غلط راستہ پر ڈالنے سے بچانے کا نام صبر ہے۔

---

[1] صحیح البخاری: الجنائز/ باب قول النبی ﷺ: یعذب المیت ببکاء اہلہ۔

صبر کی اقسام:

صبر کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ ایک صبر ہوتا ہے صبر علی المصیبۃ، یعنی پریشان کن حالتوں اور آسمانی آفتوں پر صبر کرنا، اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنا اور اُس پر جمے رہنا، اس میں شکوہ و شکایت نہ کرنا۔ دوسرا ہے: صبر عن المعصیۃ۔ یعنی گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا، تیسرا ہے: صبر علی الطاعۃ، یعنی نیکی پر اپنے آپ کو مسلسل جمائے رکھنا۔ نماز نہ پڑھنے کا جی چاہ رہا ہے، لیکن دل پر جبر کر کے نماز پڑھنا صبر علی الطاعۃ ہے۔ روزہ نہ رکھنے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن ہمت کر کے روزہ رکھنا صبر علی الطاعۃ ہے۔

حاجتوں میں استعانت کی صورت:

حاجتوں میں استعانت کی صورت یہ ہے کہ صرف اللہ ہی کی ذات سے مانگا جائے، کسی اور کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا جائے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہارے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو تم اللہ تعالیٰ سے مانگو، اگر تمہارے پاس نمک نہ رہے اور تمہیں اُس کی ضرورت پڑ جائے تو تم اللہ تعالیٰ ہی سے مانگو۔[1]

اسی وجہ سے آپ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

''اِذَا سَئَلۡتَ فَسۡئَلِ اللّٰهَ وَاِذَا اسۡتَعَنۡتَ فَاسۡتَعِنۡ بِاللّٰهِ''

جب مانگو تو اللہ سے مانگو اور مدد چاہو تو اللہ سے مدد چاہو۔

اس مانگنے میں اللہ سے تعلق بڑھتا ہے، اللہ پاک کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ جو بندہ جتنا زیادہ مانگتا ہے اتنا ہی قرب حاصل ہوتا ہے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوتا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ:

ایک مرتبہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ سے وقت کا بادشاہ خفا ہو گیا۔ اُن کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے۔ بادشاہ کے دربار میں اُن کا معتقد بیٹھا ہوا تھا

---

[1]: سنن ترمذی: باب من ابواب الدعوات۔

جب اُس نے یہ فیصلہ سنا تو فوراً بھاگا ہوا استاذ کے پاس آیا اور کہا کہ بادشاہ آپ کو اس شہر سے نکالنا چاہتا ہے۔ انہوں نے حیرت سے کہا کہ بادشاہ مجھے نکالنا چاہتا ہے، وہ مجھے نکالے گا یا میں اُسے نکالوں گا؟ اپنے شاگرد سے کہا کہ ہمارا ہتھیار لاؤ، ایک لوٹے میں پانی لاؤ اور مصلیٰ بچھاؤ۔ وہ عقیدت مند فوراً بادشاہ کے پاس گیا اور کہا کہ بادشاہ سلامت جلدی سے استاذ کے پاس پہنچ کر معافی مانگئے ورنہ آپ کا بوریا بستر یہاں سے لپیٹ دیا جائے گا۔ ان بزرگ کا اللہ پاک سے ایسا تعلق تھا کہ ادھر ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے اور ادھر بادشاہ کا تخلیہ ہو جاتا۔ بس بندہ کے اللہ سے تعلق کی بات ہوتی ہے۔ جس کا جیسا تعلق ہوتا ہے اس کے کام بھی اتنے ہی آسان ہو جاتے ہیں اور اللہ کے ہاں وہ اتنا ہی مقبول ہوتا ہے، اور ہر بندہ اللہ سے تعلق بنانے میں آزاد ہے، جتنا چاہے اپنا تعلق بڑھا سکتا ہے، دنیا کے بادشاہوں سے آپ ملنا چاہیں تو ملنا مشکل ہے، اگر ہم ان سے ملاقات کر بھی لیں تو اپنی ضروریات پیش نہیں کر سکتے، اگر پیش بھی کر دیں تو وہ ضروریات مکمل نہیں ہوتیں، یہاں خالقِ کائنات، عرشِ اعظم کا ربّ، آسمان و زمین کا خالق و مالک، ہم سب کا پالنے والا کہتا ہے کہ ہمارے سامنے آؤ! اور آدابِ شاہی بجالاؤ، ہمارے سامنے اپنی ضرورتیں بیان کرو، ہم پورا کریں گے، تمہارا کام بن جائیگا، لیکن ہم اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔

قبولیتِ دعا کی صورتیں:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اتنی دعا مانگی لیکن ہماری دعا قبول نہیں ہوئی، ہمارا کام نہیں بنا، ہماری ضرورتیں پوری نہیں ہوئیں، تو یاد رکھنا چاہئے کہ قبولیتِ دعا کا مطلب صرف ضرورت کا پورا ہونا نہیں ہے، بلکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبولیت دعا کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) کبھی تو اللہ پاک اس کی ضرورت کی تکمیل کر دیتے ہیں۔

(۲) کبھی اس کے علاوہ دوسری چیز عطا فرمادیتے ہیں۔

(۳) کبھی اس پر آنے والی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دور کر دیتے ہیں۔

(۴) کبھی اس دعا کو اللہ پاک آخرت کے لئے اٹھا کر رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس دعا کو قبول کرنے میں بندہ کے لئے مصلحت نہیں ہوتی، اور اللہ پاک ہماری مصلحتوں کو زیادہ جاننے والے ہیں۔

جیسے دو برس کا بچہ اگر آپ سے چاقو مانگے تو کیا آپ اُسے چاقو دے دیں گے؟ اس بچے کو نہیں معلوم کہ یہ چاقو میرے لیے نقصان دہ ہے۔ آپ نے اس بچے کو چاقو دینے کے بجائے ایک چاکلیٹ دے دیا، لیکن بچہ اس کو مانتا نہیں، تو کیا اس کے رونے اور گڑگڑانے کی وجہ سے آپ اس کو چاقو دے دیں گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں دیں گے، کیونکہ دینے میں مصلحت نہیں ہے۔ یہی حال ہم لوگوں کا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں کہ یا اللہ! بیٹا دے دے، بیٹی نہ دے۔ لیکن یہ آدمی اس سے ناواقف ہوتا ہے کہ جب یہی بیٹا بڑا ہوگا تو اس کی گردن پر چھری پھیرے گا۔ اس کو بیٹا دینا مصلحت نہیں ہوتی، اس لئے اللہ پاک نہیں دیتے۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ سے بیٹی مانگنے کی ضد کر رہا ہے لیکن اسے کیا معلوم کہ اگر اس کو بیٹی مل جائے تو بڑی ہو کر اس کی عزت تار تار کر دے گی، اس کی عزت کی حفاظت اسی میں ہے کہ اس کو بیٹی نہ دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ کون سی دعا قبول کرنی ہے اور کون سی قبول نہیں کرنی ہے، کونسی دعا قبول کرنے میں مصلحت ہے؟ اور کس میں مصلحت نہیں ہے، اس لئے کبھی اللہ پاک کسی بڑی مصیبت کو ہٹا دیتے ہیں، اور کبھی اس دعا کے بدلہ کوئی دوسری چیز عطا فرماتے ہیں۔ اور کبھی وہی چیز عطا فرماتے ہیں۔ اور کبھی اس کو کچھ بھی نہیں دیتے، کیونکہ یہ آخرت کا زیادہ ضرورتمند ہوتا ہے، اس لئے اس کی کچھ دعائیں آخرت کے لیے اٹھا کر رکھ لیتے ہیں۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ جب بندہ آخرت میں کچھ ثواب دیکھے گا تو حق تعالیٰ سے عرض کرے گا کہ اے پروردگار! یہ سب کچھ تو میں نے دنیا میں نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تو نے فلاں وقت دعا مانگی تھی، میں نے وہ دعا قبول نہیں کی بلکہ وہ دعا یہاں آخرت کے لئے رکھ لی تھی، کیونکہ تیرا آخرت کا ذخیرہ کم تھا۔ وہ بندہ کہے گا کہ اے پروردگار! اگر آپ دنیا میں میری کوئی بھی دعا قبول نہ فرماتے تو اچھا ہوتا۔[1] یہاں کسی کو یہ حوصلہ نہیں ہے کہ وہ اس طرح کہے۔

غرض یہ ہے کہ حاجتیں بھی اللہ ہی سے مانگنی چاہئے، اگر حاجت پوری ہو جائے تو خوش ہو جائیں اور اگر پوری نہ ہو تب بھی خوش رہیں، شکوہ نہ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہماری مصلحتوں کو زیادہ جاننے والے ہیں، اگر مصلحت ہوگی تو عطا کر دیں گے اور اگر مصلحت نہیں ہوگی تو نہیں دیں گے، لیکن اس کے بجائے ہمارے لئے دوسری چیز کا انتظام فرما دیں گے جو ہمارے لئے فائدہ سے خالی نہیں ہوگی۔

معاصی میں استعانت کی صورت:

(۱) استعانت کی ایک صورت یہ ہے کہ معاصی میں استعانت لی جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب بندہ سے گناہ سرزد ہو جائے تو اولاً اس کو ترک کر دے۔ (۲) حقوق اللہ ہو یا حقوق العباد اس کی ادائیگی میں لگ جائے۔ (۳) آئندہ نہ کرنے عزم کرے۔ (۴) اپنے گناہ پر ندامت کا اظہار کرے۔ (۵) استغفار کرے کہ اے اللہ! مجھے اپنے گناہ کا اقرار ہے، میں بہت شرمندہ ہوں، میں نے آپ کے حقوق کی بے احترامی کی، مجھے معاف فرما دیجیے۔

گناہوں کی کثرت کی وجہ سے یا بار بار گناہ کا صدور ہو جانے کہ وجہ سے معافی مانگنے میں پیچھے نہ ہٹے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، سو مرتبہ بندے سے غلطی ہو جائے تو سو مرتبہ

---

[1] مستدرک حاکم: کتاب الدعاء، والتکبیر والتہلیل والتسبیح والذکر، ۱۸۱۹۔

معافی مانگے، اللہ تعالیٰ کا دربار بڑا کریم دربار ہے، چاہے کتنا بڑا گنہگار کیوں نہ ہو وہاں معافی مانگنے پر اس کی مغفرت ہو جائیگی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ بندہ معافی کا طلب گار ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو۔

صد بار توبہ شکستی باز آ

اگر سو دفعہ بھی تجھ سے توبہ ٹوٹ جائے تو پھر بھی توبہ کر اور اللہ ست معافی مانگ۔

ایں در گاہِ ما در گاہِ نااُمیدی نیست

یہ ہماری بار گاہ، نااُمیدی کی بار گاہ نہیں ہے۔

کیا مطلقاً یأس کفر ہے؟:

﴿لَا یَیۡاَسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡكٰفِرُوۡنَ﴾ [1]

”اللہ کی رحمت سے مایوس تو کافر ہوا کرتے ہیں۔“

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ یأس کفر ہے جس میں اللہ کی رحمت کا انکار ہو، گناہوں کو بڑا سمجھا جائے اور اللہ پاک کے عفو و کرم کو ناممکن سمجھا جائے۔ [2]

اس لئے اگر معصیت ہو جائے تو استغفار کریں، اگر مصیبت آجائے تو صبر اور دعا کریں، اور اُس سے عافیت مانگیں، اور نعمت میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہیں۔ اور ضرورتوں میں اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگتے رہیں۔ یہی استعانت کا خلاصہ ہے۔

سورۂ فاتحہ میں اللہ پاک کے استحضار کی بھی تعلیم ہے:

سورۂ فاتحہ میں حق تعالیٰ شانہ نے دو چار جملے ایسے جامع سکھا دیئے ہیں کہ بس آدمی پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے، اور شرک سے برأت ظاہر کر دے اور

---

[1]: یوسف:۸۷۔ [2]: روح المعانی:۸/۴۳۔

اللہ ہی کو حقیقی معبود سمجھے اور اسی کی عبادت کرے۔ اور اس طریقہ پر عبادت کرے کہ اللہ پاک کے اپنے سامنے ہونے کا استحضار کرے، کیونکہ بندہ جب ''ایاک'' کہتا ہے تو اس میں اللہ پاک کو مخاطب کرتا ہے کہ یا اللہ! میں آپ ہی کی عبادت کررہا ہوں، اور خطاب کا صیغہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب پکارنے والا جس کو پکارتا ہے اس کو اپنے سامنے سمجھے، گویا اس میں اللہ پاک نے لطیف انداز میں فرمایا کہ اس کے پڑھتے وقت میرا استحضار رکھو اور عبادت میں صرف میرا ہی استحضار رکھو، کسی اور کا نہیں اور مجھے اپنے سامنے سمجھو، حضور ﷺ نے فرمایا:

''إِنَّ اللهَ قِبَلَ وَجۡهِ أَحَدِكُمۡ إِذَا صَلّٰى، فَلَا يَبۡزُقۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ''[۱]

بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے سامنے ہوتے ہیں اس لئے جب کوئی آدمی نماز ادا کرتا ہے تو وہ اپنے سامنے نہ تھوکے۔

حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''إِذَا صَلَّيۡتَ فَإِنَّكَ تُنَاجِيۡ رَبَّكَ وَرَبُّكَ أَمَامَكَ، فَلَا تَبۡزُقَنَّ أَمَامَكَ، وَلَا عَنۡ يَمِيۡنِكَ''[۲]

جب تم میں نماز پڑھتے ہو تو تم اپنے رب سے سرگوشی کرتے ہو اور تمہارا رب تمہارے سامنے ہوتا ہے لہذا تم تمہارے سامنے تھوکو اور نہ دائیں جانب تھوکو۔

نمازی کے سامنے سے گزرنے پر وعید:

کئی احادیث اس سلسلہ میں آئی ہیں، اور نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گزرنے پر جو وعید ہے وہ اسی لیے ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان میں آجانا انتہائی غضب کی بات ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو کہ نماز پڑھنے والے کے سامنے سے

۱: سنن ابی داود: الصلاۃ/ باب فی کراہیۃ البزاق فی المسجد۔ ۲: تعظیم قدر الصلاۃ لمحمد بن نصر المروزی: التحذیر من السھو والالتفات فیھا/ ۹۰۔

گزرنے پر کیا عذاب ہے تو آدمی چالیس دن، یا مہینے، یا سال کھڑا رہے لیکن سامنے سے گزرنے کی ہمت نہ کرے۔[۱] اللہ تعالیٰ کو یہ سخت ناگوار ہوتا ہے کہ بندہ میری جانب متوجہ ہے اور کوئی دوسرا انیچ میں آجائے، کیونکہ اس موقع پر اللہ پاک بندہ کے سامنے ہوتے ہیں۔

مرور ممنوع ہے تنحی ممنوع نہیں:

لیکن ایک مسئلہ یہاں ذہن میں رکھیں کہ نمازی کے سامنے سے گزرنا تو ناجائز ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ گزریں نہیں بلکہ صرف اپنی جگہ سے ہٹیں اور چلے جائیں، اس میں گزرنا نہ پایا جائے تو یہ ممنوع نہیں ہے اس کو تنحی کہتے ہیں، تاہم اس سے احتیاط کرنا بہتر ہے تاکہ دوسروں کو بدگمانی کا اندیشہ نہ ہو اور جاہلوں کے لئے مرور کی راہ نہ کھلے۔

استحضار کی کیفیت کیسے پیدا کریں؟

بہر حال اللہ پاک کے استحضار کی بات چل رہی تھی تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیفیت کیسے پیدا کی جائے؟ اس کو سمجھانے کے لئے ہمارے والد صاحب اس مضمون کو اس طرح سمجھاتے تھے کہ تم یہ سوچو کہ میں اللہ پاک کو دیکھ رہا ہوں اور اللہ پاک کی طرف متوجہ ہوں، اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں اللہ پاک کو تو دیکھوں اور اللہ پاک مجھے نہ دیکھیں اور میری طرف متوجہ نہ ہوں، پوری مخلوق کے بارے میں انسان سوچے کہ جتنے انسان، جنات، ارواح، فرشتے اور سمندر ہیں وہ سب کے سب اللہ کی طرف متوجہ ہیں، اس کی عبادت میں مگن ہیں، اس کی تسبیح اور تحمید میں مشغول ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرماتے تھے کہ تم تو یہاں ہو لیکن اللہ تعالیٰ نہ ہوں، تم تو سنیں اور اللہ تعالیٰ نہ سنیں، تم تو جانیں لیکن اللہ تعالیٰ نہ جانیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لیے جب بندہ یہ سوچے گا تو اُس کا ذہن حاضر ہوجائے گا، لیکن

---

[۱]: صحیح البخاری: الصلاۃ / باب اثم المار بین یدی المصلی۔

اس کے لئے بھی کوشش، محنت، مشق اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، بغیر مجاہدہ کے اس کا حاصل ہونا مشکل ہے۔

شروع میں یہ بات آپ لوگوں کو بتائی گئی کہ بعض دفعہ آدمی اتنی محنت اور مجاہدہ کرتا ہے اور اللہ پاک کے استحضار کی اتنی مشق کرتا ہے کہ وہ اللہ پاک سے بات کرنے لگتا ہے، اللہ پاک کی طرف سے اسے جواب ملتا ہے، لیکن اس کے لئے کافی محنت اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔

نماز ایمان والوں کی معراج ہے:

اسی لیے ایک روایت میں آیا ہے:

"اَلصَّلٰوةُ مِعۡرَاجُ الۡمُؤۡمِنِ" [1]

"نماز ایمان والوں کی معراج ہے۔" بندے کو اللہ تعالیٰ کے پاس پہونچا دیتی ہے۔ اللہ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے:

حضور ﷺ فرماتے ہیں: "قُرَّةُ عَيۡنِيۡ فِي الصَّلٰوةِ" [2]

"میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔" یعنی آپ کو نماز میں راحت ملتی تھی، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوگئے، محبوب کے ساتھ وصال ہو گیا، حق تعالیٰ سے تعلق قائم ہو گیا، اُس سے اتنی راحت اور قوت مل گئی کہ ساری تھکان دور ہو گئی، دل کو چین و سکون حاصل ہو گیا۔

---

[1]: تفسیرِ مظہری: سورۂ نور: ۱/ ۴۶۸۶ و تفسیر رازی: سورۃ فاتحہ: ۱/ ۱۶۱۔ (اس حدیث کی صحت کے بارے میں محدثین نے کلام کیا ہے اور اس کو موضوع قرار دیا ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے یہ صحیح ہے۔) [2]: سنن نسائی: عشرۃ النساء/ باب حب النساء۔

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تمنا:

لکھا ہے کہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک ساتھی سے فرمایا کہ نماز جنت میں ہوگی یا نہیں؟ لوگوں نے کہا کہ جنت میں نماز کہاں ہوگی؟ جنت تو دارالجزا ہے دارالعمل نہیں ہے۔ انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور فرمایا کہ ہائے! وہ جنت کیسی جنت ہوگی جس میں نماز ہی نہیں ہوگی۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ ان کی نماز کی کیا کیفیت تھی؟ ان کو نماز میں کتنا مزہ آتا تھا؟ یہ کیفیت یہی مزہ یہی قرب یہی استحضار ہمیں بھی پیدا کرنا ہے۔ اللہ پاک ہمارے اندر بھی یہ کیفیت پیدا کر دے، اپنا قرب عطا فرمائے، اور اپنا خاص تعلق نصیب فرمائے۔ (آمین)

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی تشریح:

"ہم کو سیدھے راستے پر چلا"

ابتدائی تین آیات میں ان مضامین کا ذکر فرمایا جو صرف اللہ پاک سے متعلق ہیں، پھر اس کے بعد ان مضامین کو ذکر فرمایا جو بندہ اور اللہ پاک دونوں سے متعلق ہیں، اب اس آیت میں ان مضامین کو ذکر فرما رہے ہیں جن کا صرف بندوں سے تعلق ہے۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

صراط مستقیم کے معنی سنئے، امام ابو جعفر ابن جریر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد واضح اور صاف راستہ ہے، جو کہیں سے ٹیڑھا نہ ہو۔[۱] سلف اور متاخرین مفسرین سے اس کی بہت سی تفسیریں منقول ہیں اور ان سب کا خلاصہ ایک ہی ہے اور وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور تابعداری ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ صراط مستقیم کتاب اللہ ہے۔[۲] ابن عباس کا قول ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آیت (اهدنا الصراط مستقیم) کہئے یعنی ہمیں

---

[۱]: تفسیرِ طبری: ۱/۱۷۰۔ [۲]: معجم کبیر للطبرانی: ۹: ۹۰۳۱، ۲۱۲/۹۔

ہدایت والے راستہ کا الہام کر اور اس دین قیم کی سمجھ دے جس میں کوئی کجی نہیں۔[۱] ابن عباس، ابن مسعود اور بہت سے صحابہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔[۲]

ابن حنفیہ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جس کے سوا اور دین مقبول نہیں۔[۳]

مسند احمد کی ایک حدیث میں بھی مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی کہ صراط مستقیم کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں، ان میں کئی ایک کھلے ہوئے دروازے اور دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں، صراط مستقیم کے دروازے پر ایک پکارنے والا مقرر ہے، جو کہتا ہے کہ اے لوگو! تم سب کے سب اسی سیدھی راہ پر چلے جاؤ، ٹیڑھی ترچھی ادھر ادھر کی راہوں کو نہ دیکھو نہ ان پر جاؤ۔ اور اس راستے سے گزرنے والا کوئی شخص جب ان دروازوں میں سے کسی ایک کو کھولنا چاہتا ہے تو ایک پکارنے والا کہتا ہے خبردار اسے نہ کھولنا۔ اگر کھولا تو اس راہ لگ جاؤ گے اور صراط مستقیم سے ہٹ جاؤ گے۔ پس صراط مستقیم تو اسلام ہے اور دیواریں اللہ کی حدیں ہیں اور کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور دروازے پر پکارنے والا قرآن کریم ہے اور راستے کے اوپر سے پکارنے والا زندہ ضمیر ہے جو ہر ایماندار کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور واعظ کے ہوتا ہے۔[۴]

مجاہد فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد حق ہے۔[۵] حضرت عبد اللہ فرماتے ہیں: صراط مستقیم وہ ہے جس پر ہمیں رسول اللہ ﷺ نے چھوڑا۔[۶] امام ابو جعفر بن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ ہے کہ میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر میں سب سے اولیٰ یہ ہے کہ

۱: تفسیرِ طبری: ۱/۱۷۵۔ ۲: حوالۂ سابق۔ ۳: حوالۂ سابق۔ ۴: مسند احمد: ۴، ۱۷۶۸۴/۱۸۲۔
۵: تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۹۔ ۶: حوالۂ سابق۔

ہم کو توفیق دی جائے اس کی جو اللہ کی مرضی کی ہو اور جس پر چلنے کی وجہ سے اللہ اپنے بندوں سے راضی ہوا ہو اور ان پر انعام کیا ہو، صراط مستقیم یہی ہے۔ اس لئے کہ جس شخص کو اس کی توفیق مل جائے جس کی توفیق اللہ کے نیک بندوں کو تھی جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا تھا جو نبی، صدیق، شہید اور صالح لوگ تھے تو اس کو توفیق دے دی گئی اسلام کی اور رسولوں کی تصدیق کی، کتاب اللہ کو مضبوط تھامے رکھنے کی، اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانے کی، اس کے منع کئے ہوئے کاموں سے رکنے کی اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے چاروں خلفاء اور تمام نیک بندوں راستہ کی اتباع کی۔ اور یہ سب کا سب ہی صراط مستقیم ہے۔[۱]

سوال کا طریقہ:

اس آیتِ مبارکہ میں حق تعالیٰ شانہ نے مانگنے کا حکم دیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ مانگنے کا طریقہ بھی بتادیا، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اولاً اس ذات کی تعریف کی جائے جس ذات سے مانگا جارہا ہے، اس کی بڑائی بیان کی جائے، اس کی خوبیاں کی جائیں، پھر اُس کے بعد اپنی حاجت اور ضرورت اُس کے سامنے رکھی جائے۔ جب کسی بڑے آدمی کے سامنے آپ نے اپنے مطالبات رکھے، اور اس میں اس کی تعریف اور خوبیاں آپ نے بیان نہیں کیں، تو آپ کی درخواست کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی، اور آپ کے مطالبات کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، اگر مطالبات رکھنے سے پہلے اس کی خوبیاں اور صفات بیان کی جائیں اور اس کی عزت کی جائے کہ آپ ایسے ہیں، آپ بڑے رحم دل ہیں، آپ کے اخلاق ایسے ہیں، تو وہ آپ سے متاثر ہوگا۔ اور آپ کی درخواست پر ہمدردانہ غور کرے گا۔ حق تعالیٰ شانہ نے سورۂ فاتحہ میں اسی نہج کو بیان فرمایا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی گئی، اس کے بعد اس کی صفتِ رحمٰن اور رحیم کا ذکر کیا گیا، پھر ”مالك يوم

---

[۱]: تفسیرِ طبری: ۱/۱۷۱۔

الدین‘‘میں اس کی بڑائی بیان کی گئ،اس کے بعد’’ایاك نعبد‘‘ میں اپنی طرف سے وفاداری کا اظہار بھی کر دیا گیا اور’’ایاک نستعین‘‘میں مدد کا مطالبہ کیا گیا، پھر سوال پیدا ہوا کہ مدد کس چیز میں چاہیئے تو’’اھدنا الصراط لمستقیم‘‘میں اس کا تذکرہ کیا گیا کہ مجھے مدد سیدھے راستے پر چلنے میں چاہیئے۔

’’اھدنا الصراط المستقیم‘‘سے متعلق چند نکات

پہلا نکتہ:

’’نستعین‘‘اور’’اھدنا‘‘میں اللہ پاک نے جمع کے صیغے استعمال فرمائے ہیں،واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا،اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر واحد کا صیغہ استعمال فرماتے تو مطلب یہ نکلتا کہ میں مدد چاہتا ہوں،مجھے سیدھے راستہ پر چلا دیجئے،لیکن اللہ پاک نے جمع کا صیغہ استعمال کرکے بتا دیا کہ تم صرف اپنے لئے مدد مت چاہو بلکہ سب کے لئے مدد چاہو،سب کے لئے صحیح راستہ پر چلنے کی دعا مانگو،سب کے لئے خیر خواہی چاہو، صرف اپنی فکر مت کرو۔

مخلوق پر ہمدردی، اسلام کی خاص صفت ہے،اُس میں نفسا نفسی نہیں سکھائی گئ، بلکہ اُس میں یہ سکھایا گیا کہ تم دوسروں پر بھی رحم کرنے والے بنو،دوسری جگہوں پر صرف آدمی کی اپنی ذاتی غرض مقصود ہوتی ہے۔ اسلام میں یہ ہے کہ اپنی ذاتی اغراض کو قربان کرکے دوسرے کے کام آؤ، دوسرے کی بھلائی چاہو۔صرف میں ہی سیدھے راستہ پر چلوں اور کامیاب ہو جاؤں، یہ مسلمان کی شان نہیں ہے۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ خود بھی جنت میں جائے اور ہزاروں اور لاکھوں کو بھی جنت میں لے کر جائے۔ کیونکہ خود غرضی جانوروں کی صفت ہوتی ہے، جس آدمی میں ہمدردی نہ ہو،جو صرف اپنی غرض کو مد نظر رکھتا ہو تو وہ اسلامی صفات سے خالی ہے۔اسلامی صفت یہ ہے:

”اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ“[1]

”تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔“

”کرو مہربانی تم اہل زمیں پر خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر“

اس لیے دعا کے اسلوب میں اس کو بیان کیا گیا کہ تم دعا میں اپنے ساتھ سب کو شامل کرو: ﴿اھدنا﴾ ”ہم سب کو ہدایت دے دیجیے۔“

دوسرا نکتہ:

دوسری بات یہ ہے کہ جب درخواست اور مدد سب کی طرف سے ہو تو اس میں قبولیت کی زیادہ امید ہوتی ہے، کیونکہ ہر آدمی اس قابل نہیں ہوتا ہے کہ اس کی درخواست قبول کی جائے، لیکن جب سب مانگتے ہیں تو کچھ اللہ پاک کے مقرب اور مقبول بندے بھی ہوتے ہیں جن کے طفیل دعا قبول ہوتی ہے، اگر آدمی اس طرح کہے کہ یااللہ! میرا یہ کام بنا دیجیے تو اس کی کیا حیثیت ہے کہ وہ سوال کرے۔ ہو سکتا ہے اس کے گناہ کی وجہ سے اللہ پاک اس سے ناراض ہوں، اس وجہ سے دعا اور درخواست سب کی طرف سے ہونا چاہئے، نیک بندوں کے طفیل قبولیتِ دعا کی زیادہ امید ہوتی ہے اس لئے ”اھدنا“ صیغۂ جمع کے ساتھ لایا گیا۔

تیسرا نکتہ:

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر ایک کو ہدایت مل جائے، اور سب محروم ہو جائیں تو اس ہدایت یافتہ کو بھی دین پر چلنا مشکل ہو جائے گا، یہ ہمارا مشاہدہ ہے۔ ایک آدمی وہ ہے جسے راستہ تو مل گیا، لیکن ماحول نہیں ہے، سب کے سب بے راہ رو ہیں تو وہاں پر اس کے لئے صحیح راہ پر چلنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ جب تک ایک ہی ماحول پیدا نہیں ہوتا، ایک

---

[1] سنن ترمذی: البر والصلۃ/ باب ماجاء فی رحمۃ المسلمین۔

ہی سوسائٹی (Society) نہیں بن جاتی اس وقت تک عمل بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں اس بات کی طرف بھی گویا اشارہ ہے کہ اے اللہ! ہم سب کو سیدھے راستے پر چلا دیجیے کیونکہ سب کا سیدھے راستہ پر چلنا سب کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی اکیلا سیدھے راستے پر چل رہا ہو تو اُس کے لیے بہت مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اُس کے لیے بہت ہمت درکار ہوتی ہے۔

ہوا ہے تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ایک خاص معاملہ ہوتا ہے جہاں اللہ پاک کسی کو بلند ہمت اور حوصلہ دے دیتے ہیں، لیکن عام طور پر لوگوں میں اتنی بلند ہمتی نہیں پائی جاتی۔ اگر سب کو ہدایت نہ ملے تو اس ماحول میں خود آدمی کو دین پر عمل کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، آج ہم معاشرے میں جس دشواری سے گزر رہے ہیں ان میں سے ایک دُشواری یہی ہے کہ ہدایت کا ماحول عام نہیں ہے۔

میں "اھدنا" پر عرض کر رہا تھا کہ اس میں اللہ پاک نے سیدھے راستہ پر چلانے کی دعا مانگنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ سب سے بڑی چیز سیدھا راستہ ہے۔ اگر اس سے بڑی کوئی اور چیز ہوتی تو حق تعالیٰ شانہ، سورہ فاتحہ میں اُس کو مانگنے کا حکم دیتے۔ اگر آپ دن میں ایک ہزار رکعات پڑھیں تو ایک ہزار مرتبہ یہی سورت پڑھنا ہے، اور سب کو پڑھنا ہے چاہے صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں، یا صدیقین ہوں، یا شہداء ہوں، یا اولیاء اللہ ہوں، یا انبیاء ہوں۔

جب مومنین ہدایت یافتہ ہیں تو پھر ہدایت کا سوال کیوں؟:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایمان والا ہدایت پر ہوتا ہے تو پھر ہدایت کا سوال کیوں؟ ایمان والا تو دور کی بات ہے، انبیاء سے زیادہ راہِ حق پر کون ہو سکتا

ہے؟ جب ان کو بھی اسی کی تعلیم ہے تو کیوں؟ انہیں ہدایت مانگنے کے لئے کیوں کہا گیا؟ جیسے آپ لوگوں نے دیکھا ہو گا کہ بعض لوگ دین کے مذاکرے کے لیے کسی مسلمان کے پاس جاتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ بھائی! ہم تو مسلمان ہیں، آپ لوگ کسی غیر مسلم کے پاس جاتے تو اچھا ہوتا۔ یہ سوال یہاں پر بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ہدایت یافتہ ہیں تو انہیں ہدایت مانگنے کا حکم کیوں ہے؟

ہدایت کی اقسام:

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ہدایت کی کئی قسمیں ہیں، قرآن کریم میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

ہدایتِ عامہ:

چنانچہ "ہدایت" کے ایک معنیٰ تو عام ہیں، یعنی جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے پیدا کیا ہے اُس کو اُس کام میں لگا دیا جائے، اور اس کی ضروریات کی اسے رہنمائی کی جائے، جس میں وہ مشغول ہو جائیں۔

﴿الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی، وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی﴾[1]

"جس نے پیدا کیا اور درست پیدا کیا اور تقدیر بنائی اور راستہ بتلا دیا۔" یہ ہدایت کی ایک قسم ہے، جس میں مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے بنایا ہے اس کی فہم دیدی اور اُس کو اس کام پر لگا دیا۔ آسمان، سورج، چاند، ستارے، پانی اور ہوا وغیرہ کو جس کام کے لیے بنایا ہے، ان کو اس کی ہدایت فرمادی۔ چھوٹے بچے کو ہدایت ہے کہ وہ اپنی ماں سے دودھ کیسے پیئے؟ اور اپنی بھوک کا اظہار کیسے کرے، حالانکہ اُسے خود نہیں معلوم کہ اس معاملے میں میں ہدایت پر ہوں لیکن اس کو اس معاملے میں ہدایت حاصل ہوتی

---

[1] الاعلیٰ: ۲-۳۔

ہے۔ ورنہ اُسے کیا معلوم کہ جب بھوک لگے تو رونا چاہیے، لیکن وہ روتا ہے اور اس کے رونے سے پتہ چلتا ہے کہ اسے بھوک لگی ہے۔ بکری کے سامنے آپ گوشت رکھ دیں وہ اُس کو منہ نہیں لگائے گی، وہ تو گھاس کھائے گی۔ اور شیر کے سامنے گھاس رکھ دیں تو وہ اُس کو منہ نہیں لگائے گا۔ شیر کو ہدایت ہے کہ تیری غذا کیا ہے؟ اور تیرا جزوِ بدن کس چیز سے بنتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعضاء سے نوازا ہے جب اُس کی زبان سے کوئی لفظ نکلتا ہے تو اُس کی آنکھ اور ناک سب سے زیادہ قریب ہیں، لیکن یہ دونوں اعضاء سننے کی ہدایت پر نہیں ہیں۔ کان کا کام ہے کہ وہ سنے، آنکھ کا کام ہے کہ وہ دیکھے، ناک کا کام ہے کہ سونگھے، ہر مخلوق کو ایک ہدایت اللہ تبارک وتعالیٰ نے دی ہے۔ چیونٹی سے لے کر جبرئیل تک اور فرش سے لے کر عرش تک، شرقاً غرباً شمالاً جنوباً، براً و بحراً، آسمان و زمین میں اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کو جس کام کے لیے بنایا ہے اُس کو اُس کا کام بتا دیا ہے اور وہ اُسے کرتے ہیں۔

یہ ہدایت عام ہے، دینی اعتبار سے بھی، دنیوی اعتبار سے بھی، افراد کے اعتبار سے بھی۔

ہدایتِ خاصہ:

دوسری ہدایت "ہدایتِ خاصہ" ہوتی ہے۔ یہ ہدایت زمین پر موجود عقل والوں کے لیے ہوتی ہے۔ اس میں خیر اور شر دونوں راستے ہوتے ہیں، اور اس میں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ خیر کا راستہ ہے اور یہ شر کا راستہ ہے۔ انسان اور جنات اس ہدایت کے مکلف ہیں، انھیں یہ اختیار ہے کہ جس راستہ پر چاہیں چلیں، اس ہدایت کا نام اراءۃ الطریق ہے، یعنی راستہ بتلانا اور اس کی رہنمائی کرنا، چونکہ اس میں محض راستہ کی رہنمائی ہوتی ہے اس لئے اس کو اراءۃ الطریق کہتے ہیں۔ اس کی مثال جیسے قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَهَدَيۡنَٰهُ ٱلنَّجۡدَيۡنِ﴾[1] "اور ہم نے اس کو خیر اور شر کے دو نور بھی دکھا دیئے"

---

[1] البلد: ۱۰۔

﴿وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ [1]

اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ قومِ ثمود کو ہم نے ہدایت دی تھی (یعنی سیدھے راستے کی رہنمائی کی تھی)۔ انہوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی۔

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور خود سرکارِ دوعالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں فرمایا گیا کہ آپ کو ہادی بنایا گیا ہے اور آپ سیدھے راستہ کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں:

﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِىٓ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ [2]

''آپ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔''

﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ [3]

''(اور) ہم نے اسے راستہ بھی دکھایا (اب) خواہ وہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا''

وہ جس راستے پر چلے گا اس اعتبار سے انجام دیکھے گا، جنت کے راستے پر چلے گا تو اُس راستے پر جنت آئے گی اور جہنم کے راستے پر چلے گا اس راستے پر جہنم آئے گی، ان تمام آیات میں ہدایت کی یہی قسم مراد ہے۔

ہدایتِ اخص الخاص:

ہدایت کی تیسری قسم ''ہدایت اخص الخاص'' ہے۔ یعنی مآلاً جو کام نفع بخش ہے اُس کی توفیق دینا، توفیق کا مطلب اُس کام کے اسباب مہیا کرنا، موانع کو دور کردینا، موانع اور مخالف چیزوں میں ایسی کیفیت پیدا کرنا کہ آدمی اُس کی مخالفت نہ کرسکے۔ یہ ہدایت ''اخص الخاص'' ہے۔ اس کے بعد بندہ اپنے انجام کے اعتبار سے جو کام نفع بخش ہو اسی کو اختیار کرتا ہے اور اللہ پاک اسے مطلوب تک پہونچا دیتے ہیں، ہدایت کی اس قسم کا نام ایصال الی المطلوب ہے۔ کیونکہ اس میں بندہ کو اللہ پاک مطلوب تک پہونچا دیتے ہیں۔

۱: فصلت: ۱۷۔ ۲: شوریٰ: ۵۲۔ ۳: الانسان: ۳۔

ہدایت کی اس قسم کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ ۱؎

''آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے (مطلوب تک نہیں پہونچا سکتے) لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

رسول سے ہدایت کی نفی کا مصداق:

خلاصہ یہ کہ دونوں طرح کی آیات آپ کو ملیں گی، جہاں رسول، مومنین اور کتاب کے ہادی ہونے اور راستہ دکھانے کا مضمون ہے تو وہاں اراءۃ الطریق مراد ہے، محض راستہ دکھانا اور رہنمائی کرنا مراد ہے، اور جہاں ہدایت کی نفی کی گئی ہے تو وہاں ایصال الی المطلوب مراد ہے کہ اے نبی! آپ لوگوں کو مطلوب تک نہیں پہونچا سکتے، کیونکہ مقصود تک پہنچانا ہمارا کام ہے، اس معاملہ کو اللہ پاک نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے:

''إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ، كَقَلْبٍ وَاحِدٍ، يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ'' ۲؎

''بنی آدم کے دل رحمن کی دو انگلیوں کے بیچ میں ہیں جدھر چاہتے ہیں وہ اُن کو پلٹتے ہیں۔''

اسی واسطے قلب کا نام ''قلب'' ہے اور ''قلب'' کے معنی پلٹنے کے ہیں۔ وہ ایک حالت میں نہیں رہتا۔ اوّل تو وہ خود پلٹ کر ہی رکھا گیا ہے یعنی پلٹی ہوئی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ اس کا کچھ بھروسہ نہیں ہے، کبھی کچھ ہے تو کبھی کچھ ہے۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ جب وہ مسجد جانے کے لیے گھر سے نکلتے تھے تو گھبراتے تھے۔ جب اُن سے پوچھا جاتا کہ آپ مسجد جاتے ہوئے گھبرا رہے ہیں تو وہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد تو جا رہا ہوں لیکن پتہ نہیں مسجد ہی پہنچوں گا یا مے خانہ۔ ایسا

۱؎: القصص:۵۶۔ ۲؎: صحیح مسلم: باب تصریف اللہ تعالیٰ القلوب کیف شاء۔

بہت ہوتا ہے کہ کسی کو دعوت دی جاتی ہے کہ بھائی! درسِ قرآن کے لیے چلتے ہیں۔ گھر سے نکلے راستے میں ایک دوست سے ملاقات ہوگئی، گپ شپ شروع ہوئی، باتوں باتوں میں چائے نوشی کا ارادہ ہواتا کہ آرام سے بیٹھ کر باتیں کر سکیں، پھر چائے پیتے پیتے دس بج گئے، گھر واپس چلے گئے، نکلے تھے دینی مجلس میں حاضر ہونے کی نیت سے لیکن شیطان دوست کی شکل میں آکر بہکا لے گیا۔

جب ہدایت کی یہ تین اقسام سامنے آگئیں تو اب سمجھیں کہ اللہ پاک سے ہدایت جو مانگی جارہی ہے وہ اخص الخاص ہدایت ہے، یا اللہ ہمیں محض راستے کی راہنمائی ہی نہیں بلکہ ہمیں مطلوب تک پہنچا دے، کیونکہ ہم خود سے مطلوب تک نہیں پہونچ سکتے، مطلوب تک پہونچانا صرف آپ کا کام ہے، ظاہر ہے کہ مومنین ہدایت یافتہ ہیں، دین اسلام پر ہیں، ہدایت کی ایک قسم اراءۃ الطریق (راستہ کی رہنمائی) تو انہیں حاصل ہے، لیکن مطلوب تک پہونچے ہوئے نہیں ہیں، اس لئے اس آیت میں وہ مطلوب تک پہونچانے کی دعامانگ رہے ہیں۔

قربِ الٰہی کے لامتناہی درجات ہیں:

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہدایت کی کوئی حد نہیں ہے، اللہ پاک کے قرب کی کوئی حد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات لامتناہی ہے، اس تک پہنچنے کے مدار بھی لامتناہی ہیں، اس کے درجات بھی لامتناہی ہیں، آدمی جتنا چاہے اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھ سکتا ہے، اس اعتبار سے ہر آدمی جس اسٹیج پر ہے اُس سے اگلے مرحلے میں وہ ہدایت کا محتاج ہے، اس لئے اب یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ جب مومنین ہدایت پر ہیں تو پھر ہدایت کی دعا کیوں مانگ رہے ہیں، کیونکہ ہدایت اور قرب کے درجات لامتناہی ہیں، اس لئے اس اعتبار سے آدمی اللہ کے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو؟ آگے کے درجات میں اور اللہ پاک کے مزید

قرب کا وہ محتاج ہی ہو گا۔ اس لئے مومن ہونے کے باجود ہدایت کی دعا مانگنے میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔

صراطِ مستقیم پر استقامت اصل ہے:

تیسرا جواب یہ ہے کہ اس دعا میں محض ہدایت مانگنا اور راہِ راست دکھانا مراد نہیں ہے، بلکہ ہدایت دینے اور راہِ راست کے دکھانے کے بعد اس پر چلانا اور اس پر جمانا مراد ہے، اور اس پر چلانا صرف اللہ ہی کا کام ہے، اس لئے علماء نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ یا اللہ ہمیں سیدھے راستے پر چلا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اللہ پاک ہمیں راہِ راست دکھلا دیں، ہدایت سے نواز دیں، لیکن ہم اس پر باقی نہ رہیں۔

جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر فرمائی ہے:

”أَرۡشِدۡنَا لِلدِّيۡنِ الۡقَائِمِ الَّذِيۡ تَرۡضَاهُ وَهُوَ الۡإِسۡلَامُ وَيُقَالُ ثَبِّتۡنَا عَلَيۡهِ“[1]

یا اللہ! اس دین کی راہنمائی فرمایئے جس سے آپ راضی ہوں، اور یہ بھی تفسیر کی گئی ہے کہ آپ ہم کو اس پر ثابت اور قائم رکھئے۔ اور پھر یہ ہدایت اور راہِ راست پر چلنا صرف نماز روزہ زکوۃ وغیرہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات، معاشرت اور سیاست ہر ایک میں ضروری ہے، اور ہر وقت ہر منٹ اور ہر سیکنڈ میں ضروری ہے، اب آپ اندازہ لگایئے کہ سیدھے راستے پر چلنا کتنی نازک بات ہے اور ہم لوگوں میں اس کی کتنی ضرورت ہے؟ یہ وہ مقام ہے جہاں آدمی سمجھتا ہے کہ یہ آیت ”اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ“ صرف نماز میں پڑھنے کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر ہر منٹ بلکہ ہر ہر سیکنڈ پر آدمی کے لئے ضروری ہے، اسی واسطے سے علماء نے فرمایا کہ صراط مستقیم ہی کو اصلی شکل یعنی خارجی وجود دیا جائے گا تو۔ کل میدانِ محشر میں آنے والا پل صراط اس دنیا میں صراط مستقیم ہے۔

---

[1]: تفسیر ابن عباس: ۱/ ۲۔

دعا پڑھیں نہیں بلکہ مانگیں:

ایک ہے دعا کا پڑھنا اور ایک ہے دعا کا مانگنا، دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ جیسے بچے کتاب پڑھتے رہتے ہیں، اس کتاب میں لکھا ہوتا ہے کہ ''بیٹے نے باپ سے سائیکل مانگی،'' ایک صورت تو یہ ہے کہ بچہ اس کو بار بار پڑھ رہا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ بچے نے کتاب تو ایک طرف رکھ دی، اور اپنے باپ کے پاس جا کر سائیکل مانگنے لگا، ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں فرق ہے، جس طرح ان دونوں صورتوں میں فرق ہے اسی طرح دعا کے پڑھنے اور مانگنے میں فرق ہے۔ ایک یہ ہے کہ ہم ﴿اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ﴾ کہتے رہیں اور ایک یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے مانگیں کہ اے اللہ! مجھے آپ سیدھے راستے پر چلائیے۔

قلب غافل سے دعا قبول نہیں ہوتی

یہ دوسری صورت اصل مطلوب ہے، کیونکہ مانگنے میں تملق اور عاجزی ہوتی ہے، تورّع اور احتیاج کا اظہار ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کامل توجہ ہوتی ہے۔ اس طریقہ پر مانگنے سے دعا قبول ہوتی ہے، ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، اگر غفلت اور بے توجہی کے ساتھ دعا مانگی جائے تو ایسی دعا قبول نہیں ہوتی، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَجِیۡبُ دُعَآءً مِنۡ قَلۡبٍ غَافِلٍ لَاہٍ''[۱]

''بے شک اللہ تعالیٰ دعا کو غافل اور بے پرواہ دل سے قبول نہیں فرماتے''

جیسے میں آپ سے بات کروں مگر میرے چہرے کا رُخ دوسری طرف ہو، تو کیا آپ میری طرف متوجہ ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ یہ تو بڑی بد تمیزی اور بد تہذیبی ہوگی، ایسے ہی آدمی اگر اللہ تعالیٰ سے مانگے لیکن اس کا دل اللہ پاک کی طرف متوجہ نہ ہو تو یہ اللہ پاک کے ساتھ بڑی بے ادبی اور بے احترامی ہوگی، اس لئے ایسے آدمیوں کی

۱: سنن ترمذی: الدعوات/باب ٦٦۔

دعا اللہ پاک قبول نہیں فرماتے، اس کی مشق کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی طلب دل میں پیدا کرنی چاہئے، کوشش کرنی چاہئے، آدمی اپنے اعتبار سے کوشش تو کرے، اگر درمیان میں موت ہو جائے تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اللہ پاک معاف فرمادیں گے، کیونکہ نصوص میں اس طرح کی نظیریں ملتی ہیں، جیسے حفظ کرنے والے کے بارے میں آتا ہے کہ حفظ قرآن کی تکمیل سے قبل وہ مر جائے تو اللہ تعالیٰ اُس کو حافظوں میں شمار فرماتے ہیں، بعض روایتوں میں یہ بھی مروی ہے کہ ایک فرشتہ اس کی قبر میں متعین کیا جاتا ہے جو اُس کے حفظ کو مکمل کروادیتا ہے۔[۱]

ایسے ہی اگر کوئی آدمی حج کے لیے گیا اور راستے میں اُس کا انتقال ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اُس کو حاجیوں میں شمار کرتے ہیں، بلکہ دوسروں کے حج کے مقابلے میں اس کا ثواب زیادہ ہو گا، اور قیامت تک جتنے بھی حج ہوں گے سب کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔

”مَنْ خَرَجَ حَاجًّا فَمَاتَ كَتَبَ اللهُ لَهُ أَجْرَ الْحَاجِّ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ“[۲]

طلب کی حقیقت:

یہ اجر طالب کے لئے ہے، تمنا کرنے والے کے لئے نہیں، طلب الگ چیز ہے اور تمنا الگ چیز ہے، طلب اس کو کہتے ہیں کہ جب تک آدمی کو چیز حاصل نہیں ہوتی، اس وقت تک وہ بے چین اور بے قرار رہے، اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے، اور تمنا میں آدمی کوشش نہیں کرتا بلکہ اس میں صرف خیال اور ارادہ ہی کرتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو جب اللہ تعالیٰ کی طلب ہوئی تو جنگل جنگل پھرتے رہے، حتی کہ بیمار ہو گئے۔ حکیموں نے کہا کہ اگر ان کو اللہ تعالیٰ کا وصال یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت نہ ملی تو یہ مر جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے عشق کی سوزش اور گرمی سے اُن کی طبیعت خراب

---

[۱]: شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور: ۱/ ۱۹۰۔ [۲]: مسند ابی یعلی الموصلی: ۶۳۵۷۔

ہوگئی تھی۔ یہ طلب ہمیں اپنے اندر پیدا کرنا ہے، اخلاق میں، معاملات میں، معاشرت میں، بیوی بچوں میں، کھانے پینے میں، رہنے سہنے میں، وضع قطع میں، شکل وصورت اور لباس میں کہ ہمیں صحیح راستہ مل جائے اور اللہ پاک کی رضا حاصل ہو جائے، اس طلب اور شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہئے، اوراس کے سامنے اپنی ناک رگڑنا چاہئے، تب جا کر رحمتِ حق کے دروازے ہمارے لئے کھلیں گے، ہدایت کے راستے ہمارے لئے کھلیں گے۔ راہِ حق کے علاوہ دوسرے راستوں پر چلتے ہوئے ہم کو ایک قسم کا حجاب آئے گا۔ اسی لیے کہا گیا:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾[1]

"نماز فحش اور منکر سے روکتی ہے۔" ایسا کیوں ہے؟

نماز کی خصوصیت:

اس لئے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے اتنا کہنے کے بعد عمل کا بھی ارادہ کرتا ہے، اور سورۂ فاتحہ کے بعد ناک رگڑ کر عملی ثبوت بھی پیش کرتا ہے اور دس مرتبہ اپنا سر اس کے سامنے رکھ بھی چکا ہے تو پھر وہ بُرائی کی طرف جاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کرے گا، اس سے رک جائے گا۔

ایک بزرگ کا ملفوظ:

ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ "تَنْهٰى" عربی کا لفظ ہے، اس کے معنی روکنے کے ہیں اور ایک "تنہا" اُردو کا ہوتا ہے یعنی اکیلا۔ ان دونوں کو سامنے رکھ کر وہ کہتے تھے کہ تنہا نماز تمام فحش اور منکر سے روک دیتی ہے۔ لیکن یہ اس وقت روکے گی جب کہ آدمی نماز کو نماز کی طرح پڑھے، جیسے کھانے کی ایک خصوصیت ہے، پینے کی ایک خصوصیت ہے اسی طرح نماز کی بھی ایک خصوصیت ہے۔ اور وہ ہے منکرات سے باز رکھنا۔

---

[1]: العنکبوت:۴۵۔

﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ أَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ﴾

(یا اللہ! ہمیں چلا) ”ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا“

اب یہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ پاک کا انعام ہوا تو قرآن مجید کی دوسری آیت اس کی تفسیر کرتی ہے:

﴿وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ أَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ أُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا﴾[۱]

”اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے تو یہ لوگ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاء۔ اور یہ بہت اچھے رفیق ہیں۔“

منعم علیہم کے چار طبقے:

منعم علیہم کے چار طبقے اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ نبی کے ساتھ اور تین صفات جمع ہو سکتی ہیں، لیکن جو نبی نہ ہو تو اس میں نبوت کے علاوہ یہ اوصاف جمع ہو سکتے ہیں، نبوت تو صرف نبی ہی میں ہو گی کسی اور میں نہیں ہو گی۔ بہر حال اس آیت میں اللہ پاک نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر میرا انعام ہوا ہے، ان کے راستے پر چلنے کی دعا مانگو۔

اب مطلب یہ ہو گا کہ اے اللہ! آپ مجھے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاء کے راستہ پر چلا دیجئے۔

نبی تو نبی ہوتا ہے، اس کی رفعت اور بلندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس کے بعد صدیق کا درجہ ہے، یہ شہید سے بڑے مرتبے والا ہوتا ہے کیونکہ صدیق صرف جان کو قربان نہیں کرتا بلکہ وہ مال کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

۱: النساء:۶۹۔

کیا صدیق صرف حضرت ابو بکر ہیں؟:

صدیق کی ایک مثال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، صدیق اوصاف اور کمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ پختہ ہوتا ہے۔ جس آدمی کے اوصاف میں کمال پیدا ہوتا جائے گا اس میں صدیقیت آتی جائے گی، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صدیق صرف حضرت ابو بکر تھے اور دوسرے صحابہ نہیں تھے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ صدیق اس کو کہتے ہیں جس کے اوصاف میں کمال پیدا ہو جائے، اب جس جس کے اوصاف میں کمال پیدا ہو گا، اسے صدیق کہیں گے، یہ بہت ممکن ہے کہ جو شہداء ہوں وہ صدیقین بھی ہوں اور جو صدیقین ہوں وہ شہداء بھی ہوں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول صدیق کی وضاحت:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے صدیق کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر آئینے کے سامنے نبی ٹھہر جائیں تو آئینے پر ان کا عکس ظاہر ہو گا، خارج میں جو ہیں وہ تو نبی ہیں، لیکن آئینے میں جو نظر آتا ہے وہ صدیق ہوتا ہے، صدیق اپنے اوصاف اور کمالات میں نبی کے اتنا مماثل ہوتا ہے کہ غیر کے لئے اس کا امتیاز مشکل ہوتا ہے۔

حضرتِ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اس درجہ پر تھے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آپ رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، اسی وجہ سے نصوص میں آپ کے اتنے ہی زیادہ فضائل وارد ہوئے ہیں۔ اور آپ کو جو صدیق کا لقب ملا، اس کا واقعہ دراصل یہ ہے کہ واقعۂ معراج کے بعد جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کافروں کے سامنے اس کو سنایا تو لوگ انکار کرنے لگے، اور انہوں نے یہ سوچا کہ ابو بکر (صدیق رضی اللہ عنہ) کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جدا کرنے کا یہ بہترین موقع ہے ان کے سامنے جب یہ واقعہ سنائیں گے تو وہ بھی اس کا انکار کر دیں گے، اس بات کو کوئی نہیں مانے گا۔ کیونکہ مکۃ المکرمۃ سے بیت المقدس

کی مسافت دو مہینے ہے، محمد (ﷺ) تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک ہی رات میں بیت المقدس بھی گئے، اور ساتوں آسمان کا بھی سفر کیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ حضرت ابو بکر سے کہنے لگے کہ دیکھا! تمہارے دوست محمد (ﷺ) نے کیا کہا؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ انہوں نے کیا فرمایا؟ کہنے لگے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں راتوں رات بیت المقدس گیا اور پھر وہاں سے ساتوں آسمانوں پر بھی گیا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا انہوں نے واقعی ایسا کہا ہے؟ مشرکین نے کہا کہ ہاں! ایسا ہی کہا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

”إِنِّي لَأُصَدِّقُهُ فِيمَا هُوَ أَبْعَدُ مِنْ ذٰلِكَ أُصَدِّقُهُ بِخَبَرِ السَّمَاءِ فِي غَدْوَةٍ أَوْ رَوْحَةٍ“[۱]

میں ان کی تصدیق کرتا ہوں ان چیزوں میں جو اس سے بھی زیادہ عجیب ہیں، میں اس کی بھی تصدیق کرتا ہوں کہ صبح اور شام ان کے پاس آسمان سے خبر آتی ہے۔ یعنی جب اُن کا خادم جبرئیل پچاسوں مرتبہ آسمان سے زمین پر اُتر سکتا ہے تو یہ مخدوم (ﷺ) آسمان پر کیوں نہیں جاسکتے؟ تاریخی روایتوں میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کے درِ دولت پر مجموعی طور پر پچیس ہزار مرتبہ حاضری دی ہے۔ اب اندازہ کیجئے کہ جو تمام فرشتوں کا سردار ہے اُس نے حضور اکرم ﷺ کے درِ دولت پر پچیس ہزار مرتبہ حاضری دی ہے تو کیا نبی کی ذات عالی آسمان پر نہیں جاسکتی جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی اس موقع پر تصدیق کی تو آپ نے انہیں صدیق کے لقب سے نواز دیا۔

غرض یہ کہ صدیقین بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن پر اللہ پاک نے انعام فرمایا ہے، اور حق تعالیٰ نے انعام یافتہ لوگوں کے راستہ پر چلنے اور اس راستے کی دعا مانگنے کا حکم دیا ہے لہٰذا ان کے راستے پر چلانے کی بھی دعا کرنی چاہیے۔

---

[۱]: مستدرک حاکم: کتاب معرفۃ الصحابۃ رضی اللہ عنہ: ۴۴۰۷۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں ضروری ہیں:

یہاں ایک بات بڑی عجیب ہے کہ اللہ پاک نے ”صراط الذین انعمت علیہم“ فرمایا، یوں بھی کہا جاسکتا تھا صراط القرآن و الحدیث، یعنی اے اللہ! قرآن و حدیث کے راستے پر ہمیں چلا دیجیے، لیکن اللہ پاک نے اس طرز کے بجائے فرمایا کہ منعم علیہم کے راستے پر تم چلو، اور ان کے راستے کی دعا مانگو، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر صرف قرآن و حدیث کے پڑھنے کا حکم دیتے اور آدمی کو براہِ راست کتاب دی جاتی اور سکھانے والوں کو بھیجا نہ جاتا تو وہ سیدھے راستے پر نہیں چل سکتا، کیونکہ آدمی کی تربیت ہمیشہ آدمی ہی کی نگرانی میں ہوتی رہی ہے۔ محض کتاب اللہ اس کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ بھی ضروری ہوتے ہیں۔

رجال اللہ کے بارے میں افراط و تفریط بھی گمراہی ہے:

مسلمانوں میں تین طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ کو اہمیت دیتا ہے اور رجال اللہ سے قطع نظر کرتا ہے۔ ایسے لوگوں میں روکھے پن کا پیدا ہونا ضروری ہے، ایسے لوگ کبھی بھی قرآن و حدیث کے منشے پر نہیں پہنچ پاتے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو رجال اللہ کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ اُن کے نزدیک کتاب اللہ اور سنت رسول کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ ایسے لوگ عموماً بدعات و خرافات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جتنے لوگ غلط قسم کے رسم و رواج میں پھنسے ہوئے ہیں آپ دیکھیں گے کہ وہ قرآن و سنت کو اہمیت نہیں دیتے۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے ساتھ ساتھ رجال اللہ اور علماء ربانیین کو بھی اہمیت دیتا ہے، یہ لوگ معتدل اور درمیانی راستے پر ہیں۔

یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک قاعدہ ہے۔ دنیا میں اللہ پاک نے آسمانی کتابوں اور صحیفوں کو نازل کیا، لیکن ساتھ میں ہزاروں انبیاء کو بھیجا، تاکہ وہ اس کتاب کو سمجھائیں،

امتی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا کلام پڑھ لے اور سمجھ لے۔ اگر محض کتاب اور حدیث ہی کافی ہوتی تو انبیاء کو کیوں بھیجا گیا؟ معلوم ہوا کہ محض کتاب اللہ کافی نہیں ہے، بلکہ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ بھی ضروری ہیں۔

جیسے آدمی میڈیسن (Medicines) کے قواعد یاد کرکے اور دواؤں کے نام یاد کرکے کلینک (Clinic) نہیں کھول سکتا، کسی کا علاج و معالجہ نہیں کرسکتا، تو قرآن و حدیث کے پڑھ لینے سے کیسے وہ مفتی بن جائے گا؟ کیسے وہ لوگوں کو مسائل بتاسکے گا؟ کیسے وہ عالم دین بن جائیگا؟ جب تک آدمی کسی کی تربیت حاصل نہیں کرے گا، کسی کی زیر نگرانی نہیں رہے گا، اس وقت تک وہ راہِ حق پر نہیں چل سکتا، لوگوں کو راہِ راست پر نہیں لاسکتا، اس لیے فرمایا کہ اس راستے میں جو نشیب و فراز آئیں گے، جو مشکلات آئیں گی، وہ تم کو اُن لوگوں کے راستے سے ملیں گے جو لوگ تربیت یافتہ ہیں، اور اُن لوگوں کی تربیت بھی ان کے اساتذہ اور ان کے مشائخ نے کی ہے، اور یہ سلسلہ براہِ راست حضور ﷺ تک پہونچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور ﷺ کی براہ راست تربیت:

خود نبی ﷺ کی تربیت اللہ تعالیٰ نے براہِ راست فرمائی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ اللهَ أَدَّبَنِي وَأَحْسَنَ أَدَبِي"[1]

"مجھ کو میرے رب نے ادب سکھایا اور بہت بہترین ادب سکھایا۔"

---

[1] ادب الاملاء و الاستملاء: ۱/۱۔ أدبني ربي فأحسن تأديبي .... وبالجملة فهو كما قال ابن تيمية: لا يعرف له إسناد ثابت، لكن قال في الدرر: صححهٔ أبو الفضل بن ناصر. وقال في اللآلئ: معناه صحيح، لكن لم يأت من طريق صحيح الخ: كشف الخفاء ومزيل الالباس: ۱/۸۱۔

سنن ہادیہ اور سننِ عادیہ دونوں قابل اتباع ہیں:

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کے اعمال چاہے وہ عبادت سے متعلق ہوں یا عادت سے متعلق، جیسے آپ کا چلنا، کنگھی کرنا، چپل پہننا، کپڑے پہننا، کسی سے بات چیت کرنا، بیٹھنا، کھانا تناول فرمانا وغیرہ وغیرہ یہ سب کام آپ ﷺ اپنی مرضی سے نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کا طریقہ سکھایا تھا، اس لئے حضور ﷺ کی پوری زندگی آدمی کے لیے عملی نمونہ ہے۔ چاہے آپ کے وہ اعمال سنن ہادیہ میں سے ہوں یا سنن عادیہ میں سے۔

حضور کے مخصوص اعمال کا حکم؟

اِلاّ یہ کہ کسی کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ یا حضور ﷺ کی طرف سے استثناء ہو تو پھر اس کام کو نہیں کیا جائے گا، کیونکہ کچھ کام ایسے بھی ہیں جو صرف نبی علیہ السلام کے ساتھ خاص ہیں۔ جیسے آپ ﷺ نے گیارہ نکاح فرمائے، لیکن امت کے لئے چار سے زائد کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ نبی علیہ السلام کو چار سے زائد کی اجازت دینی مصالح کے پیش نظر تھی، کیونکہ آپ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی بیوہ عورت سے نکاح کیا، ظاہر ہے کہ آدمی اگر خواہش اور ہوس کی بنیاد پر نکاح کرتا تو چالیس برس کی نہیں بلکہ پندرہ برس کی باکرہ لڑکی سے نکاح کرتا، آپ ﷺ نے چالیس برس کی خاتون سے نکاح کیا، نکاح سے قبل ان کے دو شوہر گزر چکے تھے، اور پچیس برس تک آپ ان کے ساتھ رہے، اور پھر آپ کی جتنی ازواج مطہرات تھیں وہ سب کی سب پہلے سے شادی شدہ تھیں، سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے، اب آپ ہی غور کیجئے کہ یہ نکاح ہوس پرستی کی بنیاد پر ہوئے تھے یا دینی مصلحت کے پیش نظر؟

بہر حال بات یہ چل رہی تھی کہ جو اعمال حضور ﷺ کے لئے مخصوص تھے، ان میں آپ کی اتباع نہیں کی جائے گی، لیکن اس کے علاوہ اعمال میں حضور کی اتباع کی جائے گی، اب اس کی شرعی حیثیت الگ الگ ہو گی، کبھی وہ فعل فرض، کبھی واجب، کبھی مسنون اور کبھی مستحب ہو گا، لیکن آدمی اتباع کی نیت سے کرے گا تو اس کو ثواب ضرور ملے گا۔

مثلاً حضور ﷺ سر میں تیل لگاتے تھے۔ اب لوگ کہتے ہیں کہ سر میں تیل لگانے سے تیل دماغ تک نہیں پہونچتا، کیونکہ سر کے چاروں طرف سخت ہڈی ہے، تیل کھوپڑی کے اندر اُترتا نہیں ہے، لہٰذا سر میں تیل لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک طرف آپ ڈاکٹر کی یہ ریسرچ رکھ دیجئے، اور دوسری طرف آپ خود سر میں تیل لگا کر دیکھئے آپ کو کتنا سکون ملتا ہے؟ کتنی پر سکون نیند آتی ہے؟ جبکہ ڈاکٹری کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ دماغ میں تیل جانے کا راستہ نہیں۔ اگر حضور ﷺ یہ فرماتے کہ سر میں تیل لگانے سے تیل دماغ میں جاتا ہے تب آپ کو اعتراض ہو سکتا تھا۔ آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا۔ بس آپ کا یہ عمل منقول ہے کہ آپ ﷺ سر میں تیل لگاتے تھے۔ اب یہ کس راستے سے دماغ میں جاتا ہے؟ کیسے آپ کو راحت پہنچتی تھی؟ اللہ تعالیٰ نے اُس کا کیا طریقہ رکھا ہے؟ وہ ہمیں نہیں معلوم اب اگر ہم اس پر اتباع سنت کی نیت سے عمل کریں گے تو ثواب بھی ملے گا اور فائدہ بھی محسوس ہو گا۔ آپ کا یہ عمل ظاہر ہے کہ ایک دنیوی حاجت کے لئے ہے، لیکن آپ اس معاملہ میں بھی ہمارے لئے نمونہ اور اسوہ ہیں۔

سننِ عادیہ پر اعتراض کی وجہ:

یہاں لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس میں کیا حکمت تھی؟ یہ صرف دنیوی کام تھا، یہ آپ کی سنن عادیہ میں سے ہے، سننِ ہادیہ میں سے نہیں ہے، دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ سوال

رسول کی بے وقعتی اور بے عظمتی اور دین سے دوری اور جہالت سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ کہ اُس نے مقامِ نبوت اور مرتبۂ نبوت کو نہیں سمجھا، اُس نے نبی ﷺ کی عظمت کو نہیں پہچانا اور آپ کے عمل کو بے حیثیت سمجھا، اس لئے یہ سوال کیا۔ ایک حدیث میں ہے:

”كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِي شَأْنِهِ كُلِّهِ، فِي طُهُورِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَتَنَعُّلِهِ“[۱]

”نبی ﷺ ہر (اچھی) چیز میں تیمن (داہنی طرف) کو پسند کرتے تھے یہاں تک کہ وضوء میں بھی، کنگھی کرنے میں بھی اور جوتا پہننے میں بھی۔“

یہاں یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ کنگھی کرنے میں جوتا پہننے میں دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے؟ یہ تو سنن عادیہ میں سے ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل یہ بتانا ہے کہ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے سکھلایا ہے، ہمیں بھی اس پر عمل کرنا چاہئے۔ اگر آپ بائیں جانب بھی کنگھی کریں گے تب بھی آپ کے بال جم جائیں گے۔ آپ کا مقصود تو حاصل ہو جائے گا، آپ پر کوئی گناہ نہیں ہو گا، لیکن نبی کا طریقہ چھوٹ جائے گا، اس طریقہ پر عمل کرنے سے جو ثواب کی امید تھی وہ ختم ہو جائے گی۔

اس کا ایک بہت برا انجام یہ ہو گا کہ آدمی سنت نبوی کو ہلکا اور بے اہمیت سمجھنے لگے گا، اور آہستہ آہستہ چھوٹی سنتوں کو بے اہمیت سمجھنے سے بڑی سنتوں کے بارے میں بھی یہ ذہن بنتا جائے گا، اور آدمی اس کو بھی بے حیثیت سمجھنے لگے گا، اس لئے ان چیزوں کی آدمی جب قدر کرے گا اور اس کی اہمیت سمجھے گا، تو بڑی چیزوں کی قدر اس کے لئے آسان ہو گی، اس پر عمل کرنا آسان ہو گا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسا

---

[۱] صحیح بخاری: الصلاۃ/ باب التیمن فی دخول المسجدِ وغیرہ۔

کرنے سے دل میں نورانیت پیدا ہوتی ہے اور دل تجلیاتِ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ ہر صحیح راستے پر چلنے سے دل میں صحت اور نورانیت پیدا ہوتی ہے اور ہر غلط راستے سے دل میں کجی پیدا ہوتی ہے۔

قرآن وحدیث کا خود سے سیکھنا محض جہالت اور بے وقوفی ہے:

بات یہ چل رہی تھی کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے علماء کی ضرورت ہوتی ہے، حضور پاک ﷺ کو علم اللہ پاک نے سکھایا، آپ ﷺ نے خود سے نہیں سیکھا، پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو سکھایا، پھر صحابہ نے تابعین کو سکھایا، پھر تابعین نے تبع تابعین کو سکھایا، اس طرح سے یہ علم یہ قرآن یہ حدیث ہم تک پہونچی، کسی نے خود سے علم حاصل نہیں کیا۔ آج کوئی قرآن پاک اور احادیث مبارکہ خود سے سیکھنے اور پڑھنے کی دعوت دیتا ہے تو گویا وہ گمراہی کی دعوت دیتا ہے، کیونکہ آدمی خود سے اس کو کیسے سیکھ سکے گا؟ اگر کوئی قرآن شریف سامنے رکھ کر نماز پڑھنا چاہے تو نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اگر کسی آدمی کو جس نے کسی مسلمان کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ خود اُس نے کبھی پڑھی، نہ کسی کتاب میں اُس کی تصویر دیکھی، اُس کے بعد اُس کے سامنے قرآن و حدیث رکھ دیئے جائیں، اور اس سے کہا جائے کہ تم اس میں دیکھ کر نماز پڑھ لو۔ تو کیا وہ نماز پڑھ پائے گا۔ اُس کو یہی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ رکوع کیسے کرتے ہیں؟ سجدہ کیسے کرتے ہیں؟ اس میں جانے کا کیا طریقہ ہے؟ رکوع اور سجدہ کے لئے کیسے جھکتے ہیں؟ اور کیسے اُٹھتے ہیں؟ تسبیحات کیسے پڑھی جاتی ہیں؟ قرآن مجید کب پڑھا جاتا ہے؟ اور کب نہیں پڑھا جاتا؟ تشہد میں بیٹھنے کا طریقہ کیا ہے؟ اٹھنے کا طریقہ کیا ہے؟ سلام کب پھیرا جاتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آئے گا، حالانکہ سب کچھ لکھا ہوا ہے۔

ایسے ہی ایک مثال اور سن لیجئے کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں "الم" لکھا ہوا ہے اور سورۂ فیل، کے شروع میں بھی "الم" لکھا ہوا ہے۔ اب آپ سورۃ البقرہ کی ابتدائی دو آیتیں لکھ دیں اور سورۂ فیل کی دو آیتیں لکھ دیں۔ اور ایک ایسے آدمی کو جس نے کبھی

کسی سے قرآن مجید نہ سنا ہو اس سے پڑھنے کے لیے کہیں۔ دونوں سورتیں **الم** ہی سے شروع ہو رہی ہیں اور لکھنے میں دونوں کی صورتیں ایک ہی جیسی ہیں، جس کی وجہ سے یہ شخص "**الم**" صحیح طور پر ادا نہیں کر سکے گا۔ ایسے ہی بخاری شریف آپ کے سامنے رکھی ہوئی ہو تو آپ صرف اس کی احادیث مبارکہ پڑھ کر نماز پڑھ کر نہیں دکھا سکتے۔ خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی کتاب کے مطابق نماز نہیں پڑھتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیثیں تو جمع کر دیں، مگر اُن حدیثوں کا مطلب ائمہ مجتہدین کے اقوال ہی سے حل کرتے تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مقلد تھے، امام مسلم مقلد تھے، امام ترمذی مقلد تھے، امام ابو داؤد مقلد تھے، امام ابنِ ماجہ مقلد تھے، امام محمد مقلد تھے۔ مجتہدین الگ ہیں جنہوں نے قرآن و حدیث سے مسائل نکالے ہیں۔ قرآن مجید میں کئی آیتیں اور احادیثِ مبارکہ میں کئی احادیث ایسی ہیں جن میں باہمی تعارض اور اختلاف معلوم ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ان دونوں پر ایک ساتھ عمل تو نہیں کیا جا سکتا، اس لئے اس میں تاویل اور تطبیق کی ضرورت پیش آتی ہے، ان میں سے کوئی ناسخ اور کوئی منسوخ ہوتی ہے، کوئی حدیث یا آیت ابتداءِ اسلام سے متعلق ہوتی ہے، لیکن بعد میں کسی دوسری حدیث یا آیت سے اس کو منسوخ کر دیا جاتا ہے، اب اس کو پہچاننا ہوتا ہے کہ کس پر عمل کیا جائے؟ اور کس کو ترک کیا جائے؟ اور یہ کام محدثین کا نہیں بلکہ فقہاء کا ہے، اس لئے ان سب باتوں کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے باضابطہ ایک عالم اور ایک مربی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر جو کوئی سیکھنے کی کوشش کرے گا وہ گمراہی کے دلدل میں پھنستا چلا جائے گا۔ اور جو لوگ قرآن و احادیث کو خود سے سیکھنے اور سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ محض بے وقوفی، جہالت، دین اور شریعت سے دوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ لوگ اس معاملہ میں کوشش کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں، اگرچہ کہ قرآن مجید ہی پڑھ رہے ہیں، احادیث مبارکہ ہی پڑھ رہے ہیں، لیکن اس کو سیکھنے کے لئے جو طرز اختیار کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔

اہلِ باطل بھی قرآن وحدیث کے ذریعہ گمراہی پھیلاتے ہیں:

آدمی تو سمجھتا ہے کہ میں قرآن پڑھ رہا ہوں، میں صحیح راستے پر چل رہا ہوں، لیکن قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ گمراہی کی طرف جارہے ہیں:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾[1]

”اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور اس کے ذریعے بہت سے لوگوں کو راستہ بتادیتا ہے۔“

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت میں تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے لیکن اُن میں ایک سیدھے راستے پر ہو گا۔ باقی بہتّر فرقے گمراہ ہوں گے۔

ان کے پاس بھی قرآن ہو گا، ان کے پاس بھی احادیث ہوں گی، لیکن وہ لوگ گمراہ ہوں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جن لوگوں نے کافر کہا تھا، اور اُن کو واجب القتل قرار دیا تھا، ان سے پوچھا گیا کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ انہوں نے یہی کہا تھا کہ ہمارے پاس قرآن ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن پر عمل نہیں کرتے اور اس کے موافق فتویٰ نہیں دیتے، اس لیے اُن کو قتل کرنا ضروری ہے۔ کہنا یہ ہے کہ اہلِ باطل بھی قرآن ہی سے استدلال کرتے ہیں، اور اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں، لیکن وہ حقیقتاً قرآن وحدیث کی روشنی میں گمراہی ہوتی ہے۔ یہ گمراہی پیدا ہوتی ہے خود سے دین سمجھنے کی کوشش اور رجال اللہ کو لغو قرار دئے جانے کی وجہ سے۔

اس لیے حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ تم: ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ انعام یافتہ لوگوں کا راستہ مانگو اور اس پر چلو۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ بھی ضروری ہیں۔

---

[1]: البقرۃ:۲۶۔

رجال اللہ کی علامات:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رجال اللہ کون ہیں؟ رجال اللہ کو ہم کیسے پہچانیں؟۔ ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ ہم اہل حق ہیں، ہمارے پاس قرآن وحدیث کا صحیح علم ہے۔ تو اب ہم کس کی بات مانیں؟ ایسے موقع پر دیکھا جائے گا کہ کون قرآن وحدیث کے اصولوں کے مطابق چل رہا ہے؟ کس میں نماز کی اہمیت ہے؟ اُس کا نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کیسا ہے؟ اس کے اندر حلال و حرام، تقویٰ اور دینداری کتنی ہے؟ اس پر اُس زمانے کے خواص کا اعتماد کیسا ہے؟ اگر خواص علماء اس کی توثیق کرتے ہیں تو اب وہ حقیقت میں قرآن وسنت کا حامل ہوگا، اس کے پاس جاکر آدمی علم دین حاصل کرسکتا ہے۔

مغضوب اور گمراہ قوموں کا مصداق:

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾

ان لوگوں کے راستے پر مت چلا جن پر تیرا غصّہ ہوا اور نہ ان کے راستے پر جو گمراہ ہیں۔

رئیس المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ المغضوب سے مراد یہود ہیں اور الضالین سے عیسائی مراد ہیں۔[1] اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے مسلمان مراد ہیں۔

راستے کی تین قسمیں ہیں۔ ایک افراط کا، دوسرا تفریط کا، تیسرا اعتدال کا یعنی جو ان دونوں کے درمیان والا ہے۔ ﴿صراط الذین انعمت علیھم﴾ میں اعتدال کے راستہ کا ذکر اور اس کی تعلیم ہے، ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ میں افراط والے راستہ کا ذکر ہے اور ﴿وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ میں تفریط والے راستہ کا ذکر ہے۔ اللہ پاک نے ان تین راستوں کے بارے میں بتلا دیا کہ کونسا راستہ صحیح ہے اور کونسا غلط؟ فرمایا کہ افراط بھی غلط

---

[1]: تفسیر ابن عباس: ۱/۲۔

ہے، اور تفریط بھی غلط ہے۔ صحیح راستہ اعتدال والا ہے، آپ جس راستے پر چلنا چاہیں اُس راستہ کی چند علامتیں آپ کو ملیں گی، جن کو دیکھ کر آپ راستہ کی شناخت کرلیں گے، جب بندہ نے حق تعالیٰ سے صراط مستقیم مانگا تو اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کی نشاندہی فرمائی کہ صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے جس میں نہ افراط ہو اور نہ تفریط ہو، اللہ پاک نے کسی قوم کا یہاں نام نہیں لیا، کیونکہ قوموں کا کیا بھروسہ ہے؟ کبھی وہ ہدایت پر ہوتی ہیں تو کبھی گمراہی پر، اس لیے صفات بتلادی گئیں کہ جس راستہ میں یہ صفات ہیں اس راستہ پر چلو۔ ان صفات سے پتہ چل جائے گا کہ فلاں قوم بُری ہے اور فلاں قوم اچھی ہے۔ اگر یہاں مسلمانوں کا نام لیا جاتا تو تمام مسلمان مطمئن ہو جاتے کہ ہم سب سیدھے راستے ہی پر ہیں، ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے صفات کا ذکر فرمایا۔

آپ یہ سن کر حیرت کریں گے کہ قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾[۱]

”بیشک ایمان والے، یہودی، عیسائی، صابی (آتش پرست، مجوسی)، اور جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، اور نیک عمل کرتے ہیں تو ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان پر کوئی خوف بھی نہیں ہو گا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ یہودی اور عیسائی ہونے کا بھی ثواب ملے گا، لیکن ایمان لانے کے بعد، کیونکہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے ہیں، اب اگر یہ لوگ اسلام قبول کرتے ہیں تو گویا انہوں نے دو نبیوں کی

[۱]: البقرۃ:۶۲۔

شریعت پر عمل کیا ہے، اس لئے انہیں سابقہ نبیوں کی شریعت کو ماننے کا بھی ثواب ملے گا۔ اگر انہوں نے اسلام نہ قبول کیا ہو تو وہ کافر ہی رہیں گے۔ کیونکہ آپ کی بعثت کے بعد سابقہ شریعتیں منسوخ ہو گئیں، اس لئے آپ پر بھی ایمان ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔

ایک عجیب نکتہ:

حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بارے میں پانچ الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ ایک ہے ''اللہ'' دوسرا ''ربّ''، تیسرا ''رحمن''، چوتھا ''رحیم'' اور پانچواں ''مالک''۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام اور چار صفات ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ نے بندے کو اس کے مقابلے میں دوسری تین آیتوں میں پانچ چیزیں مرحمت فرمائی ہیں۔ ایک ''عبادت''، دوسری ''استعانت'' جس کا ''ایاك نعبد وایاك نستعین'' میں ذکر ہے، تیسری ''صراط مستقیم'' کی طلب جس کا ''اهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ'' میں ذکر ہے، چوتھی نعمت کی طلب جس کا ''صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ'' میں ذکر ہے۔ پانچویں غضبِ الٰہی سے پناہ، جس کا غیر المغضوب علیھم میں تذکرہ ہے۔ یہ پانچ چیزیں: عبادت، استعانت، ہدایت کی طلب، نعمت کی طلب اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ، اگر ان میں غور کیا جائے تو ان پانچ چیزوں کا تعلق اوپر بیان کی گئی اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات سے ہے۔

عبادت کا اللہ کے ساتھ تعلق ہے کیونکہ عبادت اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور لائق عبادت ہونے کی وجہ سے ہے اس لئے عبادت کا تعلق اللہ سے ہو گا۔ استعانت کا تعلق ربوبیت سے ہے کیونکہ وہ ربّ ہیں اس لیے اُن ہی سے استعانت لی جائے گی۔ طلب ہدایت کا تعلق رحمانیت سے ہے۔ طلب نعمت کا تعلق رحیمیت سے ہے۔ غضب سے بچنے کا تعلق مالک سے ہے، یعنی جس دن ہمیں آپ کے غصہ سے بچنے کی ضرورت ہے

اُس کے مالک آپ ہی ہیں۔ اہل عرب قرآن کریم سن کر انہی نکات کی وجہ سے وجد میں آجاتے تھے، اس میں ایسی باریکیاں ہیں جو صرف عربی داں اور قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے درکار علوم سے وابستہ شخص ہی جان سکتا ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے، تو کفار پس پردہ اپنے گھر کے صحن میں اس کو سنتے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ دیوار کعبہ کے نزدیک اور اپنے گھر کے چبوترے پر بیٹھ کر زور زور سے روتے ہوئے اور دردِ دل کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ جو اُن کی تلاوت سنتا تھا وہ پروانے کی طرح آکر گر جاتا، حتیٰ کہ مشہور یہ ہوا کہ محمد ﷺ کے ساتھ رہ کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی جادوگر ہو گئے ہیں، ایسے ایسے لوگ بھی آئے جن کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی، نیت یہ تھی کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خاتمہ کر دیں، لیکن جیسے ہی وہ لوگ آکر کھڑے ہوئے تھوڑی دیر کے بعد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے تلوار کو نیام میں رکھ کر واپس ہونے لگے۔

انعام کی نسبت اپنی جانب تو غضب کی نسبت کیوں نہیں؟

"صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ" میں اللہ پاک نے انعام کی نسبت اپنی جانب کی ہے، اور "غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ" میں غضب کی نسبت اللہ پاک نے اپنی جانب نہیں کی ہے، حالانکہ انعام اور غضب دونوں اللہ پاک ہی کی طرف سے نازل ہوتے ہیں تو یہ فرق کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شر، غضب اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر نہیں ہے۔ بندہ جب اپنی طرف سے ہدایت کے بجائے ضلالت اور گمراہی کو اختیار کرتا ہے تو اللہ پاک بھی اسے گمراہی پر ڈال دیتے ہیں، اور اپنا غضب ان پر فرماتے ہیں، کیونکہ اللہ پاک کے غضب کو ان لوگوں نے مدعو کیا اور گمراہی والے راستے

کو ان لوگوں نے اختیار کیا، اس لئے اللہ پاک نے غضب کی نسبت اپنی جانب نہیں کی ہے، سوال یہ ہوتا ہے کہ انعام میں اللہ پاک نے اپنی جانب نسبت کیوں کی ؟ حالانکہ انعام کے نزول کا سبب بھی وہی لوگ ہیں، ان لوگوں نے اچھے اعمال کئے تو اللہ پاک نے ان پر انعام کیا، تو یہاں پر اللہ پاک نے نسبت اپنی جانب کیوں کی ؟

اعمالِ خیر کے باوجود بندہ رحمتِ الٰہی کا محتاج ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ بندہ چاہے کتنے ہی نیک اعمال کیوں نہ کرلے انعام اور نعمتوں کا نزول دراصل فضلِ الٰہی کی وجہ سے ہوتا ہے، بندہ اپنے اعمال کے بدلہ اللہ پاک کی نعمت کا حق ادا ہی نہیں کرسکتا، اس لئے نیک اعمال کے بعد بھی اگر فضلِ الٰہی نہ ہو تو وہ فلاح یاب نہیں ہوسکتا، جنت میں نہیں جاسکتا، کیونکہ اگر اللہ پاک کی نعمتوں اور بندہ کے اعمال کا توازن کیا جائے تو اس کی ساری زندگی کی عبادت حق تعالیٰ کی ایک نعمت کا بھی حق ادا نہیں کرسکتی، اس لحاظ سے ہمارے اعمال کا بدلہ جنت نہیں ہوسکتی، لیکن ہمارے ساتھ انعام اور رحمتوں کا جو معاملہ ہو رہا ہے، بخشش اور مغفرت کا جو معاملہ ہو رہا ہے، وہ محض فضلِ الٰہی کی وجہ سے ہو رہا ہے، اس لئے انعام کی نسبت اللہ پاک نے اپنی جانب کردی، لیکن ضلالت اور گمراہی، شر اور غضب خود بندہ کے اختیار کردہ ہیں، ان کے اعمال کے اعتبار سے اللہ پاک نے ان پر غضب کیا، ان کو گمراہی پر ڈال دیا، ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کیا، فضل کا معاملہ نہیں کیا اس لئے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب نہیں کی۔

ہدایت اور ضلالت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے:

اگرچہ ضلالت اور ہدایت اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

﴿مَنۡ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضۡلِلۡهُ ؕ وَمَنۡ يَّشَاۡ يَجۡعَلۡهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ﴾[۱]

۱: الانعام: ۳۹۔

جس کو خدا چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھے راستے پر چلا دے۔
نعمت اُن کا فضل ہے، غضب اور لعنت اُن کا عدل ہے۔ وہ ان کا ظلم نہیں ہے۔

﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾[1]

"تیرا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔"

دوسری بات یہ ہے کہ ضلالت اور گمراہی، شر اور غضب کی نسبت اللہ پاک کی طرف کرنا بے ادبی ہے۔ اگرچہ کہ ان سب کے خالق اور نازل کرنے والے اللہ پاک ہی ہیں، جیسے ارشاد ہے:

﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[2]

"آپ جس کو چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں ذلیل کرتے ہیں، خیر آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔"

شر بھی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، لیکن اللہ پاک نے صرف "بيدك الخير" کہا، بيدك الشر نہیں کہا، کیونکہ شر کو اللہ کی جانب منسوب کرنا بے ادبی ہے۔ اب یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ﴾[3]

"جو چیز تم کو پہنچتی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے پہنچتی ہے۔"

﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ﴾[4]

جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اُسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیدے اُس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ تمام "افعال" اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں، چاہے وہ خیر ہو یا شر، لیکن شر کے پیدا کرنے سے ان کی ذات میں کوئی نقص یا عیب لازم نہیں آتا، لیکن اس شر اور برائی کو ان کی جانب منسوب کرنا برا ہے۔

۱: فصلت:۴۶۔ ۲: آل عمران:۲۶۔ ۳: التغابن:۱۱۔ ۴: الاعراف:۱۸۶۔

اللہ تعالیٰ تاثر سے پاک ہیں

اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے ”غیر المغضوب علیھم“ فرمایا، ”غیر الذین غضبت علیھم“ نہیں فرمایا، اور بتادیا کہ غضب کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب مناسب نہیں ہے، کیونکہ غضب کے ذمہ دار وہ خود ہیں، انہوں نے خود اپنے آپ کو غضب کا مستحق بنایا ہے۔ نیز غضب ایک اثر ہوتا ہے جو نا مناسب اور ناگوار بات یا عمل پر پیش آتا ہے، اور اللہ پاک اس طرح کے تاثر سے پاک ہیں، کیونکہ تاثر اور انفعالی کیفیت عیب ہے، کیونکہ کسی چیز کے اثر کو قبول کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ دوسری چیز اس پر حاوی ہوگئی۔ حق تعالیٰ پر کون حاوی ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے حق تعالیٰ کی ذات عیب دار ہو جائے گی، جبکہ وہ ذات اثر قبول کرنے سے مستغنی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جس پر غضب کرتے ہیں وہ اپنی مرضی اور مشیت سے کرتے ہیں۔ کسی بات یا عمل کا اثر قبول کرنے کی وجہ سے نہیں۔ نصوص میں جب اس طرح کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں تو وہاں اس کے حقیقی معنیٰ اور کیفیت مراد نہیں ہوتی، بلکہ اس لفظ کی غایت اور اس کا انجام مراد ہوتا ہے، اب جن نصوص میں یہ مضمون ہے کہ اللہ پاک فلاں فلاں پر غصہ ہوگئے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ پاک نے ان کو سزا دی، ان پر عذاب بھیجا وغیرہ وغیرہ۔

مغضوبین سے متعلق آیاتِ مبارکہ:

اب گمراہ لوگ کون کون ہیں؟ ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب کیوں نازل ہوا؟ اور ان کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور قرآن مجید ان کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ تو اس کی کچھ تفصیل ہم آپ کے سامنے ذکر کرتے ہیں، چنانچہ مغضوبین کے بارے اولا چند آیات ذکر کئے جاتے ہیں، ایک جگہ ارشاد ہے:

غیر اللہ کی پرستش غضبِ الٰہی کا سبب ہے:

﴿مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوۡتَ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنۡ سَوَاءِ السَّبِيۡلِ﴾[1]

وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی اور جن پر وہ غضبناک ہوا اور (جن کو) ان میں سے بندر اور خنزیر بنادیا اور جنہوں نے شیطان کی پرستش کی ایسے لوگوں کا برا ٹھکانا ہے۔ اور وہ سیدھے راستے سے بہت دور ہیں۔

اس آیت میں اللہ پاک نے شیطان کی پرستش کو غضب کا سبب قرار دیا ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ سَيَنَالُهُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ﴾[2]

"جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا تھا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی)"

اس آیت میں بچھڑے کی عبادت کو غضب کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

اسی مضمون کا ذکر دوسری آیت میں ہے:

﴿قَالَ قَدۡ وَقَعَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ رِجۡسٌ وَّغَضَبٌ أَتُجَادِلُوۡنَنِيۡ فِيۡ أَسۡمَاءٍ سَمَّيۡتُمُوۡهَا أَنۡتُمۡ وَآبَاؤُكُمۡ مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطَانٍ﴾[3]

"ہود علیہ السلام نے کہا کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب کا نازل ہونا مقرر ہو چکا ہے کیا تم مجھ سے ایسے ناموں کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے اپنی طرف سے رکھ لئے ہیں جن کی خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی؟

یہ مشرکین اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو پوجتے ہیں حالانکہ حقیقت میں صرف ایک نام ہے جس کی پرستش ہوتی ہے، جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پوج رہے ہیں یا حضرت

---

[1]: المائدۃ:۶۰۔ [2]: الاعراف:۱۵۲۔ [3]: الاعراف:۷۱۔

مریم علیہا السلام کے اسٹیچو (Statue) بنا رکھے ہیں اور ان سے مدد مانگتے ہیں، نہ وہ مریم ہے اور نہ عیسیٰ ہے۔ اگر وہ پتھر سے بنا ہوا ہے تو وہ پتھر ہے یا سیمنٹ ہے، لکڑی سے بنا ہوا ہے تو وہ لکڑی ہے، لکڑی کو صرف مریم کا نام دینے سے لکڑی مریم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح بت ہیں، مشرکین کے پاس جو بت تھے وہ الگ ہیں اور آج ہندوؤں کے پاس جو بت ہیں وہ الگ ہیں چاہے کوئی بھی ہو رام ہو، کرشنا ہو، گنیش ہو، کالی دیوی ہو یا گوری دیوی ہو، کچھ بھی ہو، ان سب کی حقیقت یا تو پتھر ہوتا ہے، یا لکڑی ہوتی ہے، ان کے نام رکھنے سے وہ معبود نہیں ہو جاتے۔

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی پرستش اور عبادت اور راہِ حق سے انحراف اور غیر اللہ کو پکارنا اللہ پاک کے غضب کا سبب ہے۔ البتہ بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

مجبوری میں کلمۂ کفر کی اجازت ہے

﴿مَنۡ كَفَرَ بِٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ إِيمَٰنِهِۦٓ إِلَّا مَنۡ أُكۡرِهَ وَقَلۡبُهُۥ مُطۡمَئِنُّۢ بِٱلۡإِيمَٰنِ وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِٱلۡكُفۡرِ صَدۡرٗا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٞ مِّنَ ٱللَّهِ﴾[۱]

”وہ لوگ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بڑا سخت عذاب ہو گا۔ البتہ جس آدمی کو کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ دل کی تصدیق کے ساتھ ظاہرا کلمۂ کفر کہے تو اس کی اجازت ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کو معاف کر دیں گے، لیکن جو اپنے کھلے دل سے کلمۂ کفر کہے گا اللہ تعالیٰ کا اُس پر غضب ہو گا۔

۱: النحل:۱۰۶۔

یہودی ہمیشہ ذلیل وخوار ہی رہیں گے

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوْا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ، وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾[1]

"ذلت ان پر چھاپ دی گئی جہاں کہیں بھی پائے جاویں گے بجز اس کے کہ یہ خدا اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آجائیں اور یہ لوگ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے یہ اس لئے کہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور (اسکے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے یہ اس لیے کہ یہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے"

یہ طے ہے کہ یہودی قیامت تک خود سے اپنی کوئی امیج (Image) نہیں بنا سکتے، اُن کو یا تو مسلمانوں کا یا عیسائیوں یا کسی اور کا سہارا لینا ہوگا۔ کیونکہ قرآن کریم میں یہ مضمون موجود ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کی مدد کے بغیر بھی وہ بھاری نظر آتے ہیں۔ اس کا فلسفہ کچھ اور ہوتا ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھیں، کہ اگر آپ کا بچہ آپ کو بہت زیادہ ستا رہا ہے، اور آپ کا کہنا نہیں مان رہا ہے اور ہمیشہ بال (Ball) لے کر کھیل رہا ہے۔ آپ نے غصہ سے وہ بال کسی راستہ چلتے ہوئے آدمی کو دے دیا، ظاہر ہے کہ آپ نے جو بال اسے دیا تو وہ اس کی اہلیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس سے ضرر کو ختم کرنے کے

---

[1]: آل عمران: ۱۱۲۔

لئے دیا، ایسے ہی مسلمانوں سے حکومت لے کر جو دوسروں کو دی گئی ہے اوران کا جو ہم پر غلبہ نظر آتا ہے اُن کے استحقاق کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہمارے نااہل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، تاکہ کم از کم مسلمان سیدھے راستے سے نہ ہٹیں، دین پر قائم رہیں، اور اپنی آخرت کا انتظام کرلیں، اسی مضمون سے متعلق ایک اور ارشاد ہے:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ۱

”آخر کار ذلت ورسوائی اور محتاجی وبے نوائی ان سے چمٹا دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوگئے، یہ اس لئے کہ وہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے“

حد سے تجاوز بھی غضب کا سبب ہے:

﴿وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى﴾ ۲

”(جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ) اور اس میں حد سے نہ نکلنا ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاک ہوگیا“

مغضوبین سے دوستی کی اجازت نہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ ۳

”اے ایمان والو! تم اس قوم سے دوستی مت کرو جس پر خدا کا غضب ہے۔“ اس کی تفسیر میں علماء نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہودی ہیں۔ یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا یہ بات قرآن پاک میں بہت سی جگہوں پر ہے۔

گمراہ لوگوں سے متعلق چند آیاتِ مبارکہ:

اب گمراہ لوگوں کے بارے میں بھی ہم کچھ مذاکرہ کرتے ہیں کہ اللہ پاک نے کن کن لوگوں کو گمراہ قرار دیا اور اس کے اسباب کیا ہیں؟

۱: البقرۃ:۶۱۔ ۲: طٰہٰ:۸۱۔ ۳: الممتحنہ:۱۔

شرک سب سے بڑی گمراہی:

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾[1]

اور جس نے خدا کے ساتھ شریک بنایا وہ راستے سے دور (گمراہی میں) جا پڑا''

دشمنانِ خدا سے تعلقات جائز نہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَآ أَخْفَيْتُمْ وَمَآ أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾[2]

''اے مومنو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ، تم تو ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو اور وہ دین حق سے جو تمہارے پاس آیا ہے منکر ہیں۔ اور اس وجہ سے کہ تم اپنے پروردگار خدائے تعالیٰ پر ایمان لائے ہو وہ پیغمبر کو اور تم کو جلاوطن کرتے ہیں، اور تم ان کی طرف پوشیدہ پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو جو کچھ تم مخفی طور پر اور جو علی الاعلان کرتے ہو وہ مجھے معلوم ہے۔ اور جو کوئی تم میں سے ایسا کرے گا تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا''

کیا مطلقاً غیر مسلموں سے تعلق ناجائز ہے؟

اس آیت مبارکہ میں اللہ پاک نے غیر مسلموں سے تعلق اور دوستی کو ناجائز قرار دیا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا کسی بھی حال میں کسی بھی طرح کی دوستی ان کے

---

[1]: النساء:۱۱۶۔ [2]: الممتحنہ:۱۔

ساتھ نہیں کی جاسکتی؟ تو یاد رکھئے کہ ان کے ساتھ تعلق کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) ''قلبی لگاؤ'' یہ ان تینوں سے بغیر کسی قید کے مطلقاً حرام ہے۔ کسی یہودی سے، کسی عیسائی سے اور کسی مشرک سے دلی چاہت اختیار نہیں کی جاسکتی، اس میں اندیشہ ہے کہ اس کے دل سے ایمان نکل جائے، کیونکہ اس میں کفر پر رضا کا امکان ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ ہر قسم کی محبت پسند نہیں فرماتے، اور نہ ہر ایک سے محبت پسند فرماتے ہیں، آدمی کسی سے محبت اور تعلق رکھے تو اللہ ہی کے لئے رکھے، اور کسی سے نفرت کرے تو اللہ ہی کے لئے کرے، یہی ایمان کا تقاضہ ہے اور آدمی کے کامل مومن ہونے کی نشانی ہے۔

بعض ناواقف لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو سب سے محبت کرنی چاہئے، سب سے مل جل کر رہنا چاہئے، یہ غلط ہے، اس میں بھی شریعت نے حدود بیان کئے ہیں، اللہ پاک تو فاسق اور فاجر کو ناپسند کرتے ہیں، اور یہ ان سے محبت اور ان سے میل جول کے داعی ہیں، جو لوگ اللہ کے فرمانبردار ہیں اُن سے مل جل کر رہنا چاہئے، ان سے قلبی لگاؤ رکھنا چاہئے، اور جو اللہ کے ماننے والے نہیں ہیں اُن سے محبت نہیں کرنی ہے، اُن سب سے قلبی تعلق رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مَنۡ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبۡغَضَ لِلّٰهِ وَاَعۡطٰى لِلّٰه فَقَدۡ اِسۡتَكۡمَلَ الۡاِيۡمَانَ'' [۱]

جو اللہ کے لئے محبت کرے اور اللہ ہی کے لئے بغض کرے اور اللہ ہی کیلئے دے اور اللہ ہی کیلئے منع کرے تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل کرلیا۔

کافروں کے ساتھ مدارات کا حکم:

غیر مسلمین کے ساتھ تعلق کی ایک صورت ''مدارات'' ہے، یعنی اسلامی اخلاق کا اظہار کرنا اور اپنی طرف سے اُن کو کسی طرح کی اذیت سے محفوظ رکھنا۔ یہ بھی شریعت

---

[۱] سنن ابی داود: کتاب السنة: باب الدليل على زيادة ايمانه ونقصانه۔

میں ضروری ہے۔ اور پھر اس مدارات کے بھی دو مرحلے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ انسان ہونے کی وجہ سے جو حقوق ایک دوسرے پر ہوتے ہیں اُس کا لحاظ رکھا جائے، انسان تو انسان شریعت میں تو جانوروں کے ساتھ بھی صلہ رحمی مطلوب ہے، ایک عورت کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کے اس نے کتّے کو پانی پلایا تو اس کی بخشش ہو گئی اور کسی عورت نے بلی کو باندھ دیا وہ کھانے پینے سے محروم رہی تو اس کو عذاب ہو گیا۔ اس لئے انسان ہونے کے ناطے غیر مسلموں کی رعایت کی جائے گی، اور ان کی حق تلفی نہیں کی جائے گی، چاہے وہ مشرک ہو، یا کافر ہو، یا یہودی ہو یا عیسائی ہو۔

غیر مسلموں سے مدارات کی اجازت کیوں؟

اس مدارات کی دوسری صورت یہ ہے کہ ان کے ساتھ تعلق کا اظہار خود سے کیا جائے اور اس میں پہل کی جائے، ان کو کچھ ہدیہ اور تحفہ دیا جائے، ان کی دعوت قبول کی جائے، اور اپنی تقریبات میں ان کو شامل کیا جاے، اسلام میں اس ظاہری برتاؤ کی تو اجازت ہے لیکن دل میں ان کی بدعقیدگی اور برے اعمال سے نفرت ضروری ہے، اگر دل اور ظاہر دونوں برابر ہو گئے تو یہ حرام ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ ظاہری برتاؤ کی کیوں اجازت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ ان سے اخلاق کے ساتھ پیش آئیں گے، اور اچھا برتاؤ کریں گے تو وہ لوگ اسلام سے مانوس ہوں گے اور اس سے متاثر ہوں گے۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے بہتر اخلاق کی وجہ سے اسلام بھی قبول کر لیں۔ اس کے بجائے اگر آپ لڑائی اور جھگڑا مول لیں تو وہ اسلام اور مسلمان دونوں کو بدنام کریں گے، اور ان کے دلوں میں اسلام سے متعلق نفرت بیٹھ جائے گی، اور وہ اسلام سے قریب ہونے کے بجائے دور ہو جائیں گے، اس لئے اس ظاہری رواداری اور مدارات کی تو اجازت ہے۔ لیکن قلبی اعتبار سے اس کی گنجائش نہیں ہے۔

﴿وَمَنۡ یَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَإِنَّهٗ مِنۡهُمۡ، إِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ﴾ ۱

"جو شخص تم میں سے انکو دوست بنائیگا وہ بھی انہیں میں سے ہو گا۔(بیشک خدا ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا)"۔اس آیات میں قلبی لگاؤ سے متعلق ہی ارشاد فرمایا ہے۔

راہِ حق سے روکنا بھی ضلالت ہے:

﴿إِنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ قَدۡ ضَلُّوۡا، ضَلٰلًا بَعِیۡدًا﴾ ۲

" جن لوگوں نے کفر کیا اور لوگوں کو خدا کے راستے سے روکا تو وہ راستے سے بھٹک کر دور جا پڑے"

خواہشات کی پیروی صریح گمراہی ہے

﴿أَفَرَأَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلۡمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنۡ یَّهۡدِیۡهِ مِنۡ بَعۡدِ اللّٰهِ أَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ﴾ ۳

"بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے گمراہ ہو رہا ہے تو خدا نے بھی اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اب خدا کے سوا اس کو کون راہ راست پر لا سکتا ہے؟ بھلا تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے"

جو لوگ نفسانی خواہشات پر چلتے ہیں ان کا خدا ان کی اپنی خواہش ہے،وہ اسی کی پوجا کرتے ہیں، اسی کی مانتے ہیں، آدمی میں خواہش کا ایک عجیب مادّہ ہے۔ جسے چاہت یا طبیعت کا میلان کہتے ہیں۔ اگر آدمی اپنی چاہت پر چلے گا تو کبھی بھی سیدھے راستے پر نہیں چل سکتا، اسلام کہتا ہے کہ اپنی مرضی چھوڑ کر رب کی مرضی پر چلو۔

۱: المائدۃ:۵۱۔ ۲: النساء:۱۶۷۔ ۳: الجاثیہ:۲۳۔

اللہ پاک کا حضرت داوٗد علیہ السلام سے خطاب

حق تعالیٰ شانہ نے داوٗد علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ [۱]

"اے داوٗد ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے، تم لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی، جو لوگ خدا کے راستے سے بھٹکتے ہیں انکے لئے سخت عذاب تیار ہے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا"

مفسرین نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ نبی کی طبیعت ہی سیدھی ہوتی ہے، ان کی طبیعت اور فطرت سلیم ہوتی ہے، سارے نبی متبع ہی ہوتے ہیں اور جس کی طبیعت سیدھی ہوتی ہے اُس کی خواہش بھی سیدھی ہی ہوتی ہے۔ جب ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر تم اپنی خواہش پر چلوگے تو صحیح راستے پر نہیں رہ سکوگے تو غیر نبی جس کی طبیعت میں کجی ہوتی ہے وہ اپنی خواہش پر چلے گا تو سیدھے راستے پر کیسے چل سکتا ہے؟

﴿وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ﴾ [۲]

"اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ اس طرح خدا ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے۔"

اُس کے دل میں ایک قسم کی تنگی پیدا ہو جاتی ہے، واضح بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

گمراہی بندہ کے اختیار کرنے سے آتی ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ﴾ [۳]

۱: ص:۲۶۔ ۲: الانعام:۱۲۵۔ ۳: التوبۃ:۱۱۵۔

”اور خدا ایسا نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کردے جب تک کہ ان کو وہ چیز نہ بتادے جس سے وہ پرہیز کریں۔ اگر آدمی سمجھدار ہے تو وہ ہدایت قبول کرلیتا ہے۔

﴿فَإِمَّا يَأۡتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقَىٰ﴾ ۱؎

”پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا“

﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ أَن تَضِلُّوا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٌ﴾ ۲؎

”یہ احکام خدا تم سے اسلئے بیان فرماتا ہے کہ بھٹکتے نہ پھرو۔ اور خدا ہر چیز سے واقف ہے“

حدود سے تجاوز اور شک بھی گمراہی ہے:

﴿كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابٌ﴾ ۳؎

”اسی طرح خدا اس شخص کو گمراہ کردیتا ہے جو حد سے نکل جانے والا اور شک کرنے والا ہو“

﴿وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظَّالِمِينَ وَيَفۡعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ﴾ ۴؎

”اور خدا بے انصافوں کو گمراہ کردیتا ہے۔ اور خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“

﴿وَمَن يَعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا﴾ ۵؎

”اور جو کوئی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہ ہوگیا“

ہدایت کے لئے طلب درکار ہے:

﴿قُلۡ إِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهۡدِي إِلَيۡهِ مَنۡ أَنَابَ﴾ ۶؎

”خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ اور جو (اسکی طرف) رجوع ہوتا ہے اسکو اپنی طرف کا راستہ دکھاتا ہے“

۱؎ طہ-۱۲۳۔ ۲؎ النساء: ۱۷۶۔ ۳؎ غافر: ۳۴۔ ۴؎ ابراہیم: ۲۷۔ ۵؎ الاحزاب: ۳۶۔ ۶؎ الرعد: ۲۷۔

ہر آدمی کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتے، بلکہ جس میں طلب ہوتی ہے اور جو جس میں چاہت ہوتی ہے اُس کو اللہ تعالیٰ ہدایت سے نوازتے ہیں۔ تم اپنی طرف سے کچھ کوشش تو کرو، محنت تو کرو، قدم تو آگے بڑھاؤ پھر حق تعالیٰ کی توفیق دیکھو۔

دینی معاملہ میں اکثریت کو نہیں بلکہ نصوص کو دیکھا جائے گا:

﴿وَإِنۡ تُطِعۡ أَكۡثَرَ مَنۡ فِي الۡأَرۡضِ يُضِلُّوكَ عَنۡ سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ [1]

”اور اکثر لوگ جو زمین پر آباد ہیں گمراہ ہیں اگر تم ان کا کہا مان لوگے تو وہ تمہیں خدا کا راستہ بھلادیں گے۔ یہ محض خیال کے پیچھے چلتے ہیں اور نرے اٹکل کے تیر چلاتے ہیں“

قرآن کہتا ہے کہ زمین پر اکثر لوگ غلط اور جاہل ہیں، راہِ حق سے منحرف ہیں، کسی دینی معاملہ میں اکثریت کو دیکھ کر ان کے راستہ پر اگر کوئی چلے گا تو وہ گمراہ ہو جائے گا، کیونکہ اگرچہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں، لیکن ان کا عمل شریعت کے خلاف ہے، اس اکثریت کے غلط راستہ پر چلنے کی وجہ سے وہ راستہ صحیح نہیں ہو جاتا، اس لئے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اکثریت کس راستہ پر ہے؟ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں قرآن وحدیث کیا کہہ رہے ہیں؟ اللہ اور اس کا رسول کیا کہہ رہے ہیں؟ پھر ان کی تعلیمات کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ کیونکہ ان کا راستہ صحیح اور ہدایت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس لئے فرمایا:

”اگر تم زمین والوں کی اکثریت کی اطاعت کروگے تو وہ تمہیں بھٹکا دیں گے۔“

رحمتِ خداوندی سے مایوسی بھی گمراہی ہے:

﴿وَمَنۡ يَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَةِ رَبِّهٖۤ إِلَّا الضَّآلُّوۡنَ﴾ [2]

اور پروردگار کی رحمت سے مایوس گمراہ لوگ ہوتے ہیں۔ مایوس ہونا بھی ضلالت کی نشانی ہے۔ آدمی چاہے کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو، اور کتنا ہی گمراہی میں کیوں نہ پھنس چکا

---

[1]: الانعام:۱۱۶۔ [2]: الحجر:۵۶۔

ہو تب بھی اللہ تعالیٰ سے یہ اُمید رکھے کہ حق تعالیٰ اُس کو صحیح راستہ بتائے گا۔ اپنی رحمت سے معاف فرمائے گا۔

غیر اللہ کو پکارنا گمراہی ہے:

﴿ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيْبُ لَهُ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُوْنَ ﴾[۱]

”اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے اور انکو ان کے پکارنے ہی کی خبر نہ ہو“

اسلام کے علاوہ دوسرا راستہ گمراہی ہے:

﴿قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ﴾[۲]

اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے باطل خیالات کی اتباع نہیں کروں گا، اگر میں ایسا کروں تو میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا اور میں ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہیں ہوں گا۔

ذکر اللہ سے غافل دل بھی گمراہ ہیں:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ﴾[۳]

”پس ان پر افسوس ہے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں یہی لوگ صریح گمراہی میں ہیں“

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں اللہ پاک نے مغضوبین اور گمراہ لوگوں کا ذکر فرمایا ان کی گمراہی اور ان پر غضب کے اسباب بیان کئے ہیں، تاکہ لوگ اس راستہ سے بچیں اور ان اسباب کو اختیار کرنے سے رک جائیں، حق تعالیٰ شانہ ہمیں اُن تمام بری صفات اور ان برے اسباب سے بچائے جن کی وجہ سے سابقہ قوموں کو گمراہ قرار دیا گیا، اور ان پر اللہ پاک نے اپنا غضب نازل کیا۔ اور ہمیں منعم علیہم میں شامل فرمادے۔ (آمین)

۱: الاحقاف:۵۔ ۲: الانعام:۵۶۔ ۳: الزمر:۲۲۔

سورۂ فاتحہ کے دروس میں سے آج ہمارا آخری درس ہے۔ اب تک آپ کے سامنے ہر آیت کی کچھ تفصیل بیان کی گئی تھی، اب اس کا اجمالی خاکہ ہم بیان کرتے ہیں تاکہ اس میں بیان کئے گئے مضامین کا خلاصہ یاد رہے۔

’’سورۂ فاتحہ‘‘ کا خلاصہ:

سورۂ فاتحہ در اصل پورے قرآن پاک کا متن اور سرخی ہے۔ علماء نے فرمایا کہ قرآن پاک میں جتنے مضامین ہیں اُن سب کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں فرمادی۔ جب کوئی کتاب لکھی جاتی ہے تو اُس کے شروع میں تمہید لکھی جاتی ہے کہ یہ کتاب کیوں لکھی گئی؟ اس کتاب میں کیا کیا مضامین ہیں؟ یہی نوعیت سورۂ فاتحہ کی بھی ہے، کیونکہ اس میں حق تعالیٰ شانہ نے دین کے اصول، فروع، عقائد، عبادات، تشریعات، توحید، الوہیت، ربوبیت، صفاتِ باری، قیامت، عبادت، استعانت، ہدایت، دعا، استقامت، رسالت، موافقت منعم علیہم (انبیاء، صدیقین، شہداء وصلحاء) صراطِ مستقیم کی طلب اور رہنمائی، گمراہ اور اللہ کے راستہ سے انحراف کرنے والوں سے بچنے کا ذکر فرمایا ہے۔

اللہ پاک نے اس صورت میں قرآن مجید کا خلاصہ بیان فرمایا ہے، جیسا کہ اس کی وضاحت اس سے پہلے کی گئی ہے، گویا مختصر الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں اللہ پاک نے قرآن مجید میں تین قسم کے مضامین بیان فرمائے ہیں (۱) عقائد (۲) احکام (۳) وعظ اور نصیحت۔ اور سورۂ فاتحہ میں بھی اجمالا ان کا ذکر موجود ہے، اسی لئے اس کو پورے قرآن کا خلاصہ کہا جاتا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین اور الرحمن الرحیم کا خلاصہ:

اب ہم اس سورت کے خلاصہ ٔ قرآن ہونے کا تجزیہ کرتے ہیں۔

چنانچہ ’’بِسۡمِ اللّٰهِ ‘‘ میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور بے شمار اسماءِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔ اور ’’اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ‘‘ میں اللہ پاک کے صفات کمالیہ کی طرف اشارہ ہے اور ان

تمام صفات کی طرف اشارہ ہے جن کا دوسری سورتوں میں ذکر کیا گیا ہے، جیسے آیۃ الکرسی، سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں، سورۂ اخلاص، وغیرہ وغیرہ۔ اور "اَلْحَمْدُ" ان تمام نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جن کا بیان کرنا محال ہے، آسمان وزمین، عناصر و کواکب اور انسانوں سے متعلق جو ہزاروں لاکھوں نعمتیں ہیں ان سب کی طرف اشارہ ہے۔

"رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" میں تربیت کی ہزاروں اقسام کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ حیوانات کی تربیت کا نظام الگ ہے، جمادات کی تربیت کا نظام الگ ہے، نباتات کی تربیت کا نظام الگ ہے، اور پھر ان کی بے شمار اقسام ہیں، حیوان حیوان میں فرق ہے۔ نباتات میں فرق ہے، کچھ معروشات ہیں تو کچھ غیر معروشات ہیں، کچھ بیل دار ہیں تو کچھ غیر بیل دار ہیں، کچھ سیدھے جانے والے ہیں، کچھ پھیلنے والے ہیں، اور کچھ زمین پر سونے والے ہیں، کچھ ہمیں محسوس ہوتے اور کچھ محسوس نہیں ہوتے، ہر ایک کا نظامِ تربیت الگ ہے۔ حق تعالیٰ نے ان کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور یہ سب ان کے رحم کی وجہ سے ہے۔

﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کا خلاصہ:

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں نفوس کو پیدا کرنے کے بعد اُن کی بقا، سعادت، شقاوت، اعمال، موت اور مابعد الموت سزا اور جزا کی تفصیلات، جنت و جہنم کی تفصیلات، ثواب و عذاب کی تفصیلات، میدانِ حشر کے حالات، حساب و کتاب، میزان، وغیرہ ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ مالک ہی دراصل ان امور کو انجام دے سکتا ہے۔

"اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کا خلاصہ:

اللہ پاک نے جن طاعات کا ہمیں حکم دیا ہے مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اور کثرتِ ذکر وغیرہ ان سب کی طرف "ایاک نعبد" میں اشارہ ہے، جیسے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا﴾[1] اللہ کا خوب ذکر کرو، نماز سے متعلق فرمایا: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾[2] جہاد سے متعلق فرمایا: ﴿إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا﴾[3] "جب تم دُشمنوں سے بھڑ جاؤ اور دُشمنوں سے تمہاری ملاقات ہو جائے تو جم کر رہنا اور پیر مت اُکھاڑنا اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا"، حج سے متعلق فرمایا: ﴿فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ﴾[4]

"جب تم عرفات کے فریضے سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو" روزوں کے متعلق فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ الخ﴾[5]

غرض یہ کہ قرآن پاک میں جتنی عبادات اور طاعات کا حکم ہے وہ سب نعبد میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تمام عبادات، ان کے ارکان، شرائط، سنن، آداب اور مستحبات کی طرف اشارہ ہے۔

"اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کا خلاصہ:

نَسْتَعِيْنُ میں انسانی زندگی کے تمام مراحل میں چاہے وہ دینی ہوں یا دنیوی استعانت اور مدد کا اشارہ ہے، کیونکہ اللہ پاک کی مدد اور استعانت کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، اور استعانت کی جتنی چیزیں اور جتنی صورتیں ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں، ہمارے موجودہ زمانے کی تمام صنعتیں، فیکٹریاں وغیرہ سب نستعین میں شامل ہیں۔ ایک ہے براہِ راست اللہ تعالیٰ کا مدد کرنا اور ایک ہے جن ذرائع سے اللہ تعالیٰ کوئی کام بناتے ہیں اُن ذرائع کو سجھانا، یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی مدد ہے۔ جیسے زمین سے غلہ نکالنے

۱: الاحزاب: ۴۱۔ ۲: طٰہٰ: ۱۴۔ ۳: الانفال: ۴۵۔ ۴: البقرۃ: ۱۹۸۔ ۵: البقرۃ: ۱۸۵۔

کے لئے اس کے اسباب کو سمجھانا کہ زمین سے غلہ اس طرح نکالا جاتا ہے، اس چیز سے یہ نفع اٹھایا جاسکتا ہے، یہ چیز اس میں کار آمد ہو سکتی ہے، یہ بھی استعانت ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی عقل اور دماغ کو ایسا بنایا اور اس کو ایسے تجربات سے گذارا کہ اُس کو معلوم ہو گیا کہ اس موجودہ دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل اور اُن کے طے شدہ خزانوں کو لینے کے لیے کیا کیا راستے اختیار کیے جاسکتے ہیں، اب برق کے ذریعے، بھاپ کے ذریعے، اسٹیل کے ذریعے، مختلف قسم کی دھاتوں کے ذریعے انسان کیسے کیسے کارنامے انجام دے رہا ہے، یہ سب استعانت میں داخل ہیں۔ اس لیے کہ اس میں آدمی کا جتنا کام بنتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہی سے بنتا ہے۔ وہ کام جس راستے سے بنتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا سمجھایا ہوا اور سجھایا ہوا راستہ ہوتا ہے۔

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کا خلاصہ:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ میں عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاقیات، سیاست وغیرہ ان تمام مسائل میں راہِ حق کی طلب اور رہنمائی کی طرف اشارہ موجود ہے، قرآن پاک کا ایک بڑا حصہ ”اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ کے ذیل میں آتا ہے۔

﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کا خلاصہ:

قرآن پاک کی وہ آیات یا وہ سورتیں جن میں انبیاء علیہم السلام کے قصص موجود ہیں، جن میں اللہ پاک نے انبیاء اور اپنے خاص بندوں پر انعامات کا ذکر فرمایا ہے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ وغیرہ ان سب کی طرف ”صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ میں اشارہ ہے۔ گویا نبوت، ولایت، شریعت اور عقائد کے مباحث کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ”منعم علیھم“ انہی صفات کے ساتھ متصف حضرات تھے، دولت، عزت، صحت، شان وشوکت یہ چیزیں

انعام کی بنیاد نہیں ہیں، اس لیے أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ کے مباحث میں مباحثِ نبوت، مباحثِ ولایت، مسائل شریعت، مسائل ادیان وعقائد آئیں گے۔

﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ﴾ کا خلاصہ

قرآن پاک کی وہ آیات جن میں کفار اور مشرک قوموں کی ضلالت و گمراہی، ہلاکت وبربادی بدعات اور خرافات کا ذکر ہے، مثلاً قومِ نوح، قومِ فرعون، قومِ ثمود، قوم عاد، قومِ لوط، قومِ شعیب، اصحابِ ایکہ، اصحابِ فیل، وغیرہ وغیرہ ان سب کی طرف ''غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ ''میں اشارہ ہے۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ سورۂ فاتحہ میں اللہ پاک نے کتنے علوم بیان کئے ہیں؟ کتنے علوم کا احاطہ اس کے اندر ہے، اسی لئے مفسرین نے کہا ہے کہ سورۂ فاتحہ پوری قرآن پاک کا خلاصہ ہے، کیونکہ قرآنِ پاک کے سارے مضامین کی طرف بلکہ سارے دین کی طرف اس سورت میں اشارہ ہے۔

''تفسیر حقانی'' کے مصنف (مولانا ابو محمد عبد الحق حقانی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ) نے ان سب کا تقابل کرکے بتایا ہے۔ اسی لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خاص خزانے سے ایک ایسی سورت عطا فرمائی ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہیں دی گئی، ایسی سورت نہ تورات میں اُتری، اور نہ انجیل میں اور نہ زبور میں۔

مسئلۂ آمین:

یہ سورۂ فاتحہ کی کچھ تفصیل آپ کے سامنے ذکر کی گئی، اس سے متعلق ایک اور مسئلہ جو ہمارے نوجوانوں میں بڑا ہی زیرِ بحث ہے اس کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، اور وہ ہے مسئلۂ آمین کہ آیا نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد آمین آہستہ کہنا چاہئے یا بلند آواز سے؟ اس میں ہمارے درمیان کافی اختلاف چل رہا ہے اس لئے اس کی کچھ تفصیل بھی

گوش گزار ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کی تکمیل پر آمین کہنا مسنون ہے اوراحادیث میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب میں نے سورۂ فاتحہ ختم کی تو جبرئیل علیہ السلام نے مجھے تلقین کی کہ آپ آمین فرمائیں، لہٰذا آپ نے آمین فرمائی۔[۱]

آمین کے معنی ہیں "استجب دعاءنا" (اے اللہ ہماری دعا قبول فرما)۔ آمین دعا ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے، "وَقَالَ عَطَاءٌ: آمِينَ دُعَاءٌ"[۲] اس لفظ کی تحقیق میں بعض کہتے ہیں کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے، لیکن علماء نے سریانی زبان کا لفظ ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔

آمین کے بارے میں ایک یہودی کی شہادت:

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی مسجد کے پاس سے گزرا، اس وقت لوگ آمین کہہ رہے تھے، اس نے جب آمین سنا تو کہا وَالَّذِي عَلَّمَكُمْ آمِينَ، إِنَّكُمْ لَعَلَى الْحَقِّ کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے تم کو آمین سکھائی تم حق پر ہو۔[۳]

آمین کہنے کی فضیلت:

ایک صحابی رضی اللہ عنہ بڑی الحاح وزاری سے دعا کررہے تھے، آپ ﷺ قریب سے گزرے تو ان کی دعا کی آوز آئی، آپ رک کر ان کی دعا کو سننے لگے، پھر فرمایا کہ ان کی دعا قبول ہو جائے گی اگر انہوں نے دعا کو صحیح طور پر مکمل کیا اور مہر لگائی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! دعا کو کس چیز کے ذریعہ مہر لگائی جاتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دعا کے آخر میں آمین کہہ کر۔[۴]

---

[۱]: مصنف ابن ابی شیبہ: باب ماذکر وافی آمین ومن کا یقولہا۔ [۲]: صحیح بخاری: باب جہر الامام بالتامین۔
[۳]: المطالب العالیۃ: کتاب الصلاۃ/باب صفۃ الصلاۃ۔ [۴]: سنن ابی داؤد: کتاب الصلاۃ/باب التامین وراء الامام۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جب امام ولاالضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔ اس لیے کہ اس وقت فرشتے بھی آمین کہتے ہیں، اگر فرشتوں کی آمین کے ساتھ تمہاری آمین مل گئی تو تمہارے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ کیونکہ فرشتوں کی دعا رد نہیں کی جاتی، اس لئے اگر تمہاری آمین ان کی آمین سے مل جائے تو تمہاری مغفرت ہو جائے گی۔[1]

آمین کس کا وظیفہ ہے؟

پھر اس میں اختلاف ہے کہ آمین کہنا کس کا وظیفہ ہے؟ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ آمین کہنا مقتدی اور امام دونوں کا وظیفہ ہے، اور دونوں کے لئے سنت ہے۔

حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”قال رَسُولُ اللهِ ﷺ: ”إِذَا قَالَ الْإِمَامُ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ فَقُولُوا: آمِينَ؛ فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَقُولُ: آمِينَ، وَإِنَّ الْإِمَامَ يَقُولُ: آمِينَ، الخ“[2]

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو اسلئے کہ ملائکہ آمین کہتے ہیں اور امام بھی آمین کہتا ہے جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو گی اس کے سابقہ گناہ معاف ہوں گے۔

یہ روایت صراحت کے ساتھ بتلا رہی ہے کہ امام بھی آمین کہے گا، نیز بخاری اور ترمذی شریف میں بھی امام کے آمین کہنے کی صراحت مروی ہے، اس لئے امام اور مقتدی دونوں آمین کہیں گے۔

آمین بالجہر ہے یا بالسر؟

اس پر اتفاق ہے کہ آمین جہراً اور سراً دونوں طریقہ سے جائز ہے، لیکن افضلیت میں اختلاف ہے، شوافع اور حنابلہ آمین بالجہر کو افضل قرار دیتے ہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام مالک اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک اخفاء افضل ہے۔

---

[1]: صحیح بخاری: کتاب الاذان / باب جہر الماموم بالتامین۔ [2]: سنن نسائی: کتاب الافتتاح / جھر الامام بآمین۔

اس مسئلہ میں فریقین کی طرف سے بہت سی روایات دلیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں، لیکن ایسی تمام روایات یا صحیح نہیں ہیں یا صریح نہیں، اس لئے اس مسئلہ میں حضرت وائل بن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث مدارِ بحث بن گئی ہے، شافعیہ اور حنابلہ بھی اسی سے استدلال کرتے ہیں اور حنفیہ ومالکیہ بھی، اس لئے کہ اس سلسلہ میں یہی روایت صحیح ترین ہے۔

دراصل وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں روایت کا اختلاف ہے، یہ روایت دو طریق سے مروی ہے ایک سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ”وَمَدَّ بِهَا صَوْتَهٗ“۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ“ پڑھ کر آمین کہا اور اپنی آواز کو کھینچا، دوسرے شعبہ کے طریق سے جس کے الفاظ یہ ہیں ”وَخَفَضَ بِهَا صَوْتَهٗ“ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کہی اور اپنی آواز کو پست کیا۔[۱]

شوافع اور حنابلہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کو ترجیح دے کر امام شعبہ کی روایت کو چھوڑ دیتے ہیں، جبکہ حنفیہ وموالیک امام شعبہ کی روایت کو اصل قرار دے کر سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس میں ”مَدَّ“ سے مراد جہر نہیں، بلکہ آمین کی ”ی“ کو کھینچنا ہے، اور جن روایات میں بالجہر کا ذکر ہے وہ یا تو مد بھا صوتہ کی تشریح اور روایت بالمعنی پر محمول ہیں، یا ان میں ضعف ہے۔

روایتِ آمین بالسر کی وجوہِ ترجیح:

(۱) سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اپنی جلالتِ قدر کے باوجود کبھی کبھی تدلیس بھی کرتے ہیں، اس کے برخلاف شعبہ رحمۃ اللہ علیہ تدلیس کو اشد من الزنا سمجھتے تھے، اُن کا یہ مقولہ بھی مشہور ہے۔ ”لَاَنْ اَوْقَعَ مِنَ السَّمَاءِ فَاَنْقَطِعَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اُدَلِّسَ“ (میں آسمان سے گر کر مر جاؤں میرے لئے یہ پسند ہے اس بات سے کہ میں تدلیس کروں) اس سے اُن کی غایت احتیاط معلوم ہوتی ہے۔

---

[۱]: سنن ترمذی: کتاب الصلاۃ / باب ماجاء فی التامین۔

(۲)سفیان ثوری اگرچہ آمین بالجہر کے راوی ہیں، لیکن خود ان کا اپنا مسلک شعبہ کی روایت کے مطابق آمین آہستہ کہنے کا ہے۔

آمین بالسر اوفق بالقرآن ہے:

(۳)شعبہ کی روایت قرآن کے زیادہ موافق ہے، اسلئے کہ ارشاد باری ہے: "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً"[1] اپنے رب سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کیا کرو۔ اور آمین بھی دعا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں "قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَ تُكُمَا" کہا گیا ہے،[2] تم دونوں (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون) کی دعا قبول کرلی گئی) حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام نے صرف آمین کہی تھی، معلوم ہوا کہ آمین بھی دعا ہے۔

(۴)حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی معروف حدیث ہے: "اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اِذَا قَالَ الْاِمَامُ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ فَقُوْلُوْا آمِيْنَ۔ الخ"[3] اس میں امام کے "ولا الضالین" کہنے کو آمین کہنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے، اگر جہراً آمین افضل ہوتا تو خود امام کے آمین کہنے کو ذکر کیا جاتا، لہذا اس روایت کا ظاہر آمین آہستہ کہنے پر دال ہے۔ اس کے جواب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت پیش کی جاتی ہے، "اِذَا أَمَّنَ الْاِمَامُ فَاَمِّنُوْا" لیکن اس میں جہر کی صراحت نہیں، بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ تأمین اُس وقت ہونی چاہیے جب امام آمین کہے، اور اس کا طریقہ پچھلی روایت میں بیان کردیا گیا کہ ولا الضالین کہنے کے بعد آمین کہہ دیا جائے،(اس لئے کہ امام اسی وقت آمین کہتا ہے) تو درحقیقت پچھلی روایت اس روایت کے لئے مفسر ہے، اور دونوں کے مجموعہ سے حنفیہ ہی کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔

---

[1] الاعراف:۵۵۔ [2] یونس:۸۹۔ [3] صحیح بخاری: التفسیر/باب غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

آمین بالجہر تعلیماً ہے:

(۵)اس کے علاوہ اگر ہم آنحضرت ﷺ سے آمین جہراً ثابت مانیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو تعلیم دینے کے خیال سے لفظ آمین زور سے فرمایا تھا، جیسا کہ متعدد روایات میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ بعض اوقات سری نمازوں میں بھی قرأت کا ایک آدھ کلمہ زور سے پڑھ دیتے تھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ ﷺ کیا پڑھ رہے ہیں، بالخصوص حضرت وائل بن حجر کا تعلق یمن سے تھا وہ صرف ایک دو مرتبہ مدینہ طیبہ آئے تھے، اس لئے کچھ بعید نہیں کہ آپ ﷺ نے اُن کو سنانے کی غرض سے آمین جہراً کہا ہو۔ اس کی تائید اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابو بشر الدولابی نے ''کتاب الاسماء والکنی'' میں تخریج کی ہے، اس روایت میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''فَقَالَ آمِيْنَ يَمُدُّ بِهَا صَوْتَهٗ مَا اُرَاهُ اِلَّا لِيُعَلِّمَنَا'' میں سمجھتا ہوں کہ آپ ﷺ نے ہم کو تعلیم دینے کی غرض سے کیا۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی بغرض تعلیم جہراً تعوذ وغیرہ پڑھنا ثابت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کی غرض سے کبھی صحابہ کرام بھی آواز سے آمین فرماتے تھے، اور یہ طریقہ آنحضرت ﷺ کے عمل کو دیکھ کر اختیار کیا گیا تھا۔[۱]

آمین بالجہر معمول بہ ہوتا تو صرف ایک ہی صحابی راوی کیوں؟

نیز یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کا عام معمول آمین بالجہر کا ہوتا تو یہ جہر دن میں کئی مرتبہ تمام صحابہ سنتے اور اس کی روایت حد تواتر تک پہنچ چکی ہوتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے جہر کو روایات کرنے والے حضرت وائل

[۱]: آثار السنن: باب الجہر بالتامین: ۱۳۹۔

بن حجر رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی نہیں اور اُن کی روایت بھی محتمل التاویل ہے اور خود انہی سے شعبہ اخفاء بھی روایت کرتے ہیں، کیا یہ بات آہستہ آمین کہنے کے افضل ہونے کی ایک مضبوط دلیل نہیں؟

تعاملِ صحابہ بھی آمین بالسّر پر دال ہے:

(۷)شعبہ کی روایت کی ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ تعارض روایات کے وقت صحابہ کرام کا عمل بڑی حد تک فیصلہ کن ہوتا ہے، اور شعبہ کی روایت صحابہ کے تعامل سے بھی مؤید ہے، چنانچہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ ابووائل کی روایت نقل کرتے ہیں: ”كَانَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَعَلِيٌّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ لَا يَجْهَرَانِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَلَا بِالتَّعَوُّذِ وَلَا بِالتَّامِيْنِ“[۱]

اخفاءِ آمین کے بارے میں حضرت عمر کا اثر:

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر ہے ”اَرْبَعٌ يُخْفِيهِنَّ الْاِمَامُ اَلتَّعَوُّذَ وَبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَآمِيْنَ وَاَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ“[۲] چار جگہ امام اخفاء کرے گا (۱) تعوذ (۲)تسمیہ (۳) آمین (۴)اللّٰہم ربنا ولک الحمد۔ نیز عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی سند صحیح سے ثابت ہے کہ وہ اخفاء تأمین پر عمل فرماتے تھے اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر فقہاء سے اخفاء تامین ثابت ہے، جبکہ اس کے برخلاف کسی بھی صحابی سے جہراً تامین عمل کرنا منقول نہیں، صرف عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنے زمانۂ خلافت میں آمین بالجہر فرماتے تھے لیکن اول تو حضرت ابن الزبیر کا اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور حضرت ابن

---

[۱] شرح معانی الآثار: باب قراءۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم فی الصلاۃ۔
[۲] کنز العمال: کتاب الصلاۃ: ادب الماموم وما یتعلق بہ۔

مسعود رضی اللہ عنہ کے آثار کا مقابلہ نہیں کر سکتا، دوسرے بعض روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کچھ حضرات نے آمین کہنے کو بدعت سمجھ کر بالکل ترک کر دیا تھا، ایسے حضرات کی تردید کے لئے حضرت عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے آمین بالجہر شروع کر دیا ہو تو کچھ بعید نہیں، بہر حال حضرت ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ اور وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی بھی صحابی سے جہراً تامین ثابت نہیں، نہ قولاً نہ فعلاً جبکہ اُن دونوں کی روایات بھی محتمل التاویل ہیں، جیسا کہ یہ بحث گزر چکی ہے، کیا یہ بات اس امر کی دلیل قاطع نہیں کہ جہراً تامین افضل نہیں، بلکہ اس کا اخفاء افضل ہے۔

حضرت عطاء کا اثر اور اس کا رد

شوافع وغیرہ حضرت عطاء کے اثر سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ: انہوں نے دو سو صحابہ سے ملاقات کی، سب آمین بالجہر کرتے تھے۔[۱]

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ اثر معلول ہے، کیونکہ حضرت عطاء کا دو سو صحابہ سے ملاقات کرنا ثابت نہیں، اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ان سے عمر میں بڑے ہیں، پھر بھی اُن کی ملاقات صرف ایک سو بیس صحابۂ کرام سے ہوئی تھی، اس کے علاوہ حضرت عطاء کی مراسیل اضعف المراسیل ہیں، جیسا کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صراحت کی ہے۔ اس لئے اس سے استدلال درست نہیں۔[۲]

آمین بالسّر ثابت نہیں

مسئلۂ آمین پر ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آگیا، اسے سنا کر بات ختم کرتا ہوں۔ یہ ہندوستان کا قصہ ہے۔ بہت زمانہ پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ آمین بالجہر اور بالسر کے مسئلہ میں لڑائی

---

[۱]: سنن کبریٰ للبیہقی: باب جہر المأموم بالتامین۔ [۲]: تدریب الراوی: النوع التاسع المرسل، ۱/۱۹۵۔

ہو گئی۔ یہاں تک کہ مقدمہ بازی کی نوبت آ گئی۔ جج انگریز تھا۔ جج نے کہا کہ پہلے میں تم لوگوں کی کتاب دیکھتا ہوں تا کہ مجھے بھی اس بارے میں کچھ معلومات ہو جائیں، کچھ دن بعد اُس نے فیصلے کی تاریخ مقرر کی، جب فیصلے کا دن آ پہنچا تو اس نے کہا کہ میں نے کچھ دن آپ لوگوں کی کتابیں خوب دیکھی اور دونوں کی دلیلوں کو بھی دیکھا، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آمین بالجہر بھی ثابت ہے اور آمین بالسر بھی ثابت ہے لیکن آمین بالشر یعنی لڑائی والا آمین ثابت نہیں ہے۔ آپ لوگوں کا آمین جھگڑے کا ہے، یہ ثابت نہیں ہے۔ چونکہ بحث اس کے افضل اور غیر افضل ہونے کے بارے میں ہے، اس لئے اس مسئلہ میں بحث و مباحثہ کر کے اپنے وقت کو ضائع کرنا مناسب نہیں ہے، بلکہ اعتدال سے کام لینا چاہئے، اور اعتدال کی صورت یہ ہے کہ آمین اتنی بلند آواز سے سے کہی جائے کہ دوسروں کو خلل نہ ہو اور دائیں اور بائیں والے سن لیں یہ کافی ہے۔ الحمدللہ آج سورۂ فاتحہ کی تکمیل ہوئی، اللہ پاک اس کی برکات سے ہم سب کو مستفید فرمائے، اور ہمارے ان دروس کو قبول فرمائے، اور اس کے ذیل میں بیان کی گئی باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، اور اس میں ہونے والی کوتاہیوں اور غلطیوں سے درگزر فرمائے۔

(آمین)

ادارہ کی دیگر شائع شدہ کتب

موضوعاتی درسِ قرآن آیۃ الکرسی

درسِ عقیدۃ الطحاوی

دیگر زیرِ طبع افادات

موضوعاتی درسِ قرآن

سورۃ طٰہٰ

سورۃ رحمٰن

خطباتِ جمعہ

ISBN 978-0-9910344-5-1
www.alakramgraphics.in 7386460630